اِسلامی جمہُوریّت

مولانا رئیس احمد جعفری

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ، لاہور، پاکستان

اسلامی جمہوریت

تالیف

مولانا سیّد رئیس احمد جعفری (ندوی)

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ ، لاہور

FAISAL JHANDIR LIBRARY
076749
MAILSI

جملہ حقوق محفوظ

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI PUBLIC LIBRARY

طبع اوّل .. .. .. جون ۱۹۶۸ء

تعداد .. .. .. ایک ہزار

۳۳۵.۱۰۹۵
93

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)

نمبر شمار : .....

کتاب نمبر : .....

Masood Faisal Jhandir Library

محمد اشرف ڈار (سکریٹری) نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر
ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے شائع کیا

انتساب

ممتاز حسن سابق سکریٹری فنانس حکومت پاکستان کے نام

پیش لفظ

(سیّد محمد ظفر صاحب وزیر قانون حکومت پاکستان کے قلم سے)

سیّد رئیس احمد جعفری کی زیر نظر کتاب جمہوریت کو ایک اعلیٰ اور ارفع انسانی سوسائٹی کی بلندیوں سے دیکھتی ہے یعنی کتاب کا اصل مقصد وہ سوسائٹی ہے جس کے لیے جمہوریت کو وہ ایک ذریعہ اور آلہ سمجھتے ہیں، اور بات بھی یونہی ہونی چاہیے۔ حکومت کیوں قائم ہوتی ہے۔ اس کا جواب بڑی تفصیل سے مفکرین اور ماہرانِ سیاسیات نے دیا ہے۔ "جمہوریت اسلام میں" اس سوال کا جواب ایک اور انداز سے جعفری صاحب نے دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حکومت خدا کے دین کے مطابق سوسائٹی کو بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان اصولوں پر معاشرے کی بنیاد قائم کرے، جن سے عوام کی مالی، جسمانی اور روحانی بہبودی حاصل ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اسلام میں کسی سکہ بند قسم کے نظام کو جمہوری قرار نہیں دیا۔ کیسا بھی نظام یا طرزِ حکومت ہو لیکن اگر اس میں امت کے خیالات معلوم کرنے اور اس کے مجموعی مشورے سے استفادہ حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں ـــــ اور احکام دینی کی پابندی شرطِ اوّل ہو تو جمہوریت ہے ـــ سیّد رئیس احمد جعفری اس جمہوریت کو بے معنی سمجھتے ہیں جو صرف حکومت چلانے میں مدد دے لیکن معاشرے کو درست نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کے ذہن میں جو سوسائٹی ہے اس کا فرد پاک نہاد، رحم خو، نیک، ناپ تول ٹھیک رکھنے والا، ہمسائے کا ہمدرد چوری اور زنا سے بھاگنے والا ہوتا ہے اور اس کی انھوں نے بہت سے ایمان افروز مثالیں دی تھیں۔ مثالوں کا یہ نمونہ کافی مفید اور مناسب ہے۔

اس لحاظ سے زیرِ نظر کتاب یقیناً لوگوں کے لیے دلچسپ اور فکر آفرین ثابت ہوگی۔ جعفری صاحب نے اس کتاب میں جو مواد پیش کیا ہے اس سے ان کی محنت اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک وقیع کارنامہ ہے اور دوسرے اہلِ علم اور اہلِ نظر کے لیے دعوتِ فکر بھی۔

اس کتاب کا بنیادی اور افادی باعث یہ ہے کہ معاشرے کا تعلق حکومت اور حکومت کا تعلق معاشرے سے کیا ہونا چاہیے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ مصنف نے اسے خوبی اور اسلامی ذہن کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کر کے وقت کی ایک بڑی ضرورت کی طرف نشاندہی کی ہے۔

سید محمد ظفر

راولپنڈی

مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۷

افتتاحیہ

عہدِ حاضر میں جمہوریت کے مداحوں اور ثنا خوانوں کی تعداد حدِّ شمار سے خارج ہے۔ جمہوریت کی تائید و تحسین وقت کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ جن ملکوں میں جمہوریت کو دخل ہونے کی اجازت نہیں، اور جن حکومتوں کا وجود جمہوریت کی نفی ہے، وہ بھی جمہوریت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

اصل میں جمہوریت کا لفظ اتنا ہمہ پہلو ہے اور اس میں اتنی زیادہ لچک ہے کہ بیک وقت دستۂ گل اور خارِ دامن، دونوں پہ نہایت آسانی سے اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے "سیکولرزم" ہے۔ دنیا کی ۹۹ فیصد حکومتوں کا آئین و دستور سیکولر ہے، اور وہاں دستوری طور پر غیر مذہب کی اقلیتوں کو مکمل ترین شہری حقوق و مراعات اور مساوات کی نعمت حاصل ہے، لیکن عملاً شاید ہی یہ چیز کہیں موجود ہو کسی چیز کا وجود یا عدم وجود صرف قرطاس و قلم کا رہین منت نہیں ہوتا، وہ اپنے ساتھ عمل کی میزان اور تائید کا بھی جویا رہتا ہے، اور اس معیار سے اگر جمہوریت کو دیکھیے اور پرکھیے تو ماننا پڑے گا۔ "ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے"۔[1]

اس وقت سے کہ جمہوریت کا لفظ ابھی سیاسیات کے لغت میں شامل نہیں ہوا تھا، اور اسے کوئی اصطلاحی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوئی تھی، اور اس کا مفہوم و تصور بھی معروف نہیں ہوا تھا، دنیا میں صرف ایک قوم۔

مسلمان ایسی ہے جس نے علمی اور عملی طور پر جمہوریت کا مرقع دنیا کے سامنے پیش کر کے اسے محوِ حیرت کر دیا۔ جب دنیا شہنشاہیت، استعمار اور آمریت کے سوا کسی نظامِ حکومت سے واقف نہ تھی۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں میں جمہوریت کچھ اس طرح راسخ کر دی کہ بعض دینی معاملات تک اس کے حیطے میں آ گئے۔ مثلاً اجماع اور اکثریت کی بالادستی ید اللہ علی الجماعۃ، اور من شذ شذ فی النار کہہ کر قائم کر دی اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تک پر شوریٰ لازم قرار دیا، اور غیر دینی معاملات پر آپؐ نے ہمیشہ اس کا احترام فرمایا۔

اُردو زبان میں جمہوریت اور اس سے متعلقہ عنوانات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے اکثر مغربی جمہوریت کی ترجمان اور نقیب ہیں، کچھ کتابیں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بھی لکھی گئی ہیں کہ مسلم جمہوریت، یا اسلامی جمہوریت کیا ہے؟ اور کیا ہونی چاہیے؟ اور اسے کس طرح بروے کار لایا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ کتابیں زیادہ تر جماعتی نقطۂ نظر کو ملحوظ خاطر رکھ کر لکھی گئیں۔ یعنی جس آدمی کا جس سیاسی یا مذہبی جماعت سے تعلق ہوا۔ اس کے مسلک، منہاج، مقصد اور پروگرام کو سامنے رکھ کر کتاب لکھ دی، بعض کتابیں علمی اور تحقیقی اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں، لیکن جماعتی مزاج کی آمیزش ان میں بھی نظر آتی ہے۔

میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، نہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اصطلاحی معنوں میں بجائے خود کوئی جماعت ہے۔ یہ ایک خالص علمی اور تحقیقی ادارہ ہے اور دوسرے تمام موثرات و عوامل سے قطع نظر کر کے صرف اور صرف خالص اسلامی نقطۂ نظر کی جستجو میں اس کا قافلۂ فکر و نظر رواں دواں ہے لہٰذا اس موضوع پر ادارۂ ثقافت اسلامیہ کو سب سے زیادہ حق تھا کہ تحقیق کرے اور جو بات نتھر کر اور نکھر کر سامنے آئے، اسے اہل علم و نظر کے سامنے

رکھ دے۔ یہ ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ کئی سال کی مسلسل تحقیق و جستجو کے بعد یہ تالیف تیار ہو سکی ہے۔

کسی انسانی کوشش کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر جہت سے مکمل ہے، اور ہر نقطۂ نظر سے حرفِ آخر ہے۔ اس میں غلطیاں اور کوتاہیاں ہو سکتی ہیں۔ اگر اصحابِ علم و فضل کی طرف سے میری غلطیوں، کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی تو یقیناً میں اس سے استفادہ کروں گا اور آئندہ ایڈیشن میں ضروری اصلاح و ترمیم کروں گا۔

• آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین •

سید رئیس احمد جعفری

رفیق ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

۱۰ جون ۱۹۶۸ء

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	انتساب	
	پیش لفظ (سیّد محمد ظفر وزیر قانون حکومتِ مرکزیہ پاکستان)	
	افتتاحیہ	
۱	حرفِ آغاز	۱
	جمہوریت کیا ہے؟	۱
۲	اسلامی سماج : ۴ تا ۴۶	
	اسلامی جمہوریت کا اصل منبع اور مصدر	۴
	طاہر اور صالح معاشرہ	۵
	حقوق باہمی	۶
	رشوت کا سدِّباب	۶
	عفو و کرم کا سلوک	۷
	آجر اور اجیر اسلام میں	۸
	علم کی عظمت اور اہمیت	۹
	احترامِ آدمیت	۹
	چند اہم نکات	۱۰
	عدل و دیانت	۱۱

اخوتِ باہمی ۱۳
اسلامی سماج کی بنیاد ۱۶
صبر اور درگذر ۱۷
خدمتِ خلق ۲۴
امانت کی ترغیب ۲۵
ایک حدیث قدسی ۲۷
کفرسازی اور فرقہ آرائی ۳۳
فرد اور اُمّت ۳۴
ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت ۳۷
بیوہ اور یتیم ۴۰
اسلامی سماج کی خصوصیت ۴۱
پردہ پوشی ۴۳
سوادِ اعظم ۴۴
خلافتِ : ۴۷ تا ۸۷
خلافتِ راشدہ، منہاج و اصول، انتخاب اور شوریٰ اور اس سے متعلق ط،
آثار و نتائج ۴۷
ایک جائزہ ۵۲
مسئلہ خلافت اور اس کا تقابل دوسرے نظاموں سے
شوریٰ اور مسئولیت اولی الامر ۵۳
امت کا اختیار اور پسند ۶۳
حضرت عمرؓ خلیفہ کس طرح بنے ؟ ۶۴
خلافت ایک معاہدہ ہے ۶۵
انتخاب کثرت رائے سے ۷۰

	ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا محاکمہ	۸۱
	عہدِ خلافتِ راشدہ کو سب سے زیادہ ہنگامی عہد	۸۲
	حضرت علیؓ کس طرح منتخب ہوئے ؟	۸۴
	حضرت علیؓ کا طریق کار	۸۴
	استاذ سید قطب کا فکر آفرین تبصرہ	۸۵
	حکام کا تقرر عوام کی مرضی سے	۸۶
	سبق آموز مثالیں	۸۸
	موازنہ بھی اور نمونہ بھی	۸۹
	معاویہ بن یزید کی تقریر	۹۰
	شروطِ قرشیت :	۹۶
	عمرؓ اور علیؓ کی مثال	۹۱
	خوارج کا مسلک	
	ترکِ تعیین کا مقصد و مقتضا	۹۲
	طبری اور ابنِ خلدون کی بحث	۹۳
	فیصلہ کن ارشادِ رسولؐ	۹۴
	مساوات اور اخوت کی نفی	۹۵
	شروطِ طاعت	۹۶
	رد و قبول کا اختیار	۹۸
	تعاون اور عدم تعاون کی شرط	۹۹
	راعی و رعایا کا "معاہدہ"	۹۹
	نبی کی طاعت امر معروف میں	۱۰۰
	حق طاعت کب ساقط ہوتا ہے ؟	۱۰۱
	ماوردی کا استدلال	۱۰۲

حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ	۱۰۳
علامہ محمد عبدہٗ کا تبصرہ	۱۰۴
چند قابلِ غور مثالیں	۱۰۵
ذکرِ طٰہٰ حسین کا ایک اہم سوال	۱۰۶
وحدتِ ملّی کا قیام سب پر بالا ہے	۱۰۷
جمہوریت مذہب میں	۱۰۸
ماوردی اور غزل و خوارج	//
سمع و طاعت	۱۰۹
حضرت علیؓ کا ارشاد	۱۱۱
امامِ بیعت امامِ استخلاف نہیں	۱۱۲
خوارج کا نظریہ	۱۱۳
خروج کی تائید و حمایت کب ؟	۱۱۴
واقعۂ کربلا	۱۱۵
ماوردی، تفتازانی اور ابن حجر کے افکار	۱۱۶
ابن خلدون کی رائے	۱۱۷
ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصریحات	//
امام حسین کی تقریر سے کیا ثابت ہوتا ہے ؟	۱۱۸
عمر بن عزیز کا استصواب پنی خلافت کے لیے	۱۲۰
اموالِ مغصوبہ اور جاگیرات کی ضبطی	//
سربراہِ مملکت : ۱۲۵ تا ۱۵۰	
صدرِ مملکت کی ذات اور شخصیت	۱۲۵
اسلامی جمہوریت کا صدر اور اس کے خصائص	۱۲۶
آں حضرتؐ کی سیرت طیبہ کا نمونہ	۱۲۷

الفقر فخری ۱۲۸
حضرت عمرؓ کی بیان کردہ تفصیل ۱۲۹
حضرت عائشہؓ کا جواب ۱۳۳
جواب دہی عوام کے سامنے بھی، خدا کے سامنے بھی ۱۳۴
رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ ″
فرنچ مورخ سدیو کا اظہارِ حقیقت ۱۳۵
انصار کا اپنے "سربراہِ مملکت" پر اعتراض اور اس کا جواب ۱۳۶
حضرت فاطمہ کا ایک واقعہ ۱۳۷
"میں بادشاہ نہیں تم کا ایک فرد ہوں!" ۱۳۸
خلفائے راشدین کا اسوہ ۱۳۹
حضرت عمرؓ کی ایک عہد آفرین مجلس مشاورت ″
حضرت عمرؓ کی معرکۃ الآرا تقریر ۱۴۰
قرآن سے استدلال ۱۴۱
امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت ۱۴۲
ابنائے عمر اور گورنر مصر ۱۴۳
حضرت عمر کی چند اور مثالیں ۱۴۴
علی مرتضیٰ کی نگاہ میں سربراہ مملکت کا تصور ″
حیاتِ علیؓ کے چند نمونے ۱۴۵
سربراہِ مملکت کے لیے ماوردی کی شرائطِ انتخاب ۱۴۶
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مثال ۱۴۷
سربراہِ مملکت کے شرائطِ استحقاق پر ماوردی کا تبصرہ [illegible]

۷ بنیادی حقوق : ۱۵۱ تا ۱۸۹
اسلام کی شاندار روایات ۱۵۱

بنیادی حقوق کا لب لباب	۱۵۲
آزادی عامہ	//
حریت ذات اور مساوات بین الافراد	۱۵۳
سیکولرازم : قول اور عمل	۱۵۴
ارباب اقتدار کو استئثار کا حق	۱۵۶
غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید	۱۵۸
آنحضرتؐ اور انسانی مساوات	۱۵۹
تعزیر میں مساوات	۱۶۰
انسانی مساوات کا روح پرور مرقع	//
آزادیٔ رائے	۱۶۲
اسلام میں اجتہاد اور قیاس کی اہمیت	//
آزادیٔ رائے کی چند مثالیں	۱۶۳
حقوق شہریت	۱۶۷
مسٹر اسکاٹ کا بیان	۱۶۸
ضروریات زندگی کی ذمہ داری	۱۶۹
آزادیٔ فکر اور آزادیٔ ضمیر	۱۷۰
آزادیٔ ذات	۱۷۱
حریت شخصی کن آزادیوں سے عبارت ہے ؟	۱۷۲
حدود اور تعزیر	//
علامہ ابن قیم کی تصریحات	۱۷۳
حریتِ تعلیم	۱۷۷
احادیث نبوی اور علم کی ترغیب	۱۸۲
حضرت عمرؓ اور ترویج علم	//

حریت ملکیت ۱۸۳
زہری کی روایت //
حکومت کی ترتیب و تشکیل میں حصہ ۱۸۴
خوارج کا دستور ۱۸۵
خوارج کا سراپا ۱۸۶

۸ عورت اس کی شخصیت اور حقوق : ۱۹۰ تا ۲۰۵

عورت کی حیثیت اسلام سے پہلے ۱۹۰
اسلام نے عورت کو حقوق انسانی عطا کیے ۱۹۱
قرآن حکیم اور حقوقِ نسواں ۱۹۲
عورت کی انفرادیت اور شخصیت کا اسلام میں مقام ۱۹۳
جنگ و پیکار میں عورت کو سرگرم کار ہونے کا حق ۱۹۴
دینی معاملات میں بھی عورتیں برملا پڑھ کر حصہ لیتی تھیں //
عورت اسلام کی داعی اور مبلغ ۱۹۵
عورت دشمن کو امان دے سکتی ہے۔ ۱۹۶
ابن جریرؒ کے نزدیک عورت قاضی اور حاکم بن سکتی ہے ۱۹۷
بچے پر باپ سے زیادہ ماں کا حق ہے۔ ۲۰۰
حضرت عمرؓ کا بیان ۲۰۳
ابن قیمؒ اور ابو حنیفہؒ کا مسلک ۲۰۴
یک زوجگی کی تائید ائمہ فقہ کی طرف سے ۲۰۵
خارجی خواتین کی سیاسی قربانیاں //

۹ تنقید اور آزادی گفتار : ۲۰۹ تا ۲۲۸

حریت افکار و گفتار ۲۱۰
منکر کی مزاحمت ۲۱۱

کلام اللہ سے استشہاد ۲۱۲
چند اہم نکتے متعلق بہ آیت کریمہ ۲۱۳
احادیث نبوی سے استشہاد ۲۱۵
عزیمت و رخصت ۲۱۷
اسوۂ خلفائے راشدین //
ابوذر غفاری کا مسلک //
بیعت سے اختلاف، بغاوت سے گریز ۲۲۳
حزب اختلاف اسلامی نقطۂ نظر سے ۲۲۴
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
۱۰ عدل و انصاف : ۲۲۹ تا ۲۴۴
رائج الوقت جمہوریت کے کرشمے ۲۲۹
اسلام کا اصول عدل و انصاف ۲۳۰
عدل اسلامی اور مساوات عامہ ۲۳۲
محکمۂ مظالم ۲۳۴
عبید اللہ بن عمرؓ کے خلاف فیصلہ ۲۳۵
حاکم کے اختیارات خصوصی ۲۳۶
قابل دست اندازی و ناقابل دست اندازی معاملات ۲۳۷
ناقابل قبول شہادت ۲۳۸
حضرت عمرؓ کی مثال ۲۳۹
عدلیہ اور امیر کے حدود و اختیارات
جانب دار حاکم ۲۴۱
۱۱ عدلیہ : ۲۴۵ تا ۲۵۷
عدلیہ کی بالادستی اور برتری ۲۴۵

عدلیہ اور سربراہِ مملکت ۲۳۶
علیؓ کے خلاف قاضی شریح کا فیصلہ ۲۴۷
حضرت عمرؓ بن عاطیہ کی حیثیت سے ۲۴۸
عہدۂ قضا کے لازمی شرائط ۲۴۹
کندی کا بیان کردہ ایک واقعہ ۲۵۰
امام ابوحنیفہؒ اور خلیفہ منصور ۲۵۱
امام ابویوسفؒ اور ہارون رشید ۲۵۲
قاضی ابوطاہر اور خلیفہ معز ۲۵۴
عہدِ عباسیہ کا ایک اور واقعہ ۲۵۵
قاضی عزیزالدین اور ملک صالح
۱۲ تعزیر و عقوبت اور اس کے مستثنیات : ۲۵۸ تا ۲۷۱
انفرادی آزادی کے حدود ۲۵۸
ایک غور طلب مسئلہ ۲۵۹
تعزیر و عقوبت کے حدود ۲۶۰
ایک اہم نکتہ ۲۶۱
علامہ ابن قیم کا ارشاد ۲۶۲
زنا کی سزا اور اس کے مستثنیات ۲۶۳
چوری کی سزا اور اس کے مستثنیات ۲۶۶
علامہ ابن قیم کے بیان کردہ مستثنیات ۲۶۹
۱۳ مثالی اسلامی حکومت : ۲۷۲ تا ۳۲۳
چند بنیادی اصول ۲۷۳
کن اصولوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا؟ 〃
اسلامی حکومت کے حدود اور راہِ عمل ۲۷۵
مجرموں اور مجرموں سے سلوک ۲۷۶

رفاہ عام کے امور	۲۷۶
اجتہاد : اسلامی جمہوریت کی خصوصیت	۲۷۷
تاریخ ادیان کا اہم واقعہ	۲۷۸
عدولی شہادت	//
رائے عامہ کا احترام	۲۷۹
دفاتر کا انتظام	۲۸۰
باوردی کی تعریف	۲۸۱
"جدید" کو قبول کرنے میں تامل نہ تھا	۲۸۴
پولیس کی تنظیم	۲۸۵
وصولی خراج	۲۸۶
بلاذری کی تصریحات	//
ٹیکس اور زکوٰۃ کی جداگانہ حیثیت	۲۸۷
ہنگامی حالات میں چندہ	۲۸۸
درآمد برآمد پر ٹیکس	۲۸۹
بدعات ازالہ شکایات حکام	۲۹۰
احتساب اور مواخذہ	//
ایجنٹ	۲۹۲
انتخاب امراء کی امیدواری جائز ہے یا ناجائز ؟	//
بیعت اور نقض بیعت	۲۹۴
امیدواری کے بارے میں بلاذری کا فیصلہ	۲۹۴
غیر مسلموں سے حسن سلوک و مراعات	۲۹۵
جنگی قیدیوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ	۲۹۶
غیر وابستہ غیر مسلموں سے استعانت	۲۹۷

غیر مسلم معاہدین کو مسلمانوں پر ترجیح	۲۹۷
مفتوحوں سے فراخدلانہ برتاؤ	۲۹۸
جنگ سے پہلے اعلان جنگ ضروری ہے	۳۰۰
غیر محارب غیر مسلموں اور محصورین کے ساتھ رعایت	//
معاہدۂ صلح کا احترام	۳۰۱
حضرت عمرؓ اور ہرمزان	۳۰۲
کفار مائل بہ صلح ہوں تو صلح کر لینا ضروری ہے	۳۰۴
اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے۔	
غلامی کا استیصال	۳۰۷
غلام کے حقوق اور مرتبہ	۳۰۸
اسپین کے غلاموں کے ساتھ مسلمان فاتحوں کا سلوک	۳۱۱
غلام کا مسلمان قاتل قتل کیا جائے گا	۳۱۳
آں حضرتؐ کا غلام	//
اسلام کا دشمن اور مسلمانوں کا قاتل دربارِ رسولؐ میں	۳۱۴
حضرت عمرؓ کی مثال	۳۱۵
حضرت علیؓ کا فیصلہ	۳۱۶
ذمیوں کے حقوق کی ایک مختصر فہرست	۳۱۷
شام کے شہر حمص کے ذمیوں کی داستان	۳۱۸
جزیہ، اس کی مقدار اور مستثنیات	۳۲۰
غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری	۳۲۱
غیر مسلموں کی زبان عدالتی زبان بھی تھی	//
مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ	۳۲۲
غیر مسلموں سے تعلقات کی بنیاد امن نہ کہ جنگ	۳۲۳

۱۴ اسلامی سوشلزم یا اسلامزم ؟ ۳۲۴ تا ۳۴۰

اشتراکیت اور اشتمالیت ۳۳۰

اسلامی سوشلزم ۳۳۱

اسلامزم ہی اصل الاصول ہے ″

اسلامزم کے خصائص ۳۳۲

اسلامزم کا سربراہ مملکت ۳۳۳

حقوق ملکیت میں وسیع تر مراعات ۳۳۴

کیا مکان کا کرایہ جائز ہے ؟ ۳۳۵

ذاتی ضرورت سے زیادہ زمین نہیں رکھی جا سکتی ۳۳۶

حضرت بلالؓ کی زائد زمین واپس لے لی گئی ″

سرمایہ داری کے خلاف ابوذر غفاریؓ کا جہاد ″

پانی فروخت نہیں کیا جا سکتا ۳۳۷

ابطال ملکیت زمین ۳۳۸

۱۵ "اسلامی سیکولرزم" : ۳۴۱ تا ۳۵۲

فکری بددیانتی اور ذہنی نفاق ۳۴۱

اسلامی حکومت کا اختصاص ۳۴۲

سیکولرزم عمل کی میزان میں ۳۴۳

اسلامی سیکولرزم ۳۴۴

دشمن کا اعتراف ۳۴۵

لا اکراہ فی الدین ۳۴۶

عام معاملات میں مسلم و کافر یکساں ہیں ۳۴۷

آنحضرتؐ کو استغفار کا حکم ایک یہودی کے لیے۔ ″

فتح مکہ کا اصل سبب معاہد مشرک تھے ۳۴۸

	مسلمانوں اور یہودیوں کا معاہدہ	۳۴۹
	نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ	۳۵۰
	ایک نسطوری کی تحریر	۳۵۱
۱۶	**حاکمیت عوام اور مسئولیت حاکم**	۳۵۲
	حقوق عامہ کی نگہداری اور پاسبانی	۳۵۴
	عوام کی حاکمیت اور حاکم کی مسئولیت	"
	طبری کی روایت	۳۵۵
	حضرت عمرؓ کا مسلک	۳۵۶
	عوام کے افکار و آراء کا اثر تشکیل حکومت پر	"
	امام ابو یوسفؒ کا خطاب ہارون رشید سے	۳۵۷
	ریاست کی تبدیلی کے ساتھ نظام و دستور کی تبدیلی	"
	نظام مسئولیت	۳۵۹
	طاعت "حق" کے ساتھ محدود ہے	"
	خالد بن ولید کا استغاثہ من المسلمین کی عدالت میں	
	ماوردی کے نزدیک خلیفہ کی غالب ترین اکثریت کا منتخب ہونا	۳۶۵
	حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عمرو بن عاص	۳۶۰
۱۷	**پاکستان: ایک اسلامی جمہوریت:**	
	قائداعظم کے ارشادات کی روشنی میں	[illegible]
	قائد ملت کی تصریحات کی روشنی میں	۳۶۹
	تمہیدی تقریر	۳۷۱
	بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ کی نفی	۳۷۲
	اسلام کا احسان	۳۷۳
	مسلمانوں کی رواداری	۳۷۴

عدل گستری	۳۷۴
اسلام اور مسلم حکومت	،،
غیر مسلموں کے حقوق	۳۷۵
بنیادی حقوق	،،
اہلیت تقرری	۳۷۶
علماء کا ذکر	،،
مساوات	۳۷۷
صدر ایوب کی خود نوشت میں جمہوری اور اسلامی تصورات	۳۸۰
پاکستان کا دستوری ارتقاء :	۱۸
جمہوریت اور اسلامیت کے ساتھ ساتھ	۳۸۸

حرفِ آغاز

جمہوریت کیا ہے؟

اسلام نے جمہوریت کی کوئی خاص وضع و ہیئت اور کوئی مخصوص نظام و دستور نہ معین کیا ہے نہ مرتب کیا ہے۔ یہ بات اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دی ہے کہ اپنی ضروریات و مقتضیات کے مطابق جس طرح کا نظام چاہے وضع کر کے اسے بروئے کار لے آئے۔ شرط صرف ایک ہے: اسے کتاب و سنت کا تابع ہونا چاہیئے۔

جمہوریت کی تعریف کیا ہے؟ جمہوریت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جس پر تمام دنیا متفق ہو۔ ہر ملک کا نظام جمہوریت کا مدعی ہے، لیکن ہر ملک کا نظام جمہوری منفرد اور جُداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ امریکہ، انگلستان، فرانس، روس، چین، اٹالیہ اور دوسرے بہت سے ممالک جمہوریت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ہر جگہ کی جمہوریت ایک دوسری سے مختلف اور کہیں کہیں تو متضاد بھی ہے۔ مثلاً صدر جمہوریہ کا انتخاب فرانس میں صرف مرکزی مجلس قانون ساز کرتی ہے۔ یا ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا کے ممبر مشترک طور پر یہ کام انجام دیتے ہیں جمہوریت میں صوبائی مجالس قانون ساز اور پارلیمنٹ کے ممبر مخلوط اجتماع میں کسی شخص کو منتخب کر لیتے ہیں۔ امریکہ میں عوامی انتخاب ہوتا ہے یعنی بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح رائے دہی کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر ہر عاقل و بالغ رائے دینے کا مجاز ہے۔ کہیں تعلیم کی شرط ہے، یا انکم ٹیکس کی، یا عام ٹیکس کی، پھر جس جگہ بھی جو نظام کارفرما ہے وہ قائم اور

مستقل نہیں ہے، اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود کسی کی جمہوریت پر حرف تک نہیں آتا۔

اسلام نے چند اصول دے دیئے ہیں۔ انہی پر جمہوریت کی بنیاد و اساس قائم ہے۔ یہ اصول غیر تغیر پذیر ہیں، لیکن ان کی تفصیلات میں تغیر و تبدل امت کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ جب اور جس طرح چاہے ان میں تبدیلی اور ترمیم کر سکتی ہے۔

اگر کسی نظام حکومت میں انسانی مساوات غیر مشروط طور پر حاصل ہے، عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، پورے طور پر آزاد ہے، عوام کی آزادانہ اور رضا کارانہ مرضی کے بغیر کوئی مسند حکومت پر متمکن نہیں ہو سکتا، اور عوام کی ناپسندیدگی اور مخالفت کی صورت میں کوئی حکومت پر قائم نہیں رہ سکتا، تو بلاشبہ وہ جمہوری نظام ہے، خواہ وہ روس کی طرح شورائیت پر مبنی ہو، یا انگلستان کی طرح قیصریت پر، یا فرانس کی طرح نیم آمریت پر، یا امریکہ کی طرح عوامیت پر!

اسلام نے ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کوئی مرتب اور دائمی دستور اساسی پیش نہیں کیا ہے، نہ وہ ایسا کر سکتا تھا، نہ یہ اس کے لئے سزاوار تھا، جس طرح اجتہاد کا دروازہ کھول کر اس نے چند اصولوں کے ماتحت نئے حالات، احوال اور مقتضیات کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت دے دی ہے۔ بالکل اسی طرح اس نے چند اصولوں کے ماتحت نظام سیاست و حکومت مرتب کرنے اور اس میں حسب ضرورت ترمیم کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اجماع جس طرح اصول فقہ کا ایک مسئلہ ہے، اسی طرح اصول سیاست کا بھی ہے!

میں نے اس کتاب میں اسلام کے انہی خصوصیات اور اقدار کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کی ہے کسی خاص نظام حکومت کی نہ تائید کی ہے نہ مخالفت کیونکہ

میرے نزدیک ہر وہ نظام جائز اور برحق ہے جسے اُمّت کی منظوری اور کتاب و سنت کی تائید حاصل ہو۔

جمہوریت کے جو مختلف نظام آج رائج ہیں یہ پہلے نہ تھے، اور کوئی مدّت گذرتی ہے کہ یہ بھی نہ رہیں گے، دنیا جیسے جیسے آگے بڑھے گی یہ نظام بھی بدلتے جائیں گے، البتہ اصول اٹل ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ لہٰذا میں نے اسلامی جمہوریت کے اصولوں اور قدروں ہی سے بحث کی ہے کہ وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں گے، اور وہ اصول نفسیات و ضروریاتِ انسانی پر اس درجہ حاوی اور اس درجہ جامع ہیں کہ آج بھی ان کی روشنی میں انسانیت کا قافلہ صلاح و فلاح کی طرف گامزن ہو سکتا ہے، اور مستقبل میں بھی۔ یہی رہ گذار سب سے زیادہ استوار و پائدار ثابت ہوگی۔

میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے جو کچھ کہا ہے سند کے ساتھ کہا ہے، اور سند بھی وہ ہے جو طعن و ایراد کی زد سے باہر ہے۔ یہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ ایک صفحہ لکھنے کے لیے بیسیوں صفحے پڑھنا پڑے ہیں اور ایک ایک سند کی تلاش میں بعض دفعہ سینکڑوں اوراق کھنگالنا پڑے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ میری یہ محنت سعیِ رائیگاں نہ ثابت ہو۔

(سید) رئیس احمد جعفری (ندوی)

یکم جنوری ۱۹۶۸ء

(۲)

اسلامی سماج

اسلامی جمہوریت کا اصل منہج اور مصدر!

کوئی حکومت اس وقت تک نہ صحیح معنی میں جمہوری کہلانے جانے کی سزاوار ہے نہ مہذب قرار دی جا سکتی ہے۔ نہ ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے، نہ عزت اور وقار حاصل کر سکتی ہے، جب تک اس کا معاشرہ (سوسائٹی اور سماج) بے داغ نہ ہو۔

معاشرے میں اگر گھن لگ چکا ہے، بداخلاقی عام ہے، بے راہروی نے شعار کی صورت اختیار کر لی ہے، آدمیت کا احترام اٹھ چکا ہے۔ امانت دیانت کا فقدان ہے۔ سچائی اور پاکبازی کا نشان نہیں۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، رشوت اور اخلاقی جرائم و مفاسد معمولاتِ حیات میں داخل ہو چکے ہیں تو نہ حکومت سرسبز ہو سکتی ہے، نہ قوم فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن ہو سکتی ہے۔ سمجھ لینا چاہیے، یہ اب پنپ نہیں سکتی۔ حکومت کی کامیابی جمہوریت کا فروغ اور قوم کا ارتقا صرف ایک ہی چیز پر موقوف ہے، اور وہ ہے صحت مند سماج۔ تو اگر خدا سے اتر کر جمہوریت کا پرچم لہرائیں تو کوئی نفع نہیں حاصل ہو سکتا۔ معاملات بنتے ہوتے چلے جائیں گے اور کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ سماج کا اثر ہر طبقے اور حلقے پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اگر سماج اچھی ہے تو ان لوگوں کو لازماً اچھا بننا پڑے گا جن کے ہاتھ میں زمام

اقتدار و اختیار رہے۔ اور اگر سماج مجموعۂ عیوب و مفاسد ہے تو حکومت کے ارکان و اعضا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئیں گے۔ آخر وہ لوگ جو حکومت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں، اسی سماج ہی کے تو فرد ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں سماج کے صحیح نمائندے وہی ہوتے ہیں جو رنگِ سماج پر غالب ہے۔ وہ ان پر غالب تر نظر آئے گا۔ پس کسی حکومت کی کامیابی یا ناکامی اور کسی جمہوریت کے قیام و دوام اور عروج و زوال کا تمام تر انحصار سماج کے صحت مند یا علیل ہونے پر ہے۔

ظاہر اور صالح معاشرہ: اسلام نے اس حقیقت کو پہلے ہی سے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور جتنا زور اس پر دیا ہے کہ عام کو صالح اور خوش دل ہونا چاہیئے۔ اس سے کہیں زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ افرادِ قوم کو اخلاقی مفاسد سے پاک ہونا چاہیئے۔ ان میں بے غرضی ہونی چاہیئے۔ نفع عاجل پر نفع آجل کو مقدم رکھنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا شعور ہونا چاہیئے، دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ہونا چاہیئے، ملی مفاد اور قومی مصلحت کا خوگر ہونا چاہیئے، ناجائز وسائلِ حیات کو ٹھکرا دینے اور جائز وسائل کے اندر رہ کر قوتِ لایموت تلاش کرنے کی امنگ ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں سے جو سوسائٹی مرکب ہوگی وہ طاہر اور صالح ہوگی۔ اور اس سوسائٹی کے جو نمائندے، کاروبارِ حکومت سنبھالیں گے ان کی حکومت صحیح معنوں میں خدائی اور مثالی حکومت کہے جانے کی مستحق ہوگی۔ اسلامی جمہوریت کے خدوخال اسلامی معاشرہ کو سامنے رکھے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتے۔

یہ عنوان ایک دفتر کا طالب ہے لیکن ہم زیادہ سے زیادہ اختصار سے کام لینے کی کوشش کریں گے۔

حقوقِ باہمی: حقوقِ باہمی پر اسلام بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے۔ یہ وہ قرضِ حسنہ ہے جس کا

مقروض خود خدا ہے لیکن وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس نیک راستے میں بھی انسان اس درجہ آگے بڑھ جائے کہ اپنے متعلقین اور پس ماندگان کے حقوق نظر انداز کر دے۔

حضرت سعد بن وقاص رضؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے ایام میں جبکہ میں بیمار تھا میری عیادت کو تشریف لایا کرتے تھے، میں نے عرض کیا،

"یا رسول اللہ! میری علالت کی حالت یہ ہے اور میں مال دار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا میں اپنے مال کا دو تہائی خیرات کر دوں؟"

فرمایا، "نہیں!"

میں نے عرض کیا۔ "ایک تہائی خیرات کر دوں؟"

فرمایا۔ "ہاں!"

اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اپنے وارثوں کے لیے مال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں مفلس چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے تم جو کچھ خرچ کرو گے اس کا تمھیں اجر ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں دو گے اس کا بھی اجر ملے گا!" [۱]

یعنی متعلقین کے حقوق ادا کرنا، صرف ایک انسانی فریضہ ہی نہیں، ایک ایسا کام ہے جو موجب اجر اور موجب ثواب بھی ہے جس سماج میں ان نازک ترین پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہو اور ان کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہو، اس کے اثبات و استحکام کا کوئی سماج مقابلہ کر سکتی ہے؟

رشوت کا سدِّ باب: رشوت سماجی برائیوں میں بدترین چیز ہے۔ اسے اگر فساد کا منبع کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، کتنی ہی برائیاں اور نقائص

ہیں جو رشوت دینے اور لینے سے پیدا ہوتے ہیں، اس کا اگر سدِّباب ہو جائے تو بہت سے خفیہ اور علانیہ فتنے خود بخود ختم ہو سکتے ہیں اور فلاح و عافیت کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ سماج اگر صحت مند ہو تو جن لوگوں کو رشوت دی جا سکتی ہے وہ بھی نہ صرف یہ کہ اس سے گریز کرتے ہیں بلکہ ایک ناقابلِ معافی اور قابلِ تعزیر جرم قرار دیتے ہوئے عبرت انگیز سزا کا نفاذ کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

"عبداللہ بن عباس رضؓ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا، ایک لاکھ روپیہ پیش کرتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ ایلہ کی گورنری اسے تفویض کر دی جائے۔"

عبداللہ ابن عباس رضؓ نے اس شخص کو (پہلے تو) سو کوڑے لگوائے، پھر عبرت و تعزیر کے لیے اسے سُولی پر چڑھوا دیا۔

اگر رشوت دینے والوں کو اس طرح کی سزائیں ملنے لگیں تو کیا اس کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے؟

عفو و کرم کا سلوک: اسلامی سماج میں بدترین دشمنوں تک سے عفو و کرم کا سلوک کیا جاتا ہے:

ایک غزوہ سے واپسی پر عبداللہ بن اُبَی نے جو سردارِ منافقین تھا، کہا:

"اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والے ذلت والوں کو باہر نکال دیں گے"

زید بن ارقم رضؓ نے نبی صلعم کو یہ خبر پہنچا دی۔ عبداللہ بن ابی عذر کرتا ہوا آیا، قسمیں کھا کر کہا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین میں حضرت زید رضؓ بن ارقم کی تصدیق نازل فرمائی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید رضؓ سے فرمایا: "خوش ہو جا، اللہ نے تیری تصدیق کر دی!"

حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا۔ "عباد بن بشیر کو حکم دیجئے کہ اس بدبخت کی

گردن ماردیں"۔

آپؐ نے فرمایا: "نہیں! لوگ کہیں گے محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ باہمی جنگ و پیکار اور سب و شتم کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جناب عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو برا بھلا کہنا یا گالی دینا فسق ہے، اور مسلمان سے لڑنا فسق ہے۔

آجر اور اجیر اسلام میں: آجر اور اجیر یعنی مزدوری دینے والا، اور مزدوری کرنے والا بھی اسلامی سماج کے ناقابلِ شکست اصولوں سے بندھے ہوئے ہیں، اور کوئی بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، تین آدمیوں کا ذکر ایک حدیث میں مذکور ہے کہ وہ ایک غار میں پھنس گئے، جس کے دہانے پر پتھر آڑے آگیا تھا، تینوں میں سے ہر ایک نے اپنے اعمالِ حسنہ کو شفیع بنا کر خدا سے التجا کی کہ پتھر ہٹ جائے۔ آخر:۔

تیسرے نے کہا: اے اللہ! میں نے چند لوگوں کو مزدوری پر لگایا تھا اور ان کی اُجرت ان کو دے دی تھی، لیکن ایک شخص اپنی مزدوری چھوڑ کر چلا گیا تھا لہٰذا اس کی اُجرت میں زراعت کے ذریعے میں نے ترقی دینی شروع کی، یہاں تک کہ اس سے بہت مال جمع ہو گیا۔ پھر وہ میرے پاس آیا، اور کہا۔

اے بندۂ خدا! میری مزدوری مجھے ادا کر دے۔

میں نے اس سے کہا: میرے پاس اونٹ، بکری اور غلام جو کچھ تو دیکھ رہا ہے، سب تیری اُجرت کا ہے"۔

اس نے مجھ سے کہا: "اے خدا کے بندے مجھ سے مذاق نہ کر"۔

میں نے کہا: "میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، درست ہے۔ چنانچہ وہ تمام سامان ہانک کر لے گیا، اور اس میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی، اے اللہ! اگر یہ کام میں نے محض تیری خوشنودی و رضامندی حاصل کرنے کے لیے کیا ہے تو تو ہم کو اس مصیبت سے نجات دے جس میں

ہم مبتلا ہیں۔

"پتھر بالکل ہٹ گیا، اور تینوں آدمی نکل کر چلے گئے"[۵]

علم کی عظمت اور اہمیت: ایک اچھا معاشرہ اسی وقت تشکیل پذیر ہو سکتا ہے جب کہ وہاں علم کی اہمیت سے آشنا ہو اور اہل معاشرہ علم و تدبر سے نفوس و ذہن کو جلا دیں۔ اگر علم نہیں ہے تو نہ معاشرے کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے، نہ اچھی حکومت کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ چنانچہ حصولِ علم کی ترغیب قدم قدم پر کتاب و سنت میں ملتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دعا کے جو الفاظ کہلائے گئے ہیں وہ حد درجہ جامع و مانع ہیں۔ اور ان میں سب کچھ آگیا ہے:

رب زدنی علماً[۶] یعنی اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

اسی طرح بے جانے بوجھے پیچھے چل پڑنے پر بھی ٹوکا ہے:

لا تقف ما لیس لک بہ علم[۷] یعنی جس بات کا علم نہیں اس کے پیچھے مت چلو

بلا افراط دیگر قدم علم کی روشنی میں قدم بڑھاؤ۔

احترام آدمیت: باہمی حقوق و مصالح عامہ کا لحاظ بھی ایک عمدہ معاشرے کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسلام نے اسے بھی پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"اگر کوئی درخت لگاتا ہے، یا کھیتی بوتا ہے۔ اور اس میں سے چرند و انسان یا چوپایہ کھاتا ہے، تو اس کے لیے یہ صدقہ ہوتا یعنی اس کے کھا لینے پر درخت لگانے والے کو صدقہ کے برابر ثواب ملتا ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی مکان، زمین، یا

کسی اور چیز کا کرایہ لینے سے منع نہیں فرمایا۔ البتہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو بلا کرایہ کوئی چیز دے دے تو یہ کرایہ لینے سے بہتر ہے۔

اگر کسی معاشرے میں انسانی جان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ تو وہ معاشرہ روبہ زوال ہے۔ اسلام نے احترام آدمیت پر بہت زور دیا ہے اور اس میں مومن اور کافر، فاسق اور مشرک تک کی تمیز روا نہیں رکھی ہے۔ آدمی آدمی سب برابر ہیں کسی انسان کی زندگی سے کھیلا نہیں جا سکتا خواہ نسل و رنگ اور دین و مذہب اور فکر و عقیدے کے اعتبار سے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ بغیر اس کے امن و امان قائم نہیں ہو سکتا، سکون و عافیت کی نعمت چھن جائے گی اور تباہی و بربادی کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً ط

یعنی اگر کسی شخص نے کسی ایک انسان کو بھی قتل کر دیا، بجز قتل یا فساد کے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر ڈالا، اور جس کسی نے ایک انسان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا گویا اس نے تمام انسانوں کی زندگی بچا لی۔ ۵۹

چند اہم نکات: فتنہ و فساد کی بھی اسلامی سماج میں کوئی گنجائش نہیں ہے ارشاد ہوتا ہے:

فاذکروا آلاء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔

یعنی اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو، اور زمین پر فساد پھیلانے سے باز آجاؤ۔

مذکورہ بالا دو آیات کے سلسلے میں چند نکتے خاص طور پر غور طلب ہیں:۔

قتل عمد اور فساد فی الارض کا جرم اگر سرزد ہو تو قتل جائز ہے لیکن اگر کسی سے یہ جرم سرزد نہ ہوا پھر بھی اس کی جان لے لی جاتی ہے، تو یہ

ایک شخص واحد کا قتل نہیں، پوری نوعِ انسانی کا قتل ہے۔ اور اگر کوئی باحوصلہ شخص ایسے مظالم کو بچا لیتا ہے اور اسے قتل نہیں ہونے دیتا تو یہ ایک شخص واحد کی زندگی کو بچانا نہیں ہے، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو زندگی کا پیام دینا ہے۔ قرآن کریم کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس نے احترامِ آدمیت اور خون انسان کی حرمت کا کس درجہ خیال رکھا ہے اور اس میں کسی طرح کی تفریق و تمیز گوارا نہیں کی ہے جو سماج اس اصول پر عامل ہو نہ وہ کمزور ہو سکتی ہے نہ رو بہ زوال۔

دوسری آیت کریمہ میں پہلے یہ تاکید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو فراموش نہ کرو، انھیں یاد رکھو اور فساد فی الارض سے باز رہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فساد فی الارض اسلام کی نظر میں کس درجہ نامرغوب اور ناقابلِ برداشت چیز ہے۔

احترامِ آدمیت کی مثال اسوۂ رسول سے:

حضرت قیس بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی کا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، آپؐ نے فرمایا: "کیا وہ انسان نہیں ہے؟"

عدل و دیانت: ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کے سامنے مبارکہ تک جب یہ بات پہنچائی گئی کہ جنازہ مسلمان کا نہیں بلکہ یہودی کا ہے تو آپ نے فرمایا: "جب کوئی جنازہ دیکھو کھڑے ہو جایا کرو۔"

ایک ایسا اور مثالی معاشرہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے، جب معاملات اور کاروبار میں عدل و دیانت کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے کہ عدل و دیانت، ایفائے عہد سے زیادہ وسیع ہے، اگر کاروبار اور معاملات میں خیانت کو چلن ہے، دغا اور فریب سے کام لیا جاتا ہے تو وہ انحطاط پذیر معاشرہ ہے۔ اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں

کاروباری دیانت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واوفوا بالعهد ان العهد	"یعنی عہد کو پورا کرو، کیونکہ عہد کی پابندی
كان مسئولا ۝ واوفوا الكيل	پر قیامت کے دن سوال کیا جائے گا
اذا كلتم وزنوا بالقسطاس	جب کوئی چیز ناپ کر فروخت کرو تو پیمانہ
المستقيم ذلك خير واحسن	کو پورا بھر کے دیا کرو، یہ بہترین طریقہ ہے
تاويلا ط	اور اس کا انجام دین و دنیا میں ہر جگہ
	اچھا ہے۔"[۱۲]

اگر کوئی دوکاندار اس کی پابندی نہیں کرتا تو وہ خط کا گنہ گار ہے:

ويل للمطففين اذا اكتالوا	ان کم دینے والوں پر حیف ہے
على الناس يستوفون واذا	جو لوگوں سے تو پورا ناپ کر لیتے ہیں
كالوهم او وزنوهم يخسرون ۝	پھر جب دینے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔[۱۳]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جس نے کاروبار میں دھوکہ دیا وہ میرا پیرو نہیں۔"[۱۴]

نیز فرمایا:

"بائع مشتری جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں، معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر انھوں نے (کاروبار میں مال تجارت کے عیوب کے) اظہار کا طریقہ کیا تو ان کے معاملہ بیع کی برکت رخصت ہو جائے گی۔"

امام اعظم کی مثال آپ اگر سامنے ہے تو ضائقہ نہیں، وہ ایک تاجر تھے۔ انھوں نے کپڑا ان حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس کہ شریک کاروبار تھے بھیجا اور کہلا دیا کہ کچھ حصہ اس مال کا ناقص ہے۔ لہٰذا یہ عیب خریدار کو بتا دیں۔"

حفص نے مال فروخت کر دیا مگر نقص بتانا بھول گئے اور پوری قیمت وصول کر لی۔

روایت ہے کہ اس کی قیمت تیس یا پینتیس ہزار تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ نے حفص کو تاکید کی کہ خریدار کو تلاش کریں لیکن کوشش کے باوجود خریدار کا پتہ نہ چلا، آخر امام اعظم نے حفص سے شرکت ختم کر دی اور اس رقم کو اپنے پاکیزہ مال میں ملانا گوارا نہ کیا، سارے کا سارا خیرات کر دیا۔

اخوت باہمی: قرض کا معاملہ بھی ہر انسانی معاشرے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

اگر ایک شخص کسی کو قرض دیتا ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ اپنی دی ہوئی رقم کا تقاضا کرے۔ اور نہ ملے تو قانونی چارہ جوئی کرے۔ اسلام اس حق کو تسلیم کرتا ہے، یقیناً قرض دینے والے کو اس کی رقم واپس ملنی چاہیے، اور اگر لیت و لعل سے کام لیا جا رہا ہے تو اس حق کو تسلیم بھی کرتا ہے کہ قانونی چارہ جوئی کر کے اپنی رقم وصول کرے۔

لیکن یہ حق دینے کے بعد قرض دینے والے سے وہ یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ مقروض اگر واقعی مجبور ہے تو جب تک اس کے حالات سازگار نہ ہوں اسے مہلت دی جائے۔ بعض کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ ترغیب ہے یا حکم، اس اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں، ترغیب ہو یا حکم، بہرحال خدا کا منشا یہ ہے اس لیے ہر حالت میں واجب التعمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے:

وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ ۔ یعنی اگر مقروض تنگدست ہے تو حالات کے سازگار ہونے تک اسے مہلت دی جائے۔

اس پر طرہ یہ کہ اگر زمین تنگدست یا قرض دار کو مہلت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:
"اس شخص پر خدا رحم کرے، جو قرض کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔"

نیز آپؐ نے فرمایا: "جو شخص روزِ قیامت کے کرب سے بچنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ تنگ حال مقروض کو سہولت دے، یا زرِ مطالبہ میں سے کچھ کمی کر دے۔"

نیز ارشاد ہوا: "جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی، یا (اصل رقم میں سے) کچھ کمی کر دی، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عرشِ پاک کے سایہ تلے لے لے گا، یہ وہ دن ہوگا کہ اس روز سوا سایۂ عرش کے کوئی سایہ میسر نہ ہوگا!"

اسلام جو معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جس کا نمونہ دنیا دیکھ چکی ہے اس میں ہر چیز پر جس چیز کو مقدم رکھا گیا ہے، وہ انسانیت ہے، مال و زر کی خواہش کسے نہیں ہوتی، یہ خواہش اگر جائز حدود کے اندر ہو تو اسلام اس سے روکتا بھی نہیں، لیکن اگر اس خواہش میں سخت کی، بددیانتی اور دغا شامل ہو جائے تو اس سے نکلتے ہے، قرض دی ہوئی رقم واپس لی جا سکتی ہے، لیکن مقروض اگر تنگ دست ہے تو اسے مہلت دینا ہی چاہیئے۔ ایسے معاشرے میں اخوتِ باہمی کا جو مقام ہوگا ظاہر ہے:

حضرت نعمانؓ بن بشیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم مومنوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور مہربانی کرنے میں ایسا ہی پاؤ گے جیسا جسم کو کہ اس کے ایک عضو میں تکلیف پیدا ہو جائے تو تمام اعضاء بیداری اور بخار میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں!"

اخوتِ باہمی کا ایک پہلو ہمسائیگی بھی ہے اور اسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عطا فرمایا ہے، بلکہ تاکید کی ہے کہ ہمسائے کا حق پورا پورا ادا کیا جائے، اور وہ حق کیا ہے؟ یہ کہ اس کے دکھ سکھ میں شرکت

کی جائے، اپنے امکان و استطاعت کے مطابق اس کی مدد کی جائے، کسی پریشانی میں مبتلا ہو تو اسے رفع کرنے کی کوشش کی جائے، بھوکا ہو تو کھانا کھلایا جائے اور اس کے ساتھ بالکل برادرانہ سلوک کیا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبرئیلؑ مجھے ہمیشہ پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا، کہ شاید اسے حقِ وراثت مل جائے گا!"

بخاری کے اسی باب میں ایک دوسری حدیث، ابو شریحؓ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں! خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں!

عرض کیا گیا: "یا رسول اللہؐ! کون؟"

آپؐ نے فرمایا: "وہ شخص جس سے اس کا ہمسایہ مامون نہ ہو!"

صحیح بخاریؒ کے اسی باب میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایمان کے بارے میں مروی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے، اور جو شخص خدا پر اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی خاطر داشت کرے، اور جو شخص خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ہمیشہ اچھی بات کہے، ورنہ خاموش رہے!"

جس سماج میں مفروضہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کی جاتی ہو، بلکہ زیرِ اصل میں بھی کمی کر دی جاتی ہو، جس سماج میں اخوتِ عامہ کی کارفرمائی ہو، مساوات کا دور دورہ ہو، پڑوسی کے ساتھ اس درجہ حسنِ سلوک کیا جاتا ہو کہ اندیشہ ہو چلے

کہ کہیں یہ شریکِ وراثت نہ کر دیا جائے، جس سماج میں ہر شخص ایک دوسرے کے دُکھ درد کا، اور نشاط و مسرت کا شریک ہو، جہاں مہمانوں کو سر پر بٹھایا جاتا ہو، وہ سماج کتنی بڑی نعمت ہوگی، اور اس سماج میں سے اُبھر کر جو لوگ حکومت قائم کریں گے، کیا وہ حکومت بھی مثالی اور فلاحی نہ ہوگی؟

اسلامی سماج کی بنیاد: حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سماج کی بنیاد قناعت پر، صبر پر، ایثار پر، احترامِ انسانیت پر اور انفاق فی سبیل اللہ پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، اور جو کچھ فرمایا ہے، وہ اس حقیقت کا نہایت شاندار اور دل آویز مرقع ہے۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے جوامع کلم اسی تابندہ حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

آپؐ کے پاس ایک جماعت حاضر ہوئی جس نے افلاس کے باعث رنگین کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

عدی رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی اور کھڑے ہوئے اور اُن پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی، پھر فرمایا:

اے لوگو! اپنی دولت میں سے کچھ خرچ کرو، اگرچہ ایک صاع ہو، نصف صاع ہو، ایک مٹھی ہو یا مٹھی کا کچھ حصّہ ہو، جس کے ذریعے تم جہنم کی گرمی یا آگ سے اپنے چہرے کو بچا سکو۔ اگرچہ ایک کھجور ہو، یا کھجور کا ایک ٹکڑا ہو، اگر یہ بھی نہ ملے تو میٹھے بول ہی سہی۔ جب تم میں سے کوئی اللہ سے ملے تو وہ پوچھے گا: "کیا میں نے تجھے مال اور اولاد نہ دی تھی؟"

وہ کہے گا، ہاں دی تھی!

وہ پوچھے گا۔ "اپنے لیے تو نے آگے کیا بھیجا؟"

تو وہ اپنے سامنے، پیچھے، دائیں، بائیں دیکھے گا اور جہنم کی گرمی سے اپنے تئیں بچانے کے لیے کچھ نہ پائے گا۔

اس لیے تمھیں چاہیئے کہ اپنے چہرے کو دوزخ کی حرارت سے بچاؤ،

اگرچہ کھجور کے ٹکڑے ہی سے ہو سکے، اگر یہ بھی نہ ملے تو میٹھے بول ہی سہی۔ کیونکہ میں تمہارے لیے افلاس اور فاقہ کے باعث کچھ خطرہ نہیں محسوس کرتا۔ اللہ تعالیٰ دور کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔ یہاں تک کہ یثرب اور حیرۃ کے درمیان ایک عورت گزرے گی اور اسے کہیں بھی بدروں کا کھٹکا نہیں ہوگا۔[۶۱۲]

سورۂ فرقان میں بندگانِ خدا کو بہت داد دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما ط

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرتے ہیں تو سلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔"[۶۱۳]

ایک موقع پر مسلمان کے اخلاق کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

اذا ما غضبوا ھم یغفرون

"یعنی جب ان کو غصہ آجاتا ہے تو خطاؤں سے درگذر کرتے ہیں"![۶۱۴]

پھر ارشاد ہوا:

ومن صبر وغفر ان ذلک من عزم الامور ط

"اور جو صبر کرے اور خطاؤں سے درگذر کرے تو بیشک یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔"[۶۱۵]

گویا مسلمانوں کے جس اخلاق کا تصور قرآن کریم نے دیا ہے یہ ہے:

: زمین پر وقار کے ساتھ چلنا، نرمی و نخوت کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلنا۔

: غصے کی حالت میں بھی خطا بخش، خطا پوش ثابت ہونا۔

: صبر اور درگذر کا شمار "عزم الامور" میں ہے۔

جو سوسائٹی اس سانچے میں ڈھلی ہو اور جس کے افراد اس اخلاق سے متصف ہوں، کیا وہ بجائے خود اور اس کی قائم کی ہوئی حکومت بھی دنیا کے لیے امن و راحت اور نوید نشاط و طرب نہیں ہوگی!

صحابۂ کرام میں حضرت عمرؓ روحِ اسلام کے بہت زیادہ رازداں تھے ان کے فیصلوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گفتار و کردار میں اسلام کی حقیقی روح جھلکتی نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے پورے دورِ خلافت میں جو حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت کی طرح مختصر نہ تھا بارہا ایسے فیصلے صادر کیے ہیں، جو اس حقیقت کے غمّاز ہیں کہ اسلام کی تعلیم، اس کے پیام اور فلسفۂ حکمرانی کو انھوں نے اپنے قول و فعل میں شیر و شکر کی طرح آمیز کر لیا تھا۔ استاذ سید قطب شہیدؒ کا بیان ہے:

"حضرت عمرؓ سے متعلق مروی ہے کہ آپؓ نے ایک مرتبہ دوسرا دودھ زمین پر بہا دیا جس میں پانی ملایا گیا تھا، ان کا یہ فعل مصلحتِ عامہ کے حفظ و بقا کے لیے تھا کہ "اجر" عوام کو دھوکا دینے کی جرأت نہ کریں۔" [۲۶]

ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنا بھی اسلامی سماج کا شعار بلکہ فریضہ ہے:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ط

یعنی تم نیکی کو اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیز راہِ خدا میں خرچ نہ کرو جسے تم بے حد عزیز رکھتے ہو" [۲۷]

عملِ صالح، اسلامی سماج کی ایک نمایاں خصوصیت ہے:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت اُولٰئک ھم خیر البریّۃ

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے وہ خلقِ خدا میں بہترین لوگ ہیں!" [۲۸]

نیز ارشاد ہوا:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت لھم اجر غیر ممنون

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے غیر منقطع اجر ہے!" [۲۹]

امانت میں خیانت ایک ایسا جرم ہے جو اسلامی معاشرے میں ناقابل درگذر اور ناقابل برداشت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا	"یعنی بلاشبہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے
الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم	کہ امانتوں کو ادا کیا کرو۔ اور جب فیصلہ
بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ	کرو تو انصاف کے ساتھ کیا کرو۔"

امانت ادا کرنے اور انفاق کی ترغیب کے ساتھ ساتھ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم بھی اسلامی سماج کو دی گئی ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً	"اور اپنا ہاتھ نہ تو اس طرح سکیڑ
إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ	لو کہ گویا گردن میں بندھ گیا اور نہ بالکل
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا	پھیلا دو، ورنہ تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ
	جاؤ گے، اور لوگ تمہیں ملامت کریں گے

بیمار کی عیادت بھی مسلم سماج کے خصائص میں ہے اور اس فریضے کے انجام دینے میں بھی عقیدہ و مذہب کا کوئی سوال نہیں ہوتا:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا، تو آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔

اہل کتاب میں سے ایک آپؐ کا خادم تھا، آپؐ نے اس کی بھی عیادت فرمائی۔ آپؐ نے اپنے چچا کی عیادت بھی فرمائی، حالانکہ وہ مشرک تھے۔

مسلم سماج کے افراد ظلم کو کس طرح روکتے ہیں؟:

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم!"

لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کریں لیکن ظالم کی مدد ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا: "ظالم کا ہاتھ پکڑ لو یعنی اس کو ظلم سے روک دو۔"[۴۳]

اس طرح ظالم کا صدور ممکن نہیں رہتا، اور ارادۂ ظلم کرنے والا عقاب سے بچ جاتا ہے جو اس کی بھی مدد ہے۔

حسنِ اخلاق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں:-

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں کبھی تشریف نہ لاتے کہ گھر والوں کو پریشان کر دیں، بلکہ اس طرح تشریف لاتے کہ پہلے سے آپؐ کی تشریف آوری کی اطلاع پہنچ جاتی، آپ تشریف لاتے پھر سلام کرتے۔"

صحیح بخاری میں ہے کہ تین باتیں جس نے جمع کر لیں، اس نے ایمان کو حاصل کر لیا: ۱۔ سلام کرنا ۲۔ تنگی کے وقت راہِ خدا میں خرچ کرنا۔

۳۔ اپنے آپ سے انصاف کرنا۔

اور سلام کرنے کی مد میں تو تواضع و انکساری بھی ہے۔ ایسا آدمی کسی کے سامنے تکبر نہیں کرتا، بلکہ ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب، جاننے والے اور نہ جاننے والے کو سلام کرتا ہے اور تکبر کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ وہ اس شخص کے سلام کا جواب بھی تکبر کے باعث نہیں دیتا، جو خود اسے سلام کرے۔ اس صورت میں وہ خود کیسے کسی کو سلام کرے گا!

ایک مرتبہ آپؐ بچوں کے پاس سے گزرے تو انھیں سلام کیا۔

صحیحین میں ہے کہ آپؐ اپنے گھر والوں کا دروازہ رات کو نہ کھٹکھٹاتے بلکہ شام کو یا صبح کو داخل ہوتے۔ اور جب آپؐ سفر سے آتے تو خاندان کے بچوں سے آپؐ کی ملاقات ہوتی۔ حضرت عبداللہؓ بن جعفر فرماتے ہیں:

"ایک بار آپؐ سفر سے تشریف لائے تو میں نے آپؐ کی طرف سبقت کی، چنانچہ آپؐ نے مجھے آگے بٹھا لیا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے حسنؓ یا حسینؓ تشریف لائے تو آپؐ نے انھیں پیچھے بٹھا لیا۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم تینوں ایک سواری پر مدینہ میں داخل ہوئے۔"

اور سفر سے آنے والے کے ساتھ آپؐ معانقہ فرماتے، اور اگر گھر والا ہوتا تو اس کا بوسہ لیتے۔

مسلم سماج کے اخلاق و صفات کا ایک اور پہلو:-

نیز (مناسب) حرکات میں سے یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے اپنی بیوی کی خفیہ باتوں کا یا آپس کی باتوں کا تذکرہ کرے، جیسے کہ بعض لوگوں کی عادت خبیثہ ہے!

نیز زعموا و ذکروا و قالوا (کہا جاتا ہے، مشہور ہے، لوگ کہتے ہیں) جیسے الفاظ سے حکایت کرنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرماتے تھے۔

نیز یہ کہ بادشاہ کو زمین میں خلیفۃ اللہ یا نائب اللہ کہا جائے کیونکہ خلیفہ اور نائب تو غیر موجود کے ہو سکتے ہیں، اور اللہ تبارک و تعالیٰ خود اپنے گھر سے غیر حاضر ہونے والے کا خلیفہ اور اپنے مومن بندے کا کارساز ہے۔

معمولی سے معمولی کام بھی صدقہ اور نیکی ہے اور موجب اجر ہے:-

حضرت ابوذر رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ افضل عمل کونسا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: "اللہ پر ایمان رکھنا اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔"

پھر میں نے پوچھا: "کس قسم کے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟"

فرمایا: "جو قیمت کے اعتبار سے گراں ہو اور مالکوں کے نزدیک پسندیدہ و محبوب ہو!"

اس کے بعد میں نے پوچھا: "اگر میں یہ نہ کر سکوں!"

آپؐ نے فرمایا: "پھر کسی کاریگر کی مدد کرو یا کسی بے کار یا بے ہنر کا کام کر دیا کرو!"

میں نے عرض کیا: "اگر میں یہ بھی نہ کر سکوں!"

آپؐ نے فرمایا: "لوگوں کو شر سے بچاؤ، یہ لوگوں کو اذیت نہ دو، کہ یہ بھی صدقہ

ہے جیسے تم اپنی جان پر تصدق کرتے ہو!"[۳۵]

مصالحت کی کوشش بھی مقبول و محمود ہے:

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص لوگوں میں صلح کرائے تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔[۳۶]

شہادت اور گواہی کی اہمیت: عدالتی معاملات کو سلجھانے میں سب سے زیادہ ترجیح گواہی کو دی گئی ہے اور اس میں یہ تاکید ہے کہ شہادت نہ چھپائی جائے۔ لہٰذا اس پر وعید بھی وارد ہوئی۔

یاایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ "یعنی اے ایمان والو! انصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے لیے شہادت دینے والے بنو، خواہ تمہاری یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔"[۳۷]

پھر فرمایا:

ومن یکتمہا فانہ آثم قلبہ۔ "یعنی شہادت چھپاؤ۔ جو کوئی گواہی چھپائے تو اس کا دل گناہ گار ہوتا ہے۔"

جس سماج کے لوگ اس درجہ انصاف پسند اور عدل دوست ہوں کہ نہ صرف عدل و انصاف کو قائم کریں بلکہ اگر ضرورت ہو تو وہ باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ضرورت میں گواہی دیں اور جس سماج کے لوگوں کو یہ سبق سکھایا گیا ہو کہ اخفائے شہادت جرم ہے، اس کا ارتکاب ہرگز نہ کریں، وہ ساری دنیا کے لیے سراسر رحمت اور نور ہدایت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسلامی معاشرہ میں تعزیت اور اس کے آداب: اور آپؐ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میت کے اہل خانہ تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کو کھانا نہ کھلائیں، بلکہ آپؐ نے حکم دیا کہ وہ سرے سے لوگ (دوست اور عزیز)

ان کے لیے کھانا تیار کر کے بھیجیں اور یہ چیز اخلاقِ حسنہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور پس ماندگان کو سبک دوش کرنے والا عمل تھا، کیونکہ اس وقت وہ اپنی مصیبت کے باعث لوگوں کو کھانا کھلانے سے معذور ہوتے ہیں۔[۳۹]

ناپ تول میں کمی کو اللہ تعالیٰ فساد فی الارض سے تعبیر کرتا ہے:

ولا تخسروا الکیل والمیزان — یعنی پیمانے اور ترازو کو پورا تولو، اور لوگوں کو
ولا تبخسوا الناس اشیاءھم — تم انہیں کم نہ دو۔ زمین میں اصلاح کے بعد
ولا تفسدوا فی الارض بعد — فساد نہ پھیلاؤ۔
اصلاحہا۔

بطلان پرستی شعار اسلام نہیں: اسلامی سماج میں بطل پرستی کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ نبی کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے، لہٰذا ہر فرد سے خواہ وہ کتنا ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہو، فہم کی غلطی ہو سکتی ہے، اقدام عمل کی غلطی ہو سکتی ہے اور اس غلطی سے اس کے مرتبہ و فضیلت پر کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ غلطی دیانتِ فکر پر مبنی ہو، خود رائی اور تمرد پر مبنی نہ ہو:

ایک مرتبہ عبداللہ بن عمرؓ سے ایک مسئلے کے سلسلے میں سوال کیا گیا اور دریافت کیا گیا۔

"آپؓ کے والدؓ نے تو اس سے منع کیا ہے!"

ابن عمرؓ نے جواب میں کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا میرے باپ کا قول!"

ابن عباسؓ نے ایک شخص سے جو کہ مسئلہ میں ابوبکرؓ کے قول سے استشہاد کیا کرتا تھا کہا: "مجھے ڈر ہے کہیں تم پر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں، میں کہتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، اور تم کہتے ہو، ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کہا ہے!

یہ ہے اہلِ علم کا جواب، نہ یہ جواب کہ عثمانؓ و ابوذرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے تمہارے مقابلے میں زیادہ واقف تھے۔

ابنِ قیم کے یہ آخری الفاظ روحِ اسلام کا نچوڑ ہیں۔ ان کی صداقت اور واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خدمتِ خلق: خدمتِ خلق عبادت سے بھی افضل ہے:

حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ لوگوں نے روزہ رکھا تھا اور بعض روزہ سے نہیں تھے۔ اس حال میں ہم نے ایک سخت تپتے ہوئے دن ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہم میں سے زیادہ سایہ اسے میسر تھا جس کے پاس چادر تھی۔ بعض ہاتھوں سے دھوپ کا بچاؤ کر رہے تھے۔ آخر روزے دار اصحاب تو آرام کرنے لگے اور جنھوں نے روزہ نہیں رکھا تھا انھوں نے خیمے نصب کیے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آج سارا اجر ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا، جو روزے سے نہیں تھے۔"

خدمتِ خلق جہاد کی ہم پایہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "غریبوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے والا وہی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا یا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا ہے!"

ایک موقع پر ارشاد ہوا: "غیبت چغلی اور غیبت اسلامی شے نہیں!"

نیز فرمایا: "ہر مسلمان ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے!"

نیز یہ کہ: "تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور تم سے ہر ایک سے باز پرس بھی ہوگی!"

برائی اور بدی کو برداشت کر لینا مسلمان کا شیوہ نہیں: "تم میں سے

جو دوسرے کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے زبردستی روک دے جو یہ نہ کر سکے تو زبان سے اسے روکنے کی کوشش کرے جس میں یہ ہمت بھی نہ ہو تو کم از کم دل میں اس کے خلاف جذبہ رکھے اور یہ ایمان کا سب سے پست درجہ ہے!

بھوکے کو کھانا کھلانا صرف موجبِ اجر ہی نہیں فرض کفایہ بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جس بستی میں کوئی شخص صبح اس حالت میں کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے!"

اور باہمی حقوق میں ایک اور ارشادِ رسولؐ:

"جس کے پاس زائد سواری ہو اسے چاہیے کہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد از ضرورت زادِ راہ ہو وہ اس کے حوالے کر دے جو زادِ راہ سے محروم ہو"

ضیافت کی ترغیب: "جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے آدمی کو (مہمان بنا کر) لے جائے، اور اگر چار کا ہو تو پانچویں یا چھٹے کو!"

اُمتِ مسلمہ کی مثال:-

"باہم لطف و کرم اور الفت و محبت میں مسلمان کی حال جسم کا سا ہے، کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بدن کا ہر عضو بے خوابی اور بخار کے ذریعہ اس کا شریکِ غم بن جاتا ہے!"

مردِ مومن کا مرتبہ:- "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی اینٹوں کی طرح ہے کہ ان میں ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رکھتی ہے۔"

معاملات کو سرانجام دینے کے سلسلے میں قرآن پاک کی واضح ہدایت:

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ۔

یعنی اے ایمان والو! جب کسی مدت معین کے لیے تم باہمی طور پر قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت عطا کی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے، وہ لکھے اور املا وہ شخص کروائے جس پر حق آتا ہے، (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ یعنی اپنے رب سے ڈرنا چاہیے۔ کہ جو معاملہ طے پا گیا ہو، اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہ کرے، لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کروائے۔

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ۔

پھر دو مردوں کی گواہی کرا لو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں، تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسرا اسے یاد دلا دے۔ یعنی ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان قابلِ قبول ہو۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا

یعنی گواہوں سے جب گواہی کے لیے کہا جائے تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے!

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ

یعنی شہادت نہ چھپاؤ، جو گواہی چھپاتا ہے اس کا دل گنہگار ہے۔

غور کا مقام ہے کہ کتنی باریکیوں کو ان احکام میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ملحوظ

رکھی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں کس درجہ صفائی کی تاکید کی ہے۔ تاکہ بعد میں نظافت کا امکان ہی نہ رہے۔

اسی حسن سلوک، رحمت و شفقت اور نرمی و عطوفت کی لسان نبوت نے مسئلہ مہ شرے کو بار بار تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"تم زمین کے بسنے والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

رحم و کرم کی تاکید صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر ذی روح کو اس میں شامل ہے:

ایک بار ایک آدمی اپنے راستہ پر جا رہا تھا، کہ اسے سخت تشنگی محسوس ہوئی۔ اس میں اسے کنواں نظر آیا، اس میں اتر کر پانی پی کر باہر نکلا تو باہر ایک کتا ہانپتا نظر آیا جو کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ آدمی نے سوچا کتا بھی پیاس سے تڑپ رہا ہے اور اسے اتنا ہی پانی درکار ہے جتنا مجھے تھا، چنانچہ وہ کنوئیں میں پھر اترا اور اپنے چمڑے کا موزہ بھر لیا۔ وہ اسے اپنے منہ سے پکڑے ہوئے اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلا دیا۔

اللہ نے اس عمل کی قدر کی اور اسے بخش دیا۔

لوگوں نے دریافت کیا۔ "یا رسول اللہ! کیا حیوانوں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی اجر ملے گا؟"

آپ نے فرمایا: "ہاں! ہر ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے۔"

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "ایک عورت دوزخ میں صرف اس لیے ڈال دی گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا، نہ خود اسے کھلایا، نہ اسے آزاد کیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر پیٹ بھر لے۔"

ایک حدیث قدسی:

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: "اے ابن آدم میں بیمار پڑا

تو میری عیادت کو نہ آیا۔"

ابنِ آدم جواب دے گا: "پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا!"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اے ابنِ آدمؑ! میں نے تجھ سے کھانا کھانے کو کہا، تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا، جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک و رازق ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا کھانے کو مانگا، اور تو نے اسے نہیں کھلایا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے (کھانے کو) میرے پاس پاتا۔"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا، تو نے مجھے پانی بھی نہ پلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا، جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟"

اللہ فرمائے گا: "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی التجا کی، تو نے اسے پانی نہیں پلایا، اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو آج وہ پانی میرے پاس پا لیتا۔"

اسلامی سماج کا ضابطۂ اخلاق: حاجت مندوں پر خرچ کرنے اور ان کی ضرورت رفع کرنے پر قرآن نے زور دیا ہے، لیکن زیادہ زور اس پر ہے کہ مدد پوشیدہ کی جائے تاکہ مدد لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

"ان تبدوا الصدقات فنعما ھی وان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم"

یعنی اگر صدقات علانیہ دو، تو یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو۔ تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔[۱۱]

اسلامی سماج کا ضابطہ اخلاق، ارشاد نبوی کی روشنی میں:

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا: "چھوٹے بڑے کو، چلنے والا بیٹھنے والے کو۔ اور تھوڑے آدمی بہت سے آدمیوں کو سلام کریں!"

ایک اور حدیث:-

حضرت عبداللہ رضؓ بن عمر رضؓ کہتے ہیں، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی شخص کو یہ سزاوار نہیں کہ کسی آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا کر خود وہاں بیٹھ جائے۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ "دوسرے آدمی کے آجانے پر بیٹھنے والوں کو چاہیے کہ وہ کھل کر بیٹھ جائیں اور جگہ نکال لیں۔"

ایک اور ہدایت:

حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم تین آدمی ہو، تو دو خفیہ طور پر کوئی بات نہ کریں، جب تک کہ اور لوگ بھی تینوں میں شامل نہ ہو جائیں، تاکہ تیسرا آدمی رنجیدہ نہ ہو۔"[۱۲]

اس ضابطۂ اخلاق اور اس دستورِ زندگی پر جو سماج عامل ہو، یقیناً وہ فلاحی اور مثالی سماج کہلائے جانے کی مستحق اور سزاوار ہے۔ یاد رہے یہ صرف چند زریں اصول نہیں ہیں، بلکہ ایسے اصول ہیں جن پر دنیا عمل ہوتے دیکھ چکی ہے اور ہر نقصیدت ختم کر چکی ہے۔

جو چیزیں کسی ملت، قوم اور سماج کو تباہ کر دیتی ہیں، ان میں ایک چیز

خویش پروری بھی ہے۔ خویش پروری خطرناک ہے۔ اس بات سے کہ مستحق کو محروم کر کے غیر مستحق کو نوازا جائے۔ یہ چیز عدل و انصاف کے خلاف ہے انسانیت اور شرافت کے بھی خلاف ہے۔ اسلام نے اس چیز کو حق کے ساتھ مٹا دیا ہے اور سب برابر ہو گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ قائم رہی اسلام کی پابندی بھی برابر ہوتی رہی۔ اور امت مسلمہ اس فتنے سے محفوظ رہی۔

ہمارے سامنے صدیق اکبر کی مثال ہے۔ انھوں نے جب یزید بن ابی سفیان کو شام کی کورنری پر مامور کیا تو فرمایا:

"تمہاری رشتہ داری کا معاملہ درست ہے لیکن ہے اپنے عزیزوں کو فائدہ پہنچانا وہ بدترین چیز ہے جس امت میں مبتلا ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جو مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی شخص کو بلا استحقاق رعایت کے طور پر حاکم بنا کر مسلط کرے تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ خدا اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ فرمائے گا۔ یہاں تک کہ اسے جہنم میں داخل کر دے گا۔"

اسلامی تاریخ کے لیے جو فرمان جاری اور دستور اخلاق اسلام نے دنیا کو دیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا نمونہ کہیں اور نہیں ملتا۔ انسانی حقوق اور تعلیم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلاح عمومی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ رعایت اور انسانیت عظمیٰ کے بام بلند تک پہنچنے کے لیے وہ چیزیں صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ جو اس کار عظیم کو انجام دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

"خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تم پست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

"ناانصافی دشمن کے ساتھ بھی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی قوم کی عداوت کا ہونا

تمہیں انصاف سے منحرف نہ کردے۔ ہر حالت میں انصاف کرو، کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور تقویٰ اختیار کرو، تم جو کچھ کرتے ہو، خدا خوب جانتا ہے۔[۵۱]

مشرکین مکہ تک سے کہ انھوں نے اسلام اور داعی اسلام کے خلاف کیا کچھ نہ کیا، رحمت و رافت کا برتاؤ کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے:

"ان لوگوں کی اس مخالفت کا کہ انھوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، یہ نتیجہ نہ نکلے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو، تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ان کی مدد کرو، اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو، خدا سے ڈرتے رہو۔[۵۲]

اسلام آنے سے پہلے دشمنی اور عداوت کا کیا عالم تھا لیکن اسلام نے سب کو بھائی بھائی بنادیا، اسلام اسے اپنا احسان سمجھتا ہے اور یاد دلاتا ہے:

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" "یعنی تم خدا کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے"

یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں میں جو رشتہ خدا نے قائم کیا ہے، وہ اخوت کا ہے:

"انما المؤمنون اخوۃ" "یعنی سب ایمان والے آپس میں بھائی ہیں"[۵۳]

اللہ تعالیٰ اپنے کن بندوں کو زیادہ "محبوب" رکھتا ہے!

جو اللہ سے محبت رکھتے ہوں:

"یحبہم ویحبونہ" "یعنی یہ بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان بندوں کے ساتھ محبت کرتا ہے"[۵۴]

جو احسان کرتے ہوں:

"ان اللہ یحب المحسنین" "یعنی اللہ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"[۵۵]

"ان اللہ یحب المقسطین" "یعنی اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"[۵۶]

"ان اللہ یحب المتقین" یعنی اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔[۵۶]

جو تائب ہوں:-

"ان اللہ یحب التوابین" توبہ کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔[۵۷]

جو صابر ہوں:

"واللہ یحب الصابرین" صبر کرنے والوں سے اللہ محبت رکھتا ہے۔[۵۸]

جو پاک اور طاہر ہوں:-

"واللہ یحب المطہرین" "پاک صاف رہنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے"[۵۹]

اور اللہ کن لوگوں سے محبت نہیں کرتا اور کن باتوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے:

جو ڈینگ کی چوٹ برائی کا بیان کرتے ہوں:-

"لا یحب اللہ الجہر بالسوء" "یعنی اللہ برائی کی اشاعت ناپسند کرتا ہے"[۶۰]

ظالموں سے محبت نہیں کرتا:-

"ان اللہ لا یحب المعتدین" "یعنی اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے"[۶۱]

نخوت پسندوں کو پسند نہیں کرتا:

"ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً" بے شک اللہ تعالیٰ حیلہ باز، اترانے والے کو پسند کرتا ہے"[۶۲]

خائنوں سے محبت نہیں کرتا:-

"ان اللہ لا یحب الخائنین" "یعنی خیانت کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا"[۶۳]

نیز:

"ان اللہ لا یحب کل خوان کفور" "یعنی خیانت کرنے والے، احسان کو فراموش کرنے والے، اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۴]

شیخی بازوں سے خدا خوش نہیں:

"ان اللہ لا یحب الفرحین" "یعنی اللہ شیخی بگھارنے والے کو ناپسند کرتا ہے"[۶۵]

فساد برپا کرنے والوں سے خدا خفا رہتا ہے:

فساد برپا کرنے والوں سے خدا خفا رہتا ہے:

"ان اللہ لا یحب المفسدین" "یعنی فساد کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۶]

کافروں سے بھی خدا بیزار ہے:

"ان اللہ لا یحب الکافرین" "یعنی اللہ کافروں کو ناپسند کرتا ہے"[۶۷]

فضول خرچ بھی:-

"لا یحب المسرفین" "یعنی اسراف کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۸]

ظالموں سے خدا متنفر ہے:-

"ان اللہ لا یحب الظالمین" "ظلم کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۹]

اور اس سماج سے ابھر کر جو لوگ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم باقی رہ گیا تھا۔ انھوں نے سوچا، یہ معمولی سی رقم بھی کیوں پڑی رہے۔ اٹھا کر حضرت عمرؓ کے بیٹے کو دے دیا۔ انھیں پتہ چلا تو فوراً وہ درہم بیت المال میں داخل کرا دیا۔ پھر ابوموسیٰ اشعریؓ کو طلب کیا اور کہا افسوس کا مقام ہے کہ تمھیں سارے مدینے میں آلِ عمرؓ کے علاوہ کوئی دوسرا غریب نظر نہ آیا۔ کیا تمھاری خواہش ہے کہ قیامت کے روز اُمّتِ محمدیہ کا مطالبہ میری گردن پر رہے[۷۰]

کفر سازی اور فرقہ آرائی: فرقہ آرائی اور تکفیر کو بھی اسلامی سماج میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ حضرت علیؓ ایک خطبہ میں جس کے مخاطب خوارج ہیں فرماتے ہیں:

"اگر تم میرے اس سیدھے موقف پر کہ تمھارا گمان ہے کہ میں نے خطا کی، اور گمراہ ہو گیا تو میری گمراہی کے باعث ساری اُمّتِ محمدیہ کو کیوں گمراہ سمجھنے لگے ہو؟ تمھارے کند خیال پر تلوار میں ہیں، تم انھیں صحت و بیماری (گناہ و ثواب) کے موقع پر (بے دھڑک) استعمال کر رہے ہو، اور جس نے گناہ کیا ہے اور جس نے

گناہ نہیں کیا ہے۔ (دونوں کو) باہم خلط ملط کر دیتے ہو، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زانی کو سنگسار کیا، پھر اس پر نماز پڑھی اور اس کے ورثاء کو اس کی میراث بھی عطا فرمائی، قاتل کو بہ بنائے قصاص قتل کیا۔ اور اس کی میراث ورثاء میں تقسیم کی، چور کے ہاتھ کاٹے اور زانی بے ہمسر کو تازیانہ کی سزا دی۔ (بایں ہمہ) انھیں مالِ غنیمت میں حصہ بھی دیا، اور انھوں نے مسلمان عورتوں سے بغیر کسی رکاوٹ کے شادیاں بھی کیں۔ پس ثابت ہوا کہ رسولِ خدا نے انھیں کافر نہیں قرار دیا، بلکہ ان کے گناہوں کی سزا انھیں دی، خدا کا حق ان کے بارے میں جاری کیا۔ لیکن اسلام میں ان کے جو حصے تھے وہ نہیں روکے گئے۔ مسلمانوں کی شہریت سے ان کا نام خارج کیا گیا تھا؟ کس اصول سے کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم اشرار الناس ہو کہ جسے شیطان نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیا ہے۔ اور گمراہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔[۱۷]

فرد اور اُمت: مقروض کا خیال بھی اسلامی سماج میں زیادہ سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی معذور ہے، تو اس کا بار قرض اُمت کے ذمے ہے اور زیادہ ہو تو قرض دینے والا اپنا زرِ اصل کم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے:۔

ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے پھلوں کی ایک باغ خریدا، آفاتِ سماوی کے باعث باغ برباد ہو گیا اور وہ شخص قرض دار ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لوگوں کو تلقین کی کہ اس کے بارِ قرض میں حصہ لیں، چنانچہ لوگوں نے امداد کی، لیکن اتنی رقم جمع نہیں ہو سکی کہ سارا قرض ادا کیا جا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو مل رہا ہے، لے لو، اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔"

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھا، جب آپؐ کی نظر اُحد (پہاڑ) پر پڑی تو فرمایا:

"میں اسے پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے لیے سونا بن جائے تو میں دن سے زیادہ اس میں سے میرے پاس ایک دینار بھی باقی رہے، البتہ وہ دینار جسے میں نے قرض ادا کرنے کے لیے روک لیا ہو۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"دولت مند لوگ نیکیوں کے اعتبار سے بہت کم ہوتے ہیں، مگر ہاں وہ مالدار شخص جو اپنے مال کو اس طرح خرچ کرے۔"

یہ فرما کر آپؐ نے دونوں ہاتھوں سے کھوبچے بنا کر آگے اور دائیں بائیں کے دینے کا اشارہ فرمایا، یعنی یہ بتلایا کہ کھوبچے بھر بھر کے اس طرح دے، اور ہر نیک کام میں بے دریغ خرچ کرے اور ایسے آدمی بہت کم ہیں۔

قرآن کریم کی چند آیات کریمہ بھی اس سلسلے میں پیش نظر ہیں تو دیکھیے:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومنهم من عاهد الله لئن آتانا من فضله لنصدقن ولنكونن من الصالحين

"یعنی ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا کہ اگر ہم کو اس نے دولت عطا کرے گا تو ہم تیری راہ میں صدقہ کریں گے اور اس طرح صالحین میں سے ہو جائیں گے، پھر جب خدا نے انھیں مال دیا تو اس کی محبت میں خدا کو بھول کر بخل کرنے لگے۔"

ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت بھی ہے:

"ولا تبذر تبذيرا"

یعنی دولت کو بے جا مت خرچ کرو۔

منافقین کی تعریف:

"المنٰفقون والمنٰفقٰت بعضہم من بعض یامرون بالمنکر وینھون عن المعروف ویقبضون ایدیھم نسوا اللہ فنسیھم ان المنٰفقین ھم الفاسقون ط

یعنی منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی قسم کے ہیں، برائی کا حکم دیتے ہیں، نیکیوں سے روکتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا وقت آئے تو مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا، بے شک نہیں کہ یہ منافق ہی ہیں جو سخت فاسق ہیں۔"[۵۷۶]

صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ تو اسے بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ دولت جمع کریں اور امیر سے امیر تر بن جائیں۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

"اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں، جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ خدا کی قسم نہ تو اللہ کی کتاب میں ان کی کوئی سند ہے نہ نبیؐ کی سنت میں ان کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ بخدا میں دیکھ رہا ہوں کہ حق پامال کیا جا رہا ہے۔ باطل کو از سرِ نو زندگی بخشی جا رہی ہے۔ ــــ دولت مندو! تمھیں چاہیے کہ غریبوں کے ساتھ اخوت کا برتاؤ کرو ــــ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، انھیں بشارت دو کہ ان کی پیشانی پر، پہلو پر، پشت پر، آگ سے داغ لگائے جائیں گے۔ اے مال جمع کرنے والے، جان لے کہ مال میں تین شریک ہیں:-

ایک تقدیر ہے، جو تجھ سے اجازت نہیں لے گی کہ تباہی یا موت کے ذریعہ تیرے مال کا اچھا حصہ لے جائے یا برا۔

دوسرے وارث ہیں، جو منتظر ہیں کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ مال پر قبضہ کریں، اور تو خود مفلس رہ جائے۔

تیسرے تیرا حق ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ تو تینوں میں سے سب سے کمزور شریک

بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا اہتمام کرو!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یعنی تم نیکی کے درجہ کو اس وقت تک نہیں
لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما پہنچ سکتے، جب تک ان چیزوں کو راہِ خدا
تحبون میں خرچ نہ کرو، جو تمہیں محبوب ہیں۔

"اے لوگو! تم اب ریشمی پوشاک اور دیباج کے گاؤ تکیے استعمال کرنے لگے ہو۔ اور اب تم آذر بائیجان کے بنے ہوئے (غالیچے) فرش پر سونے بے تکلیف محسوس کرتے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے، تمہارے ہاں طرح طرح کے کھانے دسترخوان کی زینت بنتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جَو کی روٹی بھی میسر نہ تھی کہ شکم سیر ہو کر کھاتے!"

ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت: اسلام میں ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت کبھی درجہ محبوب، درنامرغوب چیز ہے۔ دولت اس لیے ہے کہ اچھے کاموں پر خرچ کی جائے، اس لیے نہیں ہے کہ اسے زیرِ زمین دفن کر دیا جائے یا تجوریوں میں بند کر دیا جائے، یا اس سے غلط قسم کی بلکہ بھیانک اور سفاکانہ منفعت حاصل کی جائے۔ قرآن مجید نے ارتکازِ دولت کو ذرا بھی پسند نہیں کیا ہے، بلکہ صاف صاف فرما دیا ہے:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ "تاکہ یہ مال فقط تم میں سے جو دولت مند ہیں، انہی کے درمیان چکر نہ لگایا کرے۔"

جو بات آج کے ماہرینِ معاشیات و اقتصادیات ایک بلند آہنگ فلسفے کے طور پر پیش کر رہے ہیں، وہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے ایک اُمّی کی زبان سے قرآن نے کہیں زیادہ جامع و مانع اور اثر انگیز طور پر کہلا دی تھی — صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد

فرمایا ہے:

"جس نے احتکار (ذخیرہ اندوزی) کیا، وہ غلط رو ہے!"

ایک اور حدیث میں مزید صراحت فرمائی گئی:-

"جس نے چالیس دن تک مسلمانوں کی غذا کو ذخیرہ کیے رکھا، اسے اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، نہ اللہ کو اس کی کوئی پروا ہے!"

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے ابنِ آدم! تیرے لیے ضرورت سے زیادہ مال خرچ کر دینا تیرے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تو اسے روکے رکھے، کیونکہ یہ چیز برے نتائج کی حامل ہے!"

حضرت بلال رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے، اسے چھپا کر نہ رکھ، اور جو تجھ سے روکا جائے، اس میں بخل سے کام نہ لے!"

کسی نے کہا: "یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "یا تو یہ کرنا ہوگا، ورنہ (دوزخ کا) ایندھن بننا پڑے گا!"

دورِ خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں سے کسی نے اسلام کی اس تعلیم کو عملی جامہ پہنایا۔ فاطمی عہدِ حکومت میں:

"فتح حاصل کرنے کے بعد جوہر نے جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کی، وہ قحط و فاقہ مستی کی اس شدت کو کم کرنے کی کوشش تھی، جو ملک پر عرصہ سے مسلط تھی، چنانچہ اس نے غلہ کا ایک گودام قائم کیا، اور اسے محتسب کی نگرانی میں دے دیا، محتسب کا اہم فریضہ غلہ کے استکار کو روکنا تھا۔"

آج بھی ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ احتکاز دولت اور ذخیرہ اندوزی

کے باعث غریب عوام کو کتنی شدید اور ناقابلِ برداشت اذیتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، لہٰذا ہم صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ چیز سماج اور سوسائٹی کے لیے کس درجہ ہلاکت انگیز اور تکلیف دہ ہے! اسلام نے سختی کے ساتھ ارتکازِ دولت اور ذخیرہ اندوزی کا دروازہ بند کر دیا، اور اسلامی سماج جب تک اسلامی سماج رہی، دیانت اور صداقت کے ساتھ اس پر عمل بھی کر دکھایا، جس سماج میں ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت کی لعنت نہ ہو، اس کے سراسر رحمت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

حضرت علیؓ کی گفتار و کردار: حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ رات بھر باغ سینچ کر تھوڑے سے جو مزدوری میں حاصل کیے، صبح گھر تشریف لائے، تو ایک ثلث پسوا کر حریرہ پکوانے کا بندوبست کیا؛ ابھی تیار ہی ہوا تھا کہ ایک فقیر نے صدا دی۔ آپؓ نے سارا اسی کو دے دیا، اور جو باقی رہ گیا تھا اس کے دوسرے ثلث کے پکنے کی راہ دیکھنے لگے، وہ جیسے ہی تیار ہوا، ایک یتیم نے سوال کیا، وہ بھی بے تامل اسے دے دیا، تیسرا حصہ جو بچ رہا تھا وہ ایک مشرک قیدی کو دے دیا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس ایثار نے شرفِ قبول حاصل کیا۔ چنانچہ آیۂ کریمہ: "ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا ویتیما واسیرا" اسی موقعہ پر نازل ہوئی۔

یہ مثال اسلامی سماج کے ایک فرد کی نہیں، بلکہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کی ہے، گویا یہ ہے وہ نمونہ اور اسوہ جس پر اسلامی سماج کی بنیاد استوار ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ ماخوذ ہے۔ سنۃ نبیؐ سے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

"کوئی بدعت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی سنت ترک نہیں کی جاتی۔

پس بدعتوں سے اجتناب کرو، اور شریعت کے راستہ کو اپنا لو،

سنتِ رسول ؐ کی پیروی کرو، کیونکہ امورِ قدیمہ جو پیغمبرِ اکرم ؐ کے عہد میں برقرار تھے، بہترین اور افضل ترین ہیں، اور بدعت ہائے نو بدترین چیزیں ہیں، کیونکہ ان بدعتوں کا تعلق سنتِ رسول ؐ سے ذرا بھی نہیں، بلکہ درحقیقت یہ غیر مذہبی چیزیں ہیں۔ جنہیں جہالت اور نادانی سے ایجاد کیا گیا ہے۔[۸۲]

احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں اسلامی سماج کی تصویر کا اگر نظارہ کیا جائے تو وہ روشن تر اور تاباں تر نظر آئے گی، آپ ؐ نے فرمایا:

"جس شخص سے اس کا ہمسایہ مامون نہیں، وہ صاحبِ ایمان نہیں"۔

گویا پڑوسی کو اذیت دینا ایمان کے حلقے سے باہر نکل آنا ہے۔

نیز فرمایا: "جس کی فتنہ انگیزی سے پڑوسی کو چین نہیں، وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا!"

یعنی پڑوسی کو ستانا، جہنم میں گھر بنانا ہے۔

بیوہ اور یتیم: ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے:

"بیوہ عورتوں اور مسکین لوگوں کے کام کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح ہے"۔ یعنی بیواؤں اور مسکینوں کی دستگیری کارِ جہاد ہے!

سہل بن سعد رضؓ سے مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں یتیم کی خبر گیری کرنے والا اور میں اس طرح ہوں گے۔ جیسے یہ دونوں انگلیاں"۔[۸۳]

جس سماج میں بیواؤں کو تکلیف دی جاتی، ان کا مذاق اڑایا جاتا، ان کو بابِ ستم بنایا جاتا، اور یتیموں کے مال میں تصرف کیا جاتا اور ان کے مال سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی ترقی یافتہ ہو، اسلامی سماج نہیں ہے، اسلامی سماج تو وہ ہے جس میں مسکینوں کے لیے

خود فاقہ کر لیا جائے، یتیموں کی خلوص اور دیانت سے دستگیری کی جائے اور بیواؤں کا سہارا بن جائے، ــــ کتنا زبردست فرق ہے۔ دوسری سماجوں میں اور اسلام کی سماج میں!

اسلامی سماج کی خصوصیت: جن چیزوں کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی، اسلامی سماج میں انہیں بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، بلکہ کہنا چاہیئے، ان پر سماج کا ایمان کا دارومدار ہے۔

اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے:

ولا تصعر خدک للناس — "یعنی لوگوں کی طرف سے منہ پھیر کر نہ
ولا تمش فی الارض مرحا — کو پسند نہیں کرتا، اپنی چال میں میانہ روی اختیار
ان اللہ لا یحب کل مختال — کرو اور اپنی آواز نرم رکھو بے شک سب سے
فخور واقصد فی مشیک — بدتر آواز گدھے کی ہے۔"
واغضض من صوتک ان
انکر الاصوات لصوت الحمیر

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو ذلیل کرے۔ اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں مصروف رہتا ہے، اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت دور کرتا ہے، اللہ اس کی مصیبت قیامت کے دن رفع کرے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کے عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب قیامت کے دن چھپائے گا۔"

اس حدیث میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے:

ایک دوسرے کی حاجت روائی۔

مصیبت کے وقت ایک دوسرے کی دستگیری۔
ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی۔
اور خوش خبری دی گئی ہے، جو کسی کی حاجت روائی کرتا ہے، قیامت کے دن اس کی حاجت روائی ہوگی۔ جو کسی کی دستگیری کرے گا، روزِ قیامت اس کے ساتھ بھی سلوک کیا جائے گا۔ جو دوسروں کے عیب چھپائے گا ستارِ عیوب حشر کے دن اس کے عیبوں پر پردہ ڈال دے گا۔

دنیا کا کوئی انعام اور کوئی ترغیب بھلا اس خوش خبری کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

جنگ باہمی سے بڑھ کر اسلام کی نظر میں شاید ہی کوئی چیز مبغوض ہو لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب یہ ناگزیر ہو جاتی ہے، ناگزیر تب ہوتی ہے جب حق پامال کیا جا رہا ہو، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جا رہا ہو، احکام خداوندی نظر انداز کیے جا رہے ہوں۔

حضرت علی رضؓ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

"اے مردمِ گوناگوں، اور دانے قلوب پراگندہ! جن کے جسم تو حاضر ہیں لیکن عقلیں غائب ہیں، میں تمہیں حق کے راستے پر لے چلنا چاہتا ہوں لیکن تم اس سے یوں بھاگتے ہو، جس طرح بکری شیر کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ کس قدر مشکل ہے یہ کام کہ تمہارے کمک سے مدن پنہاں کو آشکار کر دوں اور حق کو (کہ جسے تمہاروں نے کج کر دیا ہے) راست کر دوں۔

بارِ خدایا! تو آگاہ ہے کہ جو کچھ ہم سے صادر ہوا اس لیے نہ تھا کہ ہم سلطنت و خلافت کی طرف میل و رغبت رکھتے تھے، اس لیے تھا کہ جب فتنہ و فساد کا شیوع ہوا تو تیرے دین کے آثار میں جو تغیر ہو گیا تھا ہم نے چاہا کہ اسے واپس لائیں اور تیرے شہروں میں اصلاح و آسائش کو برقرار کر دیں تاکہ تیرے ستم کشیدہ بندے امن و آسودگی حاصل کر لیں اور

یہ ہے احکام ہو فتح کیے جا رہے تھے پھر جاری ہو جائیں!

دشمن اور معاند ملک کے وزیروں سفیروں اور نمائندوں، یا ممتاز اصحاب میں سے کوئی شخص کہ جب مخالف ملک سے سیاسی پناہ طلب کرتا ہے تو کتنے اہتمام و اعلان کے ساتھ یہ تقریب منائی جاتی ہے لیکن اسلامی سماج ایسی تبدیلیٔ قلب کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔

آپؐ کی عادتِ طیبہ تھی کہ جب وفد آپؐ کے دین قبول کر لیتے تو آپؐ اپنے پاس سے نہ روکتے اور نہ اپنی قوم کے پاس جانے سے منع کرتے، بلکہ اسے دوبارہ وہیں لوٹا دیتے جیسا کہ ابو رافعؓ فرماتے ہیں کہ قریش نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے دل میں اسلام کی محبت آگئی میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں لوٹ کر نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کروں گا اور نہ تمہیں روکوں گا، واپس جاؤ اگر وہاں جا کر بھی تمہارے قلب میں وہی ایمان رہا جو اب ہے تو لوٹ آنا۔

سوادِ اعظم: مسلمانوں کو سوادِ اعظم سے ترکِ تعلق ممنوع ہے، بلکہ اس کی ساتھ دینا ضروری ہے۔ اسلام کے جمہور کی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک کو اکثریت سے بغاوت اور سرکشی کی اجازت نہیں دیتا اور جماعت سے تعلق قائم رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

حضرت علیؓ نے ایک خطبے میں فرمایا:

"پس تم بھی اس جماعت کو اختیار کرو اور سوادِ اعظم سے وابستہ ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ جماعت (حق) کی تائید فرماتا ہے اور تفرقے سے بچو کیونکہ جماعت کو چھوڑنے والا شیطان کا شکار بن جاتا ہے جس طرح گلہ سے کٹنے والی بھیڑ بھیڑیے کا شکار بن جاتی ہے۔

خبردار! جو شخص تمہیں اس رویہ (جماعت سے علیحدگی) کی دعوت دے

اسے قتل کردو، خواہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو!"[۱۹]

غرض اسلامی سماج کو جس پہلو سے بھی جانچا اور پرکھا جائے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسی جماعت پیدا کرتی ہے کہ فرد اس سے کسی حال میں رشتہ منقطع نہیں کر سکتا اور ایسا ضابطہ اخلاق پیش کرتی ہے جو اگر پیش نظر لایا جائے تو دنیا کے سارے مفاسد کا آن کی آن میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ماخذ:

[۱] صحیح بخاری عن سعد بن وقاص۔ [۲] [illegible] سلطانیہ [illegible] ص [illegible]۔ [۳] زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۲۰۸، طبع مصر۔ [۴] صحیح بخاری، کتاب [illegible] عن عبداللہ بن مسعود۔ [۵] صحیح بخاری، کتاب الاجارہ عن عبداللہ بن عمرؓ۔ [۶] سورہ طٰہٰ، پارہ ۱۶، رکوع ۶، آیت ۱۱۹۔ [۷] سورہ بنی اسرائیل پارہ ۱۵، رکوع ۴، آیت ۳۷۔ [۸] صحیح بخاری، کتاب الحرث عن انسؓ بن مالک و ابن عباس۔ [۹] سورہ مائدہ، رکوع ۵، آیت ۳۳ پارہ ۶۔ [۱۰] سورۂ اعراف رکوع ۱۰، آیت ۱۷۵، پارہ ۸۔ [۱۱] صحیح بخاری عن قیسؓ، سہیلؓ، جابرؓ۔ [۱۲] سورۂ بنی اسرائیل، پارہ ۱۵، رکوع ۴، آیت ۳۶۔ [۱۳] سورۂ تحریم پارہ ۲۸، رکوع ۱، آیت ۳۔ [۱۴] سنن ابن ماجہ و سنن ترمذی۔ [۱۵] صحیح مسلم و صحیح بخاری دونوں کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔ [۱۶] سورۂ بقرہ پارہ ۱، رکوع ۳۸، آیت ۲۸۰۔ [۱۷] یہ حدیث صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں مذکور ہے۔ [۱۸] ایضاً۔ [۱۹] سنن ترمذی۔ [۲۰] العدل الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) بحوالہ ابوحنیفہ [illegible] النصائح فی الاسلام (استاذ عبدالحلیم بجندی) طبع مصر۔ [۲۱] صحیح بخاری، کتاب الادب و صحیح مسلم عن عائشہؓ۔ [۲۲] زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر ج ۲، ص ۳۵۵-۳۵۶۔ [۲۳] سورۂ فرقان، آیت ۳۰۔ [۲۴] سورۂ شوریٰ آیت ۳۷۔ [۲۵] سورۂ شوریٰ آیت ۳۸۔ [۲۶] العدل الاجتماعیۃ

فی الاسلام ۲۹ (ازستاذ سید قطب شہید) ۲۷ سورۂ آل عمران، آیت ۶۲-
۲۸ سورہ بینہ، پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۷ - ۲۹ سورۂ سجدہ، آیت ۵-۷
۳۰ سورۂ نساء آیت ۵۹، رکوع ۸، پارہ ۴ - ۳۱ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۰،
رکوع ۲، پارہ ۱۵ - ۳۲ زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۲، ص ۳۳۳-
۳۳ صحیح بخاری کتاب مغازی عن انس رضؓ بن مالک - ۳۴ زاد المعاد، ج ۲،
ص ۳۴، ۵۸، ۷۵، ۸۶ - ۳۵ صحیح بخاری، عن ابوذر غفاری رضؓ کتاب الصلوٰۃ؛
۳۶ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ، عن ام کلثوم رضؓ بنت عقبہ - ۳۷ سورۂ نساء آیت ۲۹-
۳۸ سورۂ بقرہ، آیت ۳۹ - ۳۹ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۳۵۲، ۳۵۳)
۴۰ سورۂ اعراف، آیت ۴۰ - ۴۱ زاد المعاد، ج ۲، ص ۴۳۰ -
۴۲ بخاری، مسلم، ترمذی، سنن ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل رحؒ، سنن نسائی سے مذکورہ
حدیثیں، استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام"
میں نقل کی ہیں۔ ۴۳ سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۲ - ۴۴ بخاری رحؒ و
مسلم رحؒ کی یہ حدیثیں استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی
الاسلام" میں نقل کی ہیں۔ ۴۵ سورۂ بقرہ آیت ۲۷۱ - ۴۶ صحیح بخاری
کتاب الاستقراض عن ابی ہریرہ رضؓ - ۴۷ مسند احمد بن حنبلؒ، ج ۱، ص ۶-
۴۸ سورۂ نساء، آیت ۴۸، رکوع ۶، پارہ ۵ - ۴۹ سورۂ مائدہ آیت ۳ رکوع
۵۰ سورۂ مائدہ آیت ۳ رکوع ۱، پارہ ۶ - ۵۱ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۴، رکوع
پارہ ۲۶ - ۵۲ سورۂ حجرات، آیت ۱۳، پارہ ۲۶، رکوع ۱
۵۳ سورۂ مائدہ، آیت ۷۵، رکوع ۸، پارہ ۶ - ۵۴ سورۂ بقرہ آیت ۹۲
پارہ ۱ - ۵۵ سورۂ مائدہ آیت ۴۴، رکوع ۶ - ۵۶ سورۂ تحریم آیت ۷
رکوع ۱، پارہ ۱۰ - ۵۷ سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۳، رکوع ۲۸ -
۵۸ سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۷، رکوع ۱۵ - ۵۹ سورۂ توبہ آیت ۱۰۸ -
۶۰ سورۂ نساء، آیت ۱۴۹، پارہ ۶ - ۶۱ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۱ -

۶۲ سورۂ نساء، آیت ۵۹، رکوع ۶۔ ۶۳ سورۂ انفال، آیت ۷۵، رکوع ۷، پارہ ۱۰۔
۶۴ سورۂ حج آیت ۳۹، رکوع ۵، پارہ ۱۷۔ ۶۵ سورۂ قصص آیت ۷۷،
رکوع ۸، پارہ ۲۰۔ ۶۶ سورۂ قصص، آیت ۷۸، رکوع ۸، پارہ ۲۰۔
۶۷ سورۂ روم، آیت ۴۶، رکوع ۵، پارہ ۲۱۔ ۶۸ سورۂ اعراف، آیت ۳،
رکوع ۳، ۶۹ سورۂ شوریٰ، آیت ۳۲، رکوع ۳، ۷۰ کنز العمال ج ۶
ص ۳۷۵، ۷۱ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۸۹۰، ۷۲ یہ حدیث
ترمذی کی ہے جسے استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی
الاسلام میں نقل کیا ہے۔ ۷۳ صحیح بخاری، کتاب الدیون والحجر عن
ابوذر غفاری رضؓ۔ ۷۴ سورۂ توبہ آیت ۷۶، رکوع ۱۰، پارہ ۱۰۔
۷۵ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۷، رکوع ۳، پارہ ۱۵۔ ۷۶ سورۂ توبہ آیت ۳۴
رکوع ۹، پارہ ۱۰۔ ۷۷ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام۔ (استاذ سید قطب
شہید) ۷۸ سورۂ حشر، آیت ۸، رکوع ۱، پارہ ۲۸۔ ۷۹ ترمذی،
مسلم اور سنن کی دوسری کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔ ۸۰ النظم
الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن و علی ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۷
۸۱ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضؓ۔ ۸۲ نہج البلاغۃ، طبع مصر،
ص ۱۰۰۶۔ ۸۳ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۱۷۵۔ ۸۴ سورۂ محمد
آیت ۱۹، رکوع ۳، پارہ ۲۱۔ ۸۵ صحیح بخاری، کتاب المظالم عن عبداللہ
بن عمر رضؓ۔ ۸۶ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۱۲۸، ۱۱۰۔
۸۷ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۲، ص ۱۶۳
۸۸ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۸۹۱

(۳)

خلافت

خلافتِ راشدہ، منہاج و اصول، انتخاب اور شوریٰ اور اس سے مستنبط آثار و نتائج

خلافتِ اسلامیہ ختم ہو چکی اور اب نظر بظاہر احیاءِ خلافت کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ دنیا کی سب سے بڑی تحریک کی تحریکِ خلافت ہندوستان میں برپا ہوئی۔ اس تحریک نے مسلم ہندوستان کے عوام و خواص کا مزاج بدل دیا، سیرت و کردار اور عادات و اطوار میں تبدیلی پیدا کر دی، مذہبیت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، سلطنتِ برطانیہ اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور حکومت تھی، اس حکومت سے خلافت کے پرستاروں نے ٹکر لی۔ اگر تحریکِ خلافت عالمِ وجود میں نہ آئی ہوتی تو ہندوستان آج تک غلام ہوتا۔ وہ خلافت کی تحریک ہی تھی جس نے مسلم ہندوستان میں اور ہندوؤں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ آزادی کی تڑپ پیدا کی، مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا۔ ایک عظیم مقصد کے لیے ایثار و قربانی کا ولولہ پیدا کیا۔ ایک مقدس منزل کی طرف طرح طرح کے خطرات و مہالک کے باوجود رہنما کی قیادت میں سب کچھ قربان کر دینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ لیکن یہ عظیم جدوجہد ناکام ہوئی اور اس کی ناکامی نے ایک غیر معین عرصے کے لیے منہاجِ خلافتِ راشدہ پر احیاءِ خلافت کی تجدیدِ تشکیل کی امیدیں ختم کر دیں۔ اب دنیا کا کوئی ملک خلافت کی تجدید و تشکیل سے دلچسپی نہیں لے رہا۔ حد یہ ہے کہ عرب تک اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ حجازِ مقدس کا علاقہ اس کی تحویل میں ہو اور

بلادِ اسلامیہ اس کی سیادت کا دم بھرتے ہوں، اس وقت دنیائے اسلام میں نہ کوئی فرد ایسا ہے، نہ کوئی ملک جس پر دنیائے اسلام اتفاق کر کے اس کی بالادستی تسلیم کر لے۔ اکثر مسلمان ملک "نیشنلزم" کے دام ہمرنگ زمیں میں گرفتار ہیں، قومیت ہی ان کا مقصد اور منتہا ہے، نفرتیں وسعت پیدا کر کے جہانِ اسلام کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا ہے یہ کہ اتحادِ عالمِ اسلام کی تحریک کسی وقت پروان چڑھ جائے اور اسلامی ممالک اقتصادی، سیاسی، فنی، تعلیمی اور مالی معاملات سے متعلق ہم آہنگی اور یک جہتی کی صورت پیدا کر سکیں۔ زیادہ کی توقع موجودہ زمانے میں نہیں کی جا سکتی۔

پھر بھی ہم خلافت پر مسئلہ خلافت پر، خلافت کی حیثیت، خلافت پر خلافت کے انعقاد و قیام پر، خلافت کے نظام پر اور خلافت کے مدلل و اصول پر گفتگو کرنے پر مجبور ہیں۔

مجبور اس لیے ہیں کہ جب تک خلافت کو اور مسئلہ خلافت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے، کوئی مسلمان ملک بھی جمہوریہ اسلامیہ کا قیام عمل میں نہیں لا سکتا۔

خلافت کی تجدید و احیاء ممکن ہے، دوسری بات ہے لیکن جب تک اسلامی ممالک موجودہ اور اسلامی حکومت و بادشاہی پر قائم ہیں اس وقت تک وہ اسلامی نظام سے صرف نظر کر سکتے ہیں، خلافت کے نظام و اصول کو نظر انداز کر سکتے ہیں، خلیفہ نہ ہو، نہ سہی۔ امیر، امام، سربراہِ مملکت یا صدرِ جمہوریہ تو بحال ہو گا ہو۔ کسی شخص کو امیر، امام، سربراہِ مملکت یا صدرِ جمہوریہ بنانا ہے یا بنانا چاہیے یہ کس اصولوں کو مدِ نظر رکھے گا؟ کیا کریملن کی شہنشاہیت؟ کیا امریکہ کی جمہوریت (ری پبلک)؟ کیا برطانیہ وغیرہ کی پارلیمانی جمہوریت؟ یا ان سب سے الگ کوئی اور نظام، جس میں اسلام کو، اور اس کے وضع و طریق کو دخل نہ ہو

اگر جواب اثبات میں ہے تو کچھ کہنا بے کار ہے، اگر اثبات میں نہیں ہے تو لازم ہے کہ خلافت کی نوعیت اور اس کی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، تاکہ اسی کو سامنے رکھ کر ایسا دستور اور نظام بنایا جا سکے، جس کی اسلامیت بہرحال غیر مشکوک اور غیر مشتبہ ہے۔

ایک جائزہ: انسان نے اپنی فہم و خرد کے مطابق مرض کا مداوا مختلف طریقوں سے سوچا، مثلاً:

۱۔ بادشاہت ۲۔ جمہوریت اور شورائیت ۳۔ آمریت۔
۴۔ اشتراکیت اور اشتمالیت ۵۔ طبقاتیت۔

ان میں سے ہر ایک کا دنیا نے تجربہ کر لیا، لیکن کوئی بھی اس کے دکھ کا مداوا ثابت نہ ہو سکا۔ اس نے بادشاہت کا تجربہ کیا اور اپنے بادشاہ کو ظل اللہ، اوتار، مظہرِ ذاتِ خداوندی، سب کچھ مان لیا لیکن اس کے باوجود بادشاہوں کے ہاتھوں نہ اس کی جان بچی، نہ مال، نہ آبرو!

اس نے اپنا خون اور پسینہ ایک کر کے ان بادشاہوں کو پالا پوسا، اور پروان چڑھایا۔ انہیں اختیار و اقتدار کا غیر مسئول مرکز بنا دیا، لیکن ان بادشاہوں نے اسے غربت، افلاس، تلوار اور کوڑے کے سوا کچھ نہ دیا۔

بادشاہت سے دکھ اور دل ہونے کے بعد دکھی انسان نے جمہوریت اور شورائیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی، لیکن وہ یہاں بھی نہ ملی۔ جمہوریت کے تجربہ کو ان انتخابات نے ناکام بنا دیا جو عوام کے نام پر، عوام کے لیے، یعنی انسانی فلاح و بہبود کے نعرے لگا کر جن لوگوں نے عوام سے ووٹ لیے اور عوام کی دی ہوئی کرسیوں پر متمکن ہوئے، انہی نے عوام کا گلا کاٹا۔ عوام کی دولت لوٹی، عوام کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیلا، اور بالآخر ان کی تباہی و بربادی کے موجب ہوئے۔ پارٹی سسٹم نے جماعت بندی پیدا کر دی، جماعت بندی نے مفادات کا مسئلہ پیدا کر دیا، انتخاب کے سلسلہ

میں ووٹ کی تجارت اور کاروبار شروع ہوا، غریب ہار گیا، امیر ووٹ خرید کر حاکم اور مالک و مختار بن گیا، بادشاہ منظر سے ہٹ گیا۔ لیکن اب بادشاہوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، جن کی سفاکی، درماندگی اور خون آشامی کسی طرح سابق بادشاہوں سے کم نہ تھی۔

عوامیت نے جمہوریت کی شکست و ریخت کی پیوند کاری سے اور طرز انتخاب کی تبدیلی سے پارٹی سسٹم ختم کر دینے سے درست کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی کوئی ٹھوس فائدہ عوام کو نہ پہنچا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دنیا جمہوریت (ڈیموکریسی) اور عوامیت "ری پبلک" دونوں سے بیزار ہوگئی اور امید کی نظروں کو طرف ڈالنے لگی۔

اب دنیا کے سامنے جو چیز نمودار ہوئی۔ وہ آمریت کی شکل میں ابھری۔ لوگوں نے سوچا، وزیر، وزیر اعظم، صدر مملکت، وغیرہ اتنے بادشاہوں کے بجائے اگر ایک غیر مسئول بادشاہ ہو تو زیادہ غیر جانبداری کے ساتھ وہ عوام کی پاسبانی اور ان کے دکھ اور درد کا مداوا کر سکے گا، بادشاہت موروثی ہوتی تھی، اس کی خرابی کی جڑ وراثت تھی، بادشاہ اچھا ہوتا تھا، اس کا بیٹا نالائق اور نااہل، چونکہ بادشاہ کا بیٹا ہوتا تھا اس لیے نااہلی اور نالائقی کے باوجود بادشاہ بنا دیا جاتا تھا، اگر ایسا ہو کہ بادشاہت حین حیات تک کے لیے ہو تو بادشاہت کے مفاسد ختم ہو جائیں گے اور حسنات حاصل ہو جائیں گے اس کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ آمریت کو فروغ دیا جائے۔ دنیا نے یہ تجربہ بھی کر لیا، لیکن بہت جلد تجربہ بھی ناکام ہوگیا۔ آمر یا ڈکٹیٹر کی حرص و ہوس اقتدار و اختیار کی بھوک، ظلم اور سفاکی، درندگی اور بہیمیت اور انسانی نے سفاک اور خون آشام بادشاہوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ زار روس کے مظالم اسٹالین کے مقابلے میں قیصر جرمنی کے مظالم، ہٹلر کے مقابلے میں وکٹر ایمانوئیل کے مظالم مسولینی کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟ کیا ان میں اور ان

میں وہی مناسبت نہیں ہے جو قطرۂ ناچیز کو بحرِ بے پایاں کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے؟

اس دور میں آمریت ہی کی ایک شاخ اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام سے ابھر چکی تھی۔ شروع میں تو عوام نے فریب کھایا اور اس کے دامِ ہمرنگ زمین کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے سوچا بادشاہت تو ہمارے درد کا مداوا نہ بن سکی، جمہوریت اور عوامیت کی مٹی بھی طبقاتیت، جماعت بندی اور طریقِ انتخاب نے پلید کر دی۔ آمریت نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بادشاہت سے زیادہ سنگین، ناقابلِ علاج اور مہلک ترین ہے۔ یہ اشتراکیت اور اشتمالیت یقیناً ہمارے درد کا درماں ثابت ہوگی، اس لیے کہ اس میں نہ کوئی جاگیردار ہوگا، نہ سرمایہ دار جو اپنے کاشتکاروں اور مزدوروں کے دوش خرید لیا کرتا تھا۔ پیسے روپے سے ہر ظلم کو عین انصاف ثابت کر دیا کرتا تھا۔ اب وہ اور ہم ایک صف میں آ جائیں گے، وہ طبقہ ہی ختم ہو جائے گا جو ظلم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ناانصافی کی شکایت ہی نہیں ہوگی۔ اس نظام کے تحت کوئی ناخوش ہو سکتا ہے لیکن جب اس نظام کا تجربہ کیا گیا اور عمل کی کسوٹی پر کسا گیا تو معلوم ہوا، یہ نظام آمریت اور قیصریت سے بھی زیادہ عوام کے لیے مصیبت ہے۔ قیصریت کے دور میں وہ فریاد تو کر سکتے تھے، آمریت کے دور میں وہ خوشامد تو کر سکتے تھے لیکن اشتراکیت نے تو ان کی فریاد، خوشامد، آزادی، آزادیٔ فکر، آزادیٔ اجتماع و تقریر، یہ سب کچھ ہی چھین لیا۔ یہ تجربہ بھی ناکام ہوا ——— اب ہم کہاں جائیں، کیا کریں؟ کس سے امید رکھیں اور کس سے مداوا حاصل کریں؟ ——— خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

علاج اور مداوا : واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے ان مفاسد کا صحیح اور مکمل اور تیر بہدف علاج صرف اسلام ہے، اسلام نے جو اصول حاکمہ اور حکوم کے رائج کر دیے ہیں، صرف وہی دکھی انسانیت کو تمام امراض سے نجات دلا سکتے ہیں، صرف انہی پر عمل کر کے انسانیت ایک نئی زندگی سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔"

مسئلہ خلافت اور اس کا مقابل دوسرے نظاموں سے : پیش نظر خلافت پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ابن خلدون نے خلافت کے بحث پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے :

"خلافت افراد کو ان کے دینی و دنیوی مصالح کے راستہ پر شرعی نظر نظر کے مطابق چلانے کا نام ہے کہ دراصل دنیاوی مصالح بھی مصالح آخرت ہی کی طرف راجع ہیں اس لیے کہ شریعت کی نگاہ میں تمام دنیوی امور مصالح آخرت ہی کے ماتحت ہوتے ہیں، پس فی الحقیقت خلافت حراست دین میں اور دین ہی کی طرح سیاست دنیا میں صاحب شریعت کی نیابت ہے۔"

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصر) نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے :

"یہ وہ زمانہ تھا کہ مشرق میں خلافت اور مغرب میں مقدس رومی شہنشاہیت قائم تھی، دونوں نظام دین کی قوت اور طاقت بنے ہوئے تھے دونوں عالمگیر مذہب تھے۔ تمام دنیا کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنا چاہتے تھے، دونوں میں ایک فرق یہ تھا کہ مقدس رومی شہنشاہیت قوی جذبہ پرستی کی بنا پر بلکہ پہلی بت پرست شہنشاہیت ہی کی ایک مسلسل تصویر تھی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ قسطنطین کے القاب بھی وہی تھے جو بت پرست ایام کے تھے دوسرے لوگ بھی رومی کہتے تھے، ایک دنیاوی فرماں روا تھا، شہنشاہ

کہا جاتا تھا، دوسرا مذہبی حاکم تھا، یہ پوپ کہلاتا تھا لیکن خلافت کسی پچھلے سیاسی نظام کی بنیاد پر قائم نہ تھی۔ یہ ایک جدید نظام تھا، جس کی تخلیق ان ظروف و احوال کی بنا پر ہوئی تھی جو ظہورِ اسلام اور بلادِ فارس و بیزنطی سلطنت روما کے ایک بڑے حصے پر عربوں کی سیادت قائم ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ خلیفہ سیاسی حاکم تھا۔ مفہوم اس کا یہ تھا کہ اس حاکم واحد کی ذات میں دینی و دنیوی دونوں قسم کی طاقتیں جمع ہو گئی ہیں۔ اس کا مذہبی فریضہ سرزمینِ دین کی حفاظت تھا۔ حامیٔ دین ہونے کی حیثیت سے کفار کے ساتھ وہ اعلانِ جنگ کر سکتا تھا۔ دین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سزائیں دے سکتا تھا۔ نماز میں لوگوں کی امامت کرتا تھا اور جمعہ کا خطبہ دیتا تھا۔ بخلاف پوپ کے کہ اس کی حیثیت ایک قسیس اعظم کی تھی، ایسا قسیس اعظم جو گنہگاروں کے قصور معاف کرتا تھا اور جسے مذہبی معاملات میں ایک مقتدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔[۳]

شوریٰ اور جمہوریت اولی الامر: خلافت میں اقتدار و اختیار کا منبع اور سرچشمہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب تو انصار نے فرمایا کہ اگر ہم میں سے کوئی امیر ہو اور تم میں سے کوئی امیر ہو تو ایک اعرابی نے کہا: "خدا کی قسم اگر تم نے ایسا کیا تو ہم اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے"۔

قرآن و حدیث و آثارِ صحابہ اس نظریہ کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ان آیات و احادیث اور آثار و امثلہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں نظام نیابی واجب ہے، کیونکہ حاکم اعلیٰ کا امت سے مشورہ لینا اور امت کا اس کو اپنی نصیحتوں سے سرفراز کرنا ممکن ہی نہیں ہے، جب تک کہ قوم میں سے ایک خاص جماعت مرتب نہ ہو جس کا کام صرف باہمی مشورہ اور نصیحت ہو، جمہوریت کے لیے ان دونوں کا قیام لازمی اور ابدی ہے اور جب حاکم اور محکوم پر یہ مشورہ اور نصیحت واجب اور فرض ہے تو یہ بھی فرض ہوا کہ ایک خاص جماعت امت میں سے قائم ہو جو یہی کام کرے، کیونکہ یہ اصول متفق علیہ ہے۔

"ما لا یتم الواجب الا بہ فھو واجب!"

ان حقائق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسلام میں حکومت کا اہم ترین ستون "شوریٰ" اور "مسئولیت اولی الامر" ہے۔

یہی وہ دو ستون ہیں جن پر ہر حکومت عادلہ کو اپنا نظام قائم رکھنا پڑتا ہے کیونکہ ہر عادل حکومت کا مرجع اور منبع یہی ہوتا ہے کہ آخری اختیارات امت کے ہاتھ میں ہوں۔ تمام اختیارات کا واحد سرچشمہ یہی ہوا۔

اب ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ ان دو امور پر گفتگو کریں گے جن کو ہم نے حکومت کا اہم ترین ستون قرار دیا ہے یعنی

۱۔ شوریٰ امر ۲۔ مسئولیت اولی الامر

۳۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہونا چاہیے اس سلسلے میں لازمی طور پر خلفائے راشدین کے طرز انتخاب کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ اس کو سامنے رکھ کر ہی کوئی صحیح رائے نظام انتخاب کے بارے میں قائم کی جا سکتی ہے اور یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں انتخاب یعنی رائے عامہ کو دخل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر

نامزدگی اور ولی عہدی دونوں درست ہیں اور اگر نہیں تو دونوں ہی غلط ہیں۔

شوریٰ کا جہاں تک تعلق ہے اس کے بارے میں قرآن کریم نے اس امر کو بالکل صاف اور واضح کر دیا ہے اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

قرآن کریم میں وارد ہوا ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم "یعنی مسلمانوں کے معاملات (حکومت) باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں"[۵]

اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

وشاورھم فی الامر "یعنی اے نبی معاملات حکومت میں مشورہ کر لیا کرو"[۶]

پہلی آیت سے مراد یہ ہے کہ عامۂ مسلمین اپنے معاملات کو پایۂ تکمیل تک اسی وقت پہنچاتے ہیں، جب باہمی طور پر مشورہ کر لیں۔

دوسری آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ صحابہ سے امور و معاملات جنگ وغیرہ پر مشورہ فرمایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اسی آیۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھ کر جب ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا، ایک مجلس مشاورت انتخاب خلیفہ کے لیے بنا دی تھی۔

مذکورہ دونوں آیتوں کے بارے میں مزید تفسیر و تشریح:

"امرھم شوریٰ بینھم" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان پیش آمدہ معاملات و احوال پر باہمی مشورت کر کے اقدام و عمل کا فیصلہ کرتے ہیں، جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور کسی ایسی رائے پر عمل نہیں کرتے جس کی تائید کثرت آرا سے نہ ہو رہی ہو۔[۸]

"امرھم شوریٰ بینھم" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جلد بازی

سے کام نہیں لیتے، بلکہ پیش آمدہ معاملات و مسائل سے متعلق مشاورت کے بعد کوئی فیصلہ کیا کرتے ہیں!"[۹]

مقدمۂ ابن خلدون کی قدر و قیمت، اہمیت اور افادیت سے انکار کرنا ہرگز مقصود نہیں، اس کا ایک پایہ ہے اور اس کا اعتراف ناگزیر ہے، لیکن افسوس ہے کہ بعض دوسری کتابیں جو اپنے مواد، مغز اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے اگر ابن خلدون سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں قرار دی جا سکتیں، تغافل کا شکار ہیں۔ مثلاً الفخری اور طرطوشی کی سراج الملوک یہ دونوں کتابیں بھی فلسفۂ اقتدار و اختیار اور نظام مملکت پر عقل و خرد اور دلائل و امثال اور معقول و منقول کی روشنی میں دل آویز پیرایۂ بیان کے ساتھ بحث کرتی ہیں، لیکن شاید اختصار کے باعث سکۂ رائج الوقت نہ بن سکیں۔

امام یا خلیفہ کے لیے طرطوشی نے لکھا ہے کہ اسے تین خصلتوں پر عامل ہونا چاہیے:

۱- نرم خوئی، ۲- سنت نبوی سے اعتصام، ۳- مشاورت۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے:

فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورہم فی الامر[۱۰]

پھر مشاورت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایک سربراہ مملکت کا سب سے قبیح فعل یہ ہے کہ وہ استبداد و بالائے سے کام لے اور مشاورۃ ترک کر دے![۱۱]

اس جگہ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن کریم کی مذکورہ دونوں آیتوں میں لفظ "امر" جو آیا ہے اس سے مراد حکومت و خلافت ہی ہے۔

ایک یہ بات بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ دوسری آیت میں رسولؐ کو مشورے کا "حکم" دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ رسولؐ کو جو اپنے امتیوں سے مشورہ کرنے کا مشورہ نہیں دیا گیا، ہدایت نہیں کی گئی، بلکہ حکم دیا گیا، آخر اس کی کیا وجہ تھی؟

قرآن کریم میں آیا ہے کہ رسولؐ جو فیصلہ بھی کر دیں، خواہ وہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند، خوشی کے ساتھ قبول کر لو۔ قرآن کریم ہی میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں، وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ آپؐ کا نطق وحی ہوتا ہے۔ تو جس کا نطق وحی ہو، اور جس کا فیصلہ دل سے قبول کرنا واجب، اور جس کی اطاعت امت پر واجب، اسے مشورہ کی حکم کیوں دیا گیا؟

قرآن کریم کے پیرایۂ بیان سے جو لوگ آشنا ہیں، وہ اس حقیقت کے بخوبی شناسا ہیں کہ متعدد مواقع پر مخاطب عوام ہیں لیکن امر تخاطب پر زیادہ زور دینے کے لیے مخاطب آپؐ بنائے جاتے ہیں تاکہ بات کی اہمیت اور قطعیت زیادہ واضح ہو جائے۔ جس بات کا رسولؐ کو حکم دیا گیا ہے اس سے کوئی امتی کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اگر اپنے امتیوں سے مشورہ کرنا رسولؐ خدا کے لیے ضروری ہے تو افرادِ امت کے لیے تو لازم ہے کہ باہمی مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کیا کریں اور قدم اٹھایا کریں۔

اس جگہ چند نکتے میرے ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ پہلی آیت میں شوریٰ کا ذکر "بینھم" یعنی باہمی طور پر فرمایا گیا ہے، اور دوسری آیت میں "ھم" کا لفظ آیا ہے یعنی اپنے صحابہؓ سے مشورہ کرو۔

ان دونوں الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلس شورت کو محدود نہیں کیا گیا ہے، بلکہ وسیع تر بنا دیا گیا ہے، اس لیے کہ جمع کا استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اگر اسے محدود کرنا مقصود ہوتا تو فرمایا جا سکتا ہے تھا۔ اپنے امر کا فیصلہ چند لوگوں سے کر لیا کرو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مشورت صرف چند جنداء اور مرجبا اور نعم کہنے والوں تک بھی محدود نہیں ہے، بلکہ جمع کا لفظ بتاتا ہے کہ اس میں ہر مکتب فکر کو شامل ہونا چاہیے۔ اگر اسے محدود رکھنا مقصود ہوتا تو فرمایا جا سکتا تھا کہ مشورہ، اپنے ہمدردوں اور ہوا خواہوں سے کر لیا کرو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مشورہ سب سے کرنا پڑے گا، کیونکہ بات اسی طرح نکھر سکتی اور واضح ہو سکتی ہے، صرف چند آدمیوں سے، یا ہمدردوں اور ہوا خواہوں سے مشورہ کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے بات کھل کر اور نکھر کر سامنے نہیں آتی وہ تو اسی وقت نکھر سکتی اور واضح ہو سکتی ہے، جب سب طرح کے لوگوں کی باتیں سن لی جائیں۔

۳۔ تیسرا نکتہ جو ان آیات کریمہ سے واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مشورہ کی تاکید صرف خانہ پری کے لیے یا برائے بیت نہیں ہے، بلکہ مشورہ اگر نص کے خلاف نہ ہو تو اسے ماننا بھی پڑے گا۔ اور اگر یہ صورت نہ ہوتی تو فرمایا جا سکتا تھا، مشورہ کر لیا کرو، لیکن اگر اسے اپنی رائے کے خلاف پاؤ تو مسترد کر دو، اس طرح کی کوئی اجازت نہیں دی گئی ہے اور نہ صرف خلفاء راشدین بلکہ آنحضرتؐ تک نے مشورہ لیا ہے اور مانا بھی ہے۔ آپؐ نے تو اپنی رائے اور مرضی تک کے خلاف بھی امت کی رہبری کے لیے اور اس کے سامنے مثال پیش کرنے کے لیے مشورہ کو قبول فرمایا ہے جیسا کہ جنگ احد کے موقع پر ہوا تھا کہ آپؐ اندرون شہر دشمن کا حملہ روکنا چاہتے تھے اور لوگوں کی کثرت رائے یہ تھی کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ اندر تشریف لے گئے اور اسلحہ زیب تن کر کے تشریف لے آئے۔ جیسا کہ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے:

"جنگ بدر میں جب اشراف قریش قتل ہو گئے تو ان کے رئیس ابوسفیان بن حرب نے تین ہزار کی تعداد میں فوج مرتب کر کے مدینہ کی طرف کوچ کیا۔

یہ واقعہ ہجرت کے تیسرے سال شوال کا ہے، ابوسفیان عینین کے مقام پر احد پہاڑ کے قریب اترا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ آیا مقابلہ مدینہ سے باہر نکل کر کریں، یا مدینہ میں ٹھہریں؟ آپؐ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نہ جائیں اور یہیں قلعہ بند ہوں، اگر وہ شہر میں داخل ہو جائیں تو مسلمان ان سے گلیوں میں مقابلہ کریں اور عورتیں چھتوں پر سے، عبداللہ بن ابی نے اس رائے کی تائید کی، کبار صحابہؓ کی ایک جماعت جو بدر میں شریک نہ ہو سکی تھی، انھوں نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، اور اس پر اصرار کیا، عبداللہ بن ابی نے مدینہ ہی میں ٹھہرنے کا اشارہ کیا، آپؐ کی رائے بھی مدینہ کے متعلق تھی، اس لیے بعض صحابہؓ نے آپؐ کی تائید کی۔ جشم بحث کے بعد اٹھ کر گھر تشریف لے گئے اور سامان جنگ زیب تن فرما کر باہر تشریف لائے۔

خلیفہ کا انتخاب: اب اس کے بعد سوال آتا ہے انتخاب کا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "انتخاب" تو ظاہر ہے ہو ہی نہیں سکتا۔ نبوت تو امر ربی پر منحصر ہے جسے اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے، اس منصب پر سرفراز کر دے، ویسے محمدؐ بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تو یہ حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا مشرکین مکہ کے دل میں یہ بات ڈال دیتا کہ ایک نیا نبی بھیجنا ہے اور تمھیں اجازت دی جاتی ہے کہ جسے چاہو منتخب کرلو، ہم جبرائیل امین کے ذریعے اس سے رابطہ پیدا کر دیں گے، تو کوئی شبہ نہیں، مکہ کے مشرکین جن کے سامنے آپؐ کی حیات کے شب و روز تھے جنھوں نے قبل از نبوت آپؐ کو "الامین" اور "الصادق" کا خطاب دے رکھا تھا، آپؐ کے سوا کسی کو منتخب نہ کرتے۔

البتہ آپؐ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد ضرور انتخاب کا سوال پیدا ہوا!

اس موقع پر ایک نکتہ پھر یاد رکھنے اور غور کرنے کے قابل ہے!
"امت پر وفاتِ نبیؐ سے بڑھ کر بڑا کوئی وقت نہ آسکتا تھا!"
اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس درجہ پریشان خاطر ہوئے کہ تلوار کھینچ لی، کہ جو کہے گا، آپؐ نے وفات پائی، اس کی گردن اڑا دیں گے۔ اور آپؐ کی وفات کے فوراً بعد ہی ارتداد کا ایک طوفانِ عظیم اٹھا جو اگر کامیاب ہو جاتا تو اسلام کا خاتمہ تھا، یہی نہیں، بلکہ جھوٹے نبیوں نے سر اٹھایا، چنانچہ مسیلمۂ کذاب باقاعدہ آمادۂ جنگ ہوا، اور لشکر لے کر میدان میں آگیا، ذہنی طور پر مسلمان کسی کی وفات سے بھی اس درجہ اندوہگین اور ملول نہیں ہو سکتے تھے، جتنے آپؐ کی وفات سے ہوئے تھے، یہ صدمہ آپؐ ہی کا طفیل تھا کہ ایک اُجڈ قوم چند سال میں دنیا کی سب سے زیادہ باخدا، متقی اور حق پر مٹنے والی قوم بن گئی!
یہی لوگ تھے جو شراب پانی کی طرح پیتے تھے۔ بات بات پر کارد سے جنگ ہو جاتے تھے، جوا کھیلتے تھے، فسق و فجور میں مبتلا تھے، عورتوں کو ذرا بے مقدار خیال کرتے تھے، لڑکی پیدا ہوتی تو اسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے، سود لیتے تھے، صلۂ رحم سے ناواقف تھے، زنا کا ارتکاب کرتے تھے، ہتھیلی ماؤں سے شادی تک رچا لیتے تھے۔
لیکن محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل، ایک معجزہ اور ایک حکومت قوم بن گئے، اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کا معیار بن گئے، حصولِ مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا ان میں جذبہ پیدا ہو گیا، جو ڈاکو اور چور تھے، عابد شب زندہ دار بن گئے، جو زانی اور جوا باز تھے وہ صائم النہار نظر آنے لگے، جو سود خوار اور زر پرست تھے وہ اللہ کی راہ میں سب کچھ لٹانے لگے، کردار، سیرت اور اخلاق کی یہ ساری نعمتیں جس شخص سے اور جس کے طفیل ملی تھیں، وہ دفعتاً رفیقِ اعلیٰ سے

جا ملا، وحی کا سلسلہ قیامت تک کے لیے منقطع ہوگیا، اب رہبری کون کرے گا؟ ہدایت کس کے ذمے ہوگی؟ اس بکھرے ہوئے قافلہ کا سالار کون ہوگا؟

اس موقع پر دماغ معطل تھا، عقل گم اور حواس جواب دے رہے تھے اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا تھا عین تقاضائے حالات و احوال تھا اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا تھا اپنے وقوع سے پہلے عالم الغیب والشہادۃ یعنی خدائے بزرگ و برتر سے پوشیدہ نہ تھا، اور آپؐ کی فراست و بصیرت کبھی اس کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

اس سے بہتر موقع نامزدگی اور ولی عہدی کا قیامت تک نہیں پیش آسکتا تھا۔

اگر وفات کے وقت آپؐ کسی شخص کو خلیفہ نامزد کر دیتے یا کسی کو وفات سے پہلے ولی عہد بنا لیتے تو کس میں یا رائے اختلاف ہو سکتا تھا!

لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا! اور سب کچھ جانتے ہوئے نہیں کیا!

آپؐ نے اسے گوارا کر لیا کہ امت کو اگر بہت بڑا خطرہ پیش آتا ہے تو آنے دیجئے۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد، اب امت کو خود ہی اپنے مسائل کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے، خود ہی باہمی مشورت سے اپنے "امر" کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

اگر آپؐ ایسا نہ کرتے، اور کسی کو وقتِ وفات نامزد کر جاتے یا زندگی میں ولی عہد بنا لیتے تو ایک مثال قائم ہو جاتی، اور اس سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے، لائق فائدہ اٹھاتے یا نہ اٹھاتے، آپؐ مثال قائم کر کے اس کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے، ورنہ آپؐ کے سامنے اصحاب بدر تھے۔ اصحاب عشرہ مبشرہ تھے، ایسے اصحاب تھے جنھوں نے ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد، اور پھر فتح مکہ کے بعد، اسلام کے گراں بہا

خدمات انجام دیے تھے، اس گنجینۂ جواہر سے کسی لعلِ شب چراغ کا اُٹھ لینا آپؐ کے لیے کتنا آسان تھا، مگر آپؐ نے یہ آسان کام نہیں کیا، اور یہ ذمّے داری اُمّت ہی پر ڈالی کہ اپنی آزادانہ رائے سے جسے چاہے اپنا سربراہ منتخب کرلے۔

چنانچہ آپؐ کی وفات کے فوراً بعد سربراہِ انتخاب کا سوال پیدا ہوگیا چونکہ آپؐ کی غرض یہ تھی کہ انتخاب آزادانہ رائے سے ہو، اس لیے نہ انصار کو اپنے امیدوار کی حیثیت سے سعدؓ بن عبادہ کو پیش کرنے میں تامل ہوا، نہ مہاجرین کی طرف سے عمرؓ بن الخطاب کو ابوبکر صدیقؓ کا نام نامی پیش کرنے میں کوئی جھجک ہوئی، دونوں طرف سے نرم گرم ہر طرح کی تقریریں ہوئیں۔ سخت اور تند الفاظ کا تبادلہ ہوا[۱۴]، ایک مرحلے پر یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں تلواریں میان سے باہر نہ نکل آئیں۔

لیکن کیا ایسا ہوا؟

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ نطق و کلام کی تیزی اور تندی کے بعد تھوڑی ہی دیر میں حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب متفقہ طور پر عمل میں آگیا جو انصارؓ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے میں پیش پیش تھے۔ وہی اب مطمئن اور متفق ہوکر صدیق اکبرؓ کی بیعت پر پروانہ وار ٹوٹ رہے تھے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، صدیق اکبرؓ کا پایہ بھی ایسا ہی تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب جس طرح ہوا، وہ بالکل معمولی تھا اور خالص اسلامی اور جمہوری، نہ کسی پر جبر کیا گیا، نہ جور کیا گیا، سب نے مل بیٹھ کر گفتگو کی، بحث کی، پھر ایک فیصلے پر پہنچے، اور سب نے اسے مان لیا، حتیٰ کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب روا اور درست تھا، جو حضرت علیؓ کو دوسرے تمام صحابہ سے افضل مانتے ہیں اور یہ بات ان کا عقیدہ بن چکی ہے، چنانچہ امام زیدؒ کا مسلک

یہی ہے۔

"زیدیہ کا مذہب یہ ہے کہ امامت کا تعلق اصحاب فکر و خرد کی صواب دید پر منحصر ہے"[۱۴]

امت کا اختیار اور پسند:۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ معتزلہ کے مذہب میں امامت اُمّت کے اختیار و پسند سے قائم ہوتی ہے اللہ عزوجل نے اس مقصد کے لیے کسی خاص شخص کی تعیین نہیں فرمائی ہے، اس کا اختیار امت کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا ہے۔ کہ اپنے جس فرد کو چاہے تنفیذ احکام کے لیے منتخب کر لے خواہ وہ قرشی ہو یا غیر قرشی۔ صرف اسلام، صدالعقد اور ایمان کی شرط ضروری ہے۔ نسب وغیرہ کی شرط وہ ملحوظ نہیں رکھتے، ان کے نزدیک ہر زمانہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا ایک امام منتخب کریں، جو لوگ قریش اور قریش کے علاوہ دیگر طبقات میں امامت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان میں تمام معتزلہ اور زیدیوں کا ایک گروہ مثلاً حسن بن صالح بن حی وغیرہ شامل ہیں[۱۵]

جو لوگ یہ رائے رکھتے تھے کہ خلافت انتخاب سے منعقد ہونی چاہیے ان میں خوارج، بعض صحابہ اور جمہور مسلمین کا بہت بڑا طبقہ شامل تھا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہنگامی اور فوری صورت حال کا تقاضا تھا (تفصیل آگے آئے گی) اور اسے بہر حال پورا کرنا پڑا، پھر بھی عوام کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انصار اور مہاجرین نے بہت اچھی طرح اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ اس کے بعد مسند خلافت پر حضرت ابوبکرؓ متمکن ہوئے۔

لیکن حضرت عمرؓ کا انتخاب ظاہر ہے رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو بے چارگی اور بے سہارا پن مسلمان محسوس کرنے لگے

تھے اب وہ صورت نہیں تھی، نہ ایسے ہنگامی حالات تھے کہ ایک ہی مجلس میں بحث و گفتگو کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا، اور کسی کو مسندِ خلافت پہ بٹھا دیا جاتا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے خوب غور و فکر کے بعد ایک شخص کا نام لیا اور کافی بحث و مباحثے کے بعد اسے منظور کر لیا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ کس طرح بنے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے میں کسی قسم کی مطلق العنانی سے کام نہیں لیا تھا اور نہ جمہور کو حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا، بلکہ آپؓ نے اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا اور سب نے اس انتخاب کو بہتر کہا تھا[۱۸]

طرطوشی نے بات اور زیادہ صاف کر دی ہے:-

وقتِ مرگ حضرت ابوبکرؓ نے حسبِ روایت حسن بصریؒ فرمایا:

یا معشر المسلمین! یہ میری آخری گھڑیاں ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو ضروری ہے کہ ایک ایسا شخص ہو جو تمھارے امور کی دیکھ بھال کرے تمھیں نماز پڑھائے۔ تمھارے دشمنوں سے مقابلہ کرے، پس اگر چاہو تو سب کو جمع کر لو، تمھارے لیے کوئی امیر منتخب کر دوں، اگر چاہو، تو اپنی صوابدید پر کسی کو نامزد کر دوں؟

لوگ رونے لگے: انھوں نے کہا۔

آپ ہم سب سے بہتر آدمی ہیں، اور سب سے زیادہ دانا و بینا ہیں جسے چاہیئے نامزد کر دیجیے!

انھوں نے فرمایا: "تو میں عمرؓ کو نامزد کرتا ہوں[۱۹]!"

انصار جب سقیفہ بنو ساعدہ میں سعدؓ بن عبادہ کی بیعت کے لیے جمع ہوئے تھے تو ان کا خیال تھا۔ "امر" خلافت انہی کا حق ہے[۲۰]، تو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے مطمئن کرنے اور ان کی تائید حاصل

کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ کے انتخاب کے موقع پر ہوا۔ یہ نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں سب لوگوں نے دست بیعت حضرت عمرؓ کی طرف بڑھا دیئے ہوں بلکہ بعض لوگ اُن کے مزاج اور سختی کے باعث بیعت پر متامل تھے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انھیں رضامند کرلیا۔ تب عمرؓ کا انتخاب پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خلافت ایک معاہدہ ہے: سوچنے کی بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسا شخص جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور مزاج شناس رسولؐ تھا۔ اس نے اس انتخاب میں اپنا کوئی مفاد ملحوظ نہیں رکھا اور اسے بیان بھی کردیا۔

حضرت ابوبکرؓ شدت مرض کی حالت میں مجمع کے سامنے باہر تشریف لائے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"کیا تم اس شخص کو پسند کرو گے جسے میں تم کا خلیفہ مقرر کردوں؟ میں نے غور و مشورہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اپنے کسی قرابت دار کو نہیں تجویز کیا ہے، بلکہ عمرؓ کو اپنا جانشین بناتا ہوں۔ تم ان کی بات مانو!"

سب نے "سمعنا و اطعنا" کہا[۲۱] اور بے چون و چرا ابن کثیر کے الفاظ میں "معاہدہ" تسلیم کرلیا۔

اس بیماری کے دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کے نام کا معاہدہ لکھوایا۔ یہ معاہدہ عثمانؓ بن عفان نے لکھا۔ لوگوں کو سنایا گیا۔ لوگوں نے اسے تسلیم کیا اور اس کی اطاعت کی جاتی۔

نظام معاہدہ بہت زیادہ مقبول ہے۔ اور ہر سب معاہدے کے دو مساوی فریق ہوتے ہیں اور ان کی مکمل منظوری ہی سے معاہدہ نافذ ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اس حدیث نبویؐ سے ناواقف نہ تھے۔

"خدا کا عذاب اس حاکم پر ہے جو جہالت پر حکومت کرے۔"[۲۲]

نہ اس ارشاد رسولؐ کو نظر انداز کرسکتے تھے؛

"امام کی طرف میری شفاعت سے محروم رہے گا"[۲۲]

پھر وہ استبداد یا مرضی سے کام لے کر اللہ کی مرضی کے خلاف کسی کو اس امت پر مسلط کر سکتے تھے، جبکہ اپنے لیے بھی انھوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔

اب تک ہم سامنے انتخاب کی دو صورتیں آچکی ہیں:

۱۔ ہنگامی حالات میں انتخاب — جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کا ہوا۔ لیکن اس میں بھی تمام ذی اثر اور رائے عامہ اور رضامندی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔

۲۔ عام حالات میں خلیفہ کا انتخاب — جیسا حضرت عمرؓ کا ہوا۔

اس انتخاب سے دو باتوں میں روشنی پڑتی ہے:

ایک تو یہ کہ خلیفہ، یا امام، یا امیر، یا سربراہ مملکت، اگر کسی شخص کو منصب حکومت کی سربراہی کے لیے مناسب اور موزوں سمجھتا ہو تو بغیر کسی جھجک کے اس کا نام پیش کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنی تجویز کی رائے عامہ سے منظور کرائے بغیر اسے نافذ نہیں کر سکتا۔ رائے عامہ کو حق ہے کہ اگر چاہے تو اس کی تجویز منظور کر لے، چاہے تو مسترد کر دے۔

حضرت عمرؓ کا طرزِ کار: اب تیسرا انتخاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ یعنی حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جان بچنے کی امید نہیں، اس لیے وہ اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہتے ہیں۔

یہ صورت بھی ہنگامی صورت ہے، اور ہے تقریباً ناگہانی۔ یہ بھی ہنگامی صورت ہے۔

جس طرح ہنگامی حالات میں حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہوا تھا، اسی طرح اصحاب شوریٰ کو بلا کر کسی سے بغیر فوری بیعت کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا اور صورت حال اتنی ممکن تھی کہ کوئی انکار نہ کر سکتا۔

لیکن جناب عمر خلیفہ نے ایسا نہیں کیا! اس لیے کہ وہ خلیفہ

علیہ وسلم کی وفات پر جو ہنگامی حالات پیدا ہوئے تھے، ان کی نوعیت کچھ اور تھی، اور ایک خلیفہ راشد رضؓ کا زخموں سے نڈھال ہو کر سفرِ آخرت اختیار کرنا لاکھ ہنگامی ہو لیکن رائے عامہ کو چند اخفیائی پیشین بندیوں کے ساتھ پورا پورا حقِ انتخاب دینا لازمی تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک نئی صورت تجویز کی۔ انھوں نے تمام لوگوں پر ایک نظر دوڑائی، گو ان کی ذاتی رائے حضرت علیؓ کے حق میں تھی[۲۴]۔ لیکن انھوں نے ابوبکرؓ کی طرح اپنی ذاتی رائے بھی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کی، صرف یہ کیا کہ جو لوگ اس منصب کے لیے موزوں تر ہو سکتے تھے ان کی ایک پینل بنا دیا اور اس پینل کو حق دے دیا کہ جسے چاہے منتخب کر لے۔ اس صورت میں اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ بعد میں کوئی اپنی محرومی کا شکوہ سنج ہو کر نظامِ حکومت کو متزلزل کر دینے کی کوشش کرے گا۔

یہ پینل بن گیا۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک بزرگ ہستی کو منتخب بھی کر لیا لیکن امت پر اس کی پابندی نہیں تھی کہ پینل کے ممبران ہی میں سے کسی کو منتخب کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو عبدالرحمن بن عوف جیسا بے لوث اور جلیل القدر صحابی گھر گھر پوچھتا: پھر تم کسے خلیفہ بنانا چاہتے ہو؟[۲۵]

یہاں ان کی انتخاب کی فروتنی تو تھی ہی غور کے سامنے کچھ اور باتیں بھی آئیں۔ وفات سے پہلے عمرؓ پر غشی طاری ہوئی۔ کسی نے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ہوش میں آتے ہی کہا:

"میرا سر زمین پر رکھ دو۔ شاید خدا مجھ پر رحم کرے۔" پھر اپنے رخسار زمین سے رگڑنے لگے، اور فرمایا:

"ہائے عمرؓ۔ ویلتے اس کی ماں پر اگر عمرؓ کی مغفرت نہ ہوئی۔ جب میرا دم نکل جائے تو مجھے دفن کرنے میں جلدی کرنا۔ اگر انجام بخیر ہے تو جس قدر جلدی ہو سکے پہنچ جاؤں اچھا ہے۔ اگر بد ہے تو یہ بوجھ تمھارے گردن سے جتنی جلد

جلد اُتر جائے بہتر ہے۔ پھر گریاں کناں کہا کچھ خبر نہیں میری منزل جنت ہے، یا جہنم۔[۲۶]

جس شخص کی ذمے داری کے احساس کا یہ عالم ہو، نہ وہ استبداد بالرائے سے کام لے سکتا تھا، نہ اپنے کسی آدمی کو زینتِ مسندِ خلافت بنانے کی کوشش کر سکتا تھا۔

چنانچہ وقتِ مرگ جب حضرت عمرؓ اس باب میں فکرمند نظر آئے تو:

"ایک شخص نے کہا، میں نام بتاتا ہوں، آپ عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ بنا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، اللہ تم کو سمجھے، تو نے اللہ کی خوشنودی نہیں، تو خود غرض ہے۔ میں ایسے شخص کو خلیفہ کیسے تراش بناؤں جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا بھی سلیقہ نہیں آیا۔ تمہارے معاملات سے ہمارے کوئی غرض وابستہ نہیں۔ میں نے اس امت میں کوئی چیز بہتر نہیں پائی کہ اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے سفارش کروں۔ اگر یہ کوئی اچھی چیز تھی تو ہم اس سے بہرہ مند ہو چکے۔ اور اگر یہ کوئی بری چیز تھی تو اس برائی کو آلِ عمرؓ کی ذات پر ختم ہو جانا چاہیے۔ خاندانِ عمرؓ کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کے ایک فرد سے حساب کیا جائے اور ان کا ایک ہی فرد امتِ محمدیہ کے متعلق جوابدہ ہو۔ میں نے اپنے کو اور متعلقین کو بہت سی آزمائشوں سے محروم رکھا۔ پھر بھی اگر خلافت کو ذریعہ سے بلند مرتبہ پایا تو سب چھوٹ جائیں گے کہ بڑا خوش قسمت ہوں دیکھو! اگر میں نے کی خلافت کے لیے سفارش کرنی تو یہ بھی بے جا ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے جو مجھ سے بہتر تھے ایسا کیا ہے لیکن اگر نہ کروں تو یہ بھی نامناسب نہیں۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مجھ سے اور ابوبکرؓ سے بہتر تھے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے دین کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ یہ جواب پا کر لوگ مطمئن ہو گئے۔"

کیا اسلام کی جمہوری روح اور علم و رائے اور اسلام کی بالادستی در غریب

خلافت میں رائے عامہ کی فیصلہ کن حیثیت کو اس سے زیادہ جامع مانع الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے؟

پینل کی آخری کارروائی:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے لوگوں سے عثمانؓ و علیؓ کے بارے میں استصواب کیا۔ انھوں نے عوام کی رائے بھی دریافت کی، اور اکابر و اعیان کی بھی۔ انھوں نے جہاں تک ممکن ہوا عام رجحان معلوم کرنے کی کوشش کی اور انفرادی طور پر بھی۔ انھوں نے باہم دگر بھی سوالات کیے اور منفرداً بھی۔ انھوں نے خفیہ طور پر بھی لوگوں کی رائے معلوم کی اور برسرِ عام بھی۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے صرف اہلِ مدینہ سے گفتگو پر بس نہیں کیا، بلکہ اہلِ بادیہ و اطراف سے بھی استفسار کیا، اور گنوار عربوں کا دل بھی ٹٹولا۔ مسلسل تین شب و روز بس یہی ایک کام تھا، جسے وہ سرانجام دیتے رہے۔[۱۹]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی اور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ گیا۔

چنانچہ جب عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ میں ذاتی طور پر تین دن میں متعدد بار خوض کر چکا ہوں اور دوسروں سے بھی مشورہ کر لیا ہے، تو اب آپ اپنے اوپر فیصلہ کو اس وقت تک ملتوی کر دیں جب تک کہ ہم خلافت اور قرآن و حدیث پر عمل کریں گے، اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

حضرت علیؓ نے جواب دیا: ہاں! میں اپنے علم سے کام لیتے ہوئے اور بقدرِ استطاعت۔

پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور ان کے سامنے بھی وہی الفاظ دہرائے جو حضرت علیؓ سے کہے تھے۔

آپ نے غیر مشروط وعدہ کر لیا۔ اس لیے خلافت حضرت عثمانؓ کو دے دی گئی۔[۲۰]

ابن کثیرؒ کی روایت بھی اسی طرح کی ہے:

عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بعد نماز کہا۔ میں نے لوگوں سے رائے لی اور مشورہ کیا، وہ تم دونوں (عثمانؓ و علیؓ) کے سوا کسی اور کے حق میں نہیں ہیں۔

پھر عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں نے خفیہ طور پر تمہاری دلی رائے کے بارے میں تم سے استفسار کیا اور تمہیں ان دونوں ـــــ عثمانؓ و علیؓ ـــــ میں سے کسی ایک سے بھی منحرف نہیں پایا۔ تم نے بار بار عثمانؓ و علیؓ کو سزاوار خلافت بیان کیا۔"[۳۰]

انتخاب کثرت رائے سے: حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بجا ارشاد فرمایا کہ خفیہ یا اعلانیہ نجی طور پر یا بر سر عام جماعتی طور پر یا منفرداً جس سے کسی سے بھی رائے لی، تو محسوس کیا کہ لوگ بس وہی آدمیوں کو چاہتے ہیں، یا عثمانؓ کو یا علیؓ کو اور اگرچہ کتب تاریخ میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن واقعات کے بین السطور سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے استصواب رائے کے وقت کثرت آرا حضرت علیؓ کے حق میں پائی ہوگی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ سب سے پہلے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان سے کتاب و سنت اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر بیعت لینے پر آمادہ ہوتے۔ ایسے موقع پر حضرت عثمانؓ کو موخر رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ استصواب میں انہوں نے کثرت رائے حضرت علیؓ کے حق میں پائی تھی۔

لیکن حضرت علیؓ کا کردار بھی اس موقع پر کھل کر سامنے آگیا ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے صدا بلند ہوتی رہی ہے کہ حضرت علیؓ حصول خلافت کے لیے بے قرار تھے۔ اگر واقعی یہی بات تھی تو اب کہ عبدالرحمٰن بن عوف بیعت کے لیے ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، وہ سیرت شیخین کی شرط کو قبول کر کے انکار نہ کر دیتے۔ اس شرط کا ماننا انہوں نے اپنی انفرادیت، اپنے حق اجتہاد اور امیر خلیفہ کی حیثیت سے اپنے استحقاق صواب دید کی نفی سمجھا۔ لہٰذا

انھوں نے طے کر لیا کہ خلافت جاتی ہے تو جانے لیکن وہ ایسا وعدہ نہیں کریں گے جسے اصولی طور پر وہ بجا اور درست نہیں سمجھتے۔

حضرت علیؓ کے انکار کے بعد حضرت عثمانؓ کی طرف عبدالرحمٰنؓ بن عوف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے دونوں چیزیں کر لیں۔ یعنی کتاب و سنت اور سیرت شیخین پر عمل۔ اور حضرت علیؓ نے بے تامل ان کی بیعت کر لی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا حکم: ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔ بلاشبہ حضرت علیؓ کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ حالات اور زمانے کی تبدیلی کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے مفاد اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر اگر ضرورت سمجھیں تو سیرت شیخین سے اختلاف کریں اور اپنی صوابدید پر معاملات کو نمٹائیں۔ حضرت عثمانؓ نے سیرت شیخین والی شرط منظور کر لی تھی۔ یعنی انھوں نے عہد کیا تھا کہ اپنے دورِ خلافت میں کتاب و سنت اور سیرت شیخین پر عمل درآمد کریں گے۔ یقیناً حضرت علیؓ نے جو جواب دیا تھا وہ بھی روا اور درست تھا اور حضرت عثمانؓ نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بھی غلط نہ تھا لیکن کیا حضرت عثمانؓ نے بیت المال وغیرہ کے سلسلے میں وہ روش اختیار نہیں کی جو سیرت عمرؓ سے یکسر مختلف تھی؟

حضرت عثمانؓ کی شہادت تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کے اسباب و وجوہ پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم تو صرف خلافت راشدہ کے دو انتخاب اور اصولِ مشاورت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ضمناً بلکہ کہنا یہ ہے۔ مذکورہ دونوں اصولوں کو واضح کرنے کے لیے ان کی سیرت و شخصیت کے چند پہلو بھی نظر کے سامنے لے آئے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ کی شہادت کا معرکۃ الیمر رونما ہوا۔

عہد خلافت راشدہ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز، ہنگامہ انگیز اور پُرفتن دور!

عہدِ خلافتِ راشدہ کا سب سے زیادہ ہنگامی عہد: حضرت عثمانؓ کو نہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح یہ موقع ملا کہ اپنی پسند کے آدمی پر لوگوں کو متفق کر لیں نہ حضرت عمرؓ کی طرح یہ مہلت ملی کہ ایک مجلسِ اکابر قائم کر جائیں، جو کچھ ہوا آناً فاناً ہو گیا لیکن حالات خواہ کتنے ہی الم انگیز ہوں مسندِ خلافت تو خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ کارِ بارِ مملکت کو سرانجام دینے کے لیے سربراہِ مملکت کا انتخاب ناگزیر اور لازمی تھا۔

اور جو واقعات گزر رہے ہیں وہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف کے استصوابِ عام سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اکثریت حضرت علیؓ کے ساتھ ہے۔

جن لوگوں نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر رکھا تھا انھیں بھی حضرت علیؓ کی خلافت سے اختلاف نہ تھا اور دیارِ رسولؐ کے رہنے والوں کی غالب اکثریت تو حضرت علیؓ کے ساتھ تھی ہی!

حضرت علیؓ کس طرح منتخب ہوئے: اب سوال یہ ہے کہ اس موقع پر کیا ہوا؟ — کیا حضرت علیؓ سامنے آ گئے اور انھوں نے فرمایا یہ مسند میری ہے اور میں اس مسند پر متمکن ہو جاتا ہوں۔ یہ امر خلافت میرا حق ہے۔ اور میں اس پر قابض ہوتا ہوں۔

ایسا نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ نے اس معاملے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یا اشارۃً کسی قسم کی سعی جنبانی نہیں کی۔ وہ خاموش اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ جیسے واپس ہو گئے حضرت عثمانؓ کے آخری ایام میں بیٹھ رہے تھے۔

لیکن لوگوں کی نگاہیں ان کے سوا کسی اور پر جا بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ آخر لوگ آپ کے پاس آنے لگے اور اصرار کرنے لگے کہ مسندِ خلافت پر متمکن ہو جائیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

"مجھے اس کی تمنا نہیں کہ تمہارا سربراہ بن جاؤں، اور بھی لوگ موجود ہیں کسی کو منتخب کر لو، میرا دامن نہ کھینچو۔ میرے نزدیک تو یہ نسبت امیر کے وزیر بننا زیادہ بہتر ہے"[۳۲]

لیکن لوگوں کا خاص طور پر انصار کا اصرار قائم رہا۔ آخر مسجد نبوی میں بیعت شروع ہوئی۔ بیعت کرنے والوں میں پہلے حضرت طلحہؓ نے پھر حضرت زبیرؓ نے بیعت کی[۳۳]

یوں سمجھنا چاہیے۔ خلفائے راشدین میں صرف حضرت علیؓ ہی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کی بیعت عوام کی بیعت تھی، یعنی نہ ان کے پیش رو نے ان کا نام پیش کیا تھا، نہ کوئی مجلس انتخاب قائم کی تھی۔ انتخاب کی تمام تر ذمے داری عامۂ مسلمین اور اصحاب حل و عقد کے ہاتھ میں تھی اور انھوں نے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہ علیؓ کو ہونا چاہیے۔ اور یہ انتخاب اکثریت جمہوری تھا۔

"حضرت علیؓ کا انتخاب اقدار جمہوری حاصل تھا، اہل مدینہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، یہ صحیح ہے کہ تمام مسلمانوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ لیکن غالب اکثریت اس میں شریک تھی۔

حضرت علیؓ کا انتخاب گو خلافت راشدہ میں جو اُمت کے لیے مشعل راہ تھا، بیعت کی تیسری قسم تھی

پہلی یہ کہ خلیفہ نے اپنی پسند کا آدمی مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر اس کی خلافت پر متفق کر کے بیعت لے لی۔

دوسری یہ کہ خلیفہ نے کسی مستحق منصب پر مشتمل ایک مجلس انتخاب قائم کی، اور اس نے بیعت کی۔ تیسری یہ کہ نہ خلیفہ کی طرف سے کسی کا نام پیش ہوا نہ اس نے کوئی مجلس انتخاب قائم کی، بلکہ خود بخود وہی صورت پیش آ گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آئی تھی، یعنی نہ نامزدگی، نہ تقرر، نہ سفارش، امت کو اختیار تھا، جسے چاہے منتخب کر لے۔ اس نے اپنے اس اختیار سے

فائدہ اٹھایا۔ اور چوتھے خلیفہ راشد کو منتخب کر لیا۔

حضرت علیؓ کا طرزِ کار: آخر چوتھے خلیفہ راشد کا دور بھی ختم ہوا۔ ایک خارجی نے عین حالتِ نماز میں آپؓ پر قاتلانہ وار کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اور زندگی کی ساری امیدیں منقطع ہو گئیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق، برادرِ خویش رسولؐ ہونے کے باعث سمجھتے تھے، تو ان کے لیے کیا مشکل تھا کہ اپنے صاحبزادوں میں سے کسی کو نامزد کر جاتے، یا کم از کم وصیت کر جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہ آپؓ نے کسی کو نامزد کیا، نہ کسی کے لیے وصیت کی۔ لوگوں نے پوچھا:

"اگر آپؓ وفات پا جائیں تو کیا ہم حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟"

آپ نے جواب دیا: "نہ حسن کی بیعت کا تمھیں حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم خود دانا و بینا ہو، جسے چاہو منتخب کر لو!"

یہ روایت دوسری متداول اور مستند تاریخوں — طبری وغیرہ — میں بھی مذکور ہے لیکن خاص طور پر ابن خلدون کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ ابنِ خلدون کو امویوں کا بہت زیادہ طرف دار اور حامی مانا جاتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ مورخ اندلس کی اموی حکومت کے دور کی پیداوار تھا۔ اس کی نشوونما، تعلیم و تربیت اور تہذیب و تکمیل اسی ماحول میں ہوئی، ظاہر ہے، ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہی ہے۔ پھر بھی اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس باب میں حضرت علیؓ کا اصول وہی تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ یعنی جس طرح آپؐ نے یہ امر امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا، حضرت علیؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادوں کو ایک وصیت ضرور کی تھی۔ حضرت علیؓ نے وقتِ وفات حسنؓ و حسینؓ کو بلایا اور فرمایا:

"میں تمھیں خدا سے ڈرنے (تقویٰ) کی، آخرت سے رغبت کی اور دنیا سے

نفرت کی وصیت کرتا ہوں۔ — میں تمہیں دوست اور دشمن کے ساتھ یکساں عدل کرنے کی وصیت کرتا ہوں (یاد رکھو) جنت کے مقابلے میں ہر نعمت حقیر ہے اور دوزخ کے مقابلے میں ہر بلا راحت ہے، یاد رکھو جس کی نظر اپنے عیب پر ہے وہ دوسروں کے عیب نہیں دیکھتا، جو اپنی غلطیاں فراموش کر دیتا ہے اسے دوسروں کی غلطیاں بہت بڑی دکھائی دیتی ہیں، جس نے اپنی رائے پر گھمنڈ کیا گمراہ ہوا، جس نے اپنی عقل کو کافی سمجھا ٹھوکر کھائی جس نے نخوت کو شعار بنایا، ذلیل ہوا۔

استاذ سید قطب کا فکر آفرین تبصرہ: خلفائے راشدین کے انتخاب اور طرزِ انتخاب پر استاذ سید قطب شہید نے بڑے فکر آفرین گفتگو کی ہے وہ حضرت ابوبکرؓ کے طرزِ انتخاب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مہاجرین نے خلافت کے انعقاد کے متعلق فیصلے سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ منصبِ خلافت قصی اور قریش کے لیے خاص ہو گیا تھا اگر صورتِ احوال یہ ہوتی تو حضرت عمرؓ نے جب انتخابِ خلیفہ کے لیے مجلسِ شوریٰ قائم کی تھی تو یہ نہ فرماتے کہ اگر ابو حذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو میں اسے خلافت سونپ جاتا، کیونکہ جانتے تھے کہ سالم قریشی نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرشیت ایسی چیز ہے جو روحِ اسلام سے متعارض ہے۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ قریش کو عامہ مسلمین پر فوقیت صرف اس لیے دی جاتی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم نسب ہیں حالانکہ خود جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ:

"جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے کر دیا ہے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا" اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کی خلافت پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:

"حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرائی، لیکن اس سے یہ

نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو اپنی رائے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو از روئے شریعت اس امر کا حق حاصل تھا کہ سفارش رد کر دیتے اور کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کر لیتے۔ عمرؓ اس لیے خلیفہ نہیں بن گئے کہ ابوبکرؓ نے انہیں نامزد کر دیا تھا۔ خلیفہ تو اس وقت ہوئے جب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور عوام نے ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنے کے لیے قائم کی جسے اپنے ہی اندر سے کسی آدمی کو چننا تھا لیکن مسلمان اشرعاً ہرگز اس امر پر مجبور نہیں تھے کہ لامحالہ انہی چھ حضرات میں سے کسی ایک کو منتخب کریں ویسے امر واقعی یہ ہے کہ یہ حضرات جن پر مجلس شوریٰ مشتمل تھی، امت کے بہترین فرد تھے، اور عمرؓ کی نگاہِ انتخاب نے یقیناً صحیح ترین لوگوں کو چنا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہی میں سے ایک کو عام مسلمانوں نے اپنا خلیفہ بنا لیا۔

حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہے:

"حضرت علیؓ کی بیعت اس طرح ہوئی کہ ایک جماعت اس پر رضامند تھی، کچھ حضرات نے مخالفت کی (لیکن اکثریت علیؓ ہی کے ساتھ تھی)۔

حضرت علیؓ کو خلافت کے معاملے میں پیچھے رکھنا خاص طور پر عمرؓ کے بعد انھیں خلیفہ منتخب نہ کرنا، ان کے ساتھ زیادتی تھی اور ہمارا رائے تو یہ ہے کہ تاریخِ اسلام کی یہ بہت بڑی المیہ تھا کہ عمرؓ کے بعد علیؓ کو خلیفہ نہیں بنایا گیا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کی مؤخر رکھا جانا اسلام کے تصورِ حکومت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے مؤخر کیے جانے میں جو مصلحت (قدرت کی طرف سے) کارفرما تھی یہ تھی کہ وراثت کا استحقاق اس منصب کے قریب بھی نہ پھٹک سکے کیونکہ موروثی حکومت اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے بالکل متصادم ہے۔ حضرت علیؓ کی

ذاتِ گرامی کی اگرچہ حق تلفی ہی ہوگئی ہو لیکن وراثت کے تصور سے اس منصب کو پاک رکھنے کا مظاہرہ اس حق تلفی سے کہیں زیادہ اہم تھا۔[۳۶]

حکام کا تقرر عوام کی مرضی سے: یہ حضرات خلفائے راشدین وہ تھے، جنھوں نے حکام و عمال اور گورنروں کا تقرر بھی صرف "حسب الحکم" نہیں کیا، بلکہ راستِ عامہ کو ملحوظ رکھا۔

"حضرت عمرؓ کے عہد میں صوبوں اور ضلعوں کے حکام کا تقرر وہاں کے لوگوں کی مرضی سے کیا جاتا تھا۔ کوفہ، بصرہ اور شام کے صوبوں میں انھوں نے جن لوگوں کو عامل خراج مقرر کیا، وہ وہی تھے جن کی سفارش ان مقامات کے عوام نے امیر المؤمنین سے ان کی دیانت و امانت کی بنا پر کی تھی۔ چنانچہ وہی حضرات مقرر ہوئے!"[۳۷]

عوام کی گردن پر وہی لوگ مسلط ہوتے ہیں، اور ان کے لیے من مانے حکام بھی وہی مقرر کرتے ہیں جو حکومت کو خدائی امانت نہ خیال کرتے ہوں، بلکہ ذاتی املاک و جاگیر سمجھتے ہوں، خویش پروری، اقربا نوازی، مفاد پرستی، انھی دلوں میں گھر کر سکتی ہے جو خدا سے غافل ہوں اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ذاتی جلب منفعت اور استحصال کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لیکن جو لوگ اسے بارِ گراں سمجھتے ہوں وہ نہ مسلط ہو سکتے تھے نہ مسلط کر سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا جو جلوہ نظر کے سامنے ہے، وہ تو یہ ہے:

سبق آموز مثالیں: "حسن بصریؒ کہتے ہیں۔ جب ابوبکرؓ کا وقت وفات بالکل قریب آگیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا: فدا یہ مال کو۔ میں نے کتنا مال خرچ کیا ہے؟ معلوم ہوا، ڈھائی سال کی مدت میں ۸ ہزار درہم خرچ کیا ہے؟ معلوم ہوا، ڈھائی سال کی مدت میں ۸ ہزار درہم خرچ کیے، فرمایا، یہ رقم میری طرف سے واپس کر دی جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ عہدِ عمر میں ایک مرتبہ اناج گراں ہو گیا تو آپ رضؓ نے جَو کی روٹی کھانا شروع کر دی!

ابو عثمان النہدی کی روایت ہے کہ میں نے عمر رضؓ بن خطاب کو بیت اللہ کا طواف کرتے اس حالت میں دیکھا کہ ان کے جُبّے میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ عمر رضؓ بن خطاب جب کسی شخص کو عامل (گورنر) بناتے تھے تو اسے ہدایت کر دیتے تھے، کہ وہ چھنر پر نہ بیٹھے، اعلیٰ درجے کے کپڑے نہ پہنے۔ نہ اعلیٰ درجے کا کھانا کھائے۔ نہ حاجب و دربان رکھے۔ نہ حاجت مندوں پر دروازہ بند کرے۔[۲۸]

حضرت علی رضؓ کی زندگی عہدِ کشور کشائی سے پہلے جتنی سادہ اور زاہدانہ تھی اس کے بعد بھی ویسی ہی رہی۔ نہ انھوں نے کاروبار میں حصّہ لیا، نہ تجارت کی طرف توجہ کی۔ بیت المال سے جو معمولی سا وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قانع تھے۔ کچھ تھوڑی سی زمین تھی، وفات پائی تو جو ترکہ نکلا، وہ سات سو درہم سے زیادہ نہ تھا جسے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے جمع کیا تھا کہ ایک خادم کا بندوبست کر لیں۔

اپنے عہدِ خلافت میں حضرت علی رضؓ موٹا جھوٹا لباس استعمال کرتے تھے اس میں بہت سے پیوند لگے ہوتے تھے، ہاتھ میں تازیانہ لیے بازار کا گشت کرتے۔ اور حضرت عمر رضؓ کی طرح عوام کی ہدایت اور رہبری حضرت عمر رضؓ نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ اگر یہ شخص خلیفہ بنا لیا گیا تو لوگوں کو راہِ راست سے ادھر ادھر نہیں ہونے دے گا۔[۲۹]

بھلا یہ لوگ جن کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی جنھیں زر اندوزی کا چسکا نہیں تھا، جو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، جو خدا سے ڈرتے اور ڈراتے رہتے تھے، کسی طرح بھی گوارا کر سکتے تھے کہ امت کی مرضی کے خلاف اس پر مسلط ہو جائیں اور امت کی مرضی کے خلاف جابر اور مفاد پرست حاکموں کو

ان پر مسلط کر دیں۔ کلّا ثم کلّا!

حضرت علیؓ کے بارے میں طٰہٰ حسین نے اپنی دوسری کتاب میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے:

"خدا کی رحمتیں ہوں عمرؓ پر، ان کی فراست کا جواب نہ تھا، انھوں نے بالکل درست رائے قائم کی تھی کہ اگر خلافت علیؓ کو دے دی جاتی تو وہ لوگوں کو آسانی سے منحرف نہ ہونے دیتے۔

عمرؓ نے محسوس کیا کہ علیؓ ان سے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔ حق کے لیے سخت اور حق کے معاملے میں سرنگوں، حق کے منکروں کے لیے پیام اجل!

آگے چل کر اسی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور موقع پر کہا ہے:

"علیؓ کو اگر کوئی چیز خریدنی ہوتی تو بازار میں ایسے شخص سے خریدتے جو انھیں پہچانتا نہ ہو۔ یہ بات انھیں سخت ناپسند تھی کہ خلیفہ ہو کر خریدار ہو اور دکان میں ان کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔"

جو لوگ مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد، اتنے محتاط اور پاک نہاد ہوں، اور جلب منفعت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں، ظاہر ہے مسلمانوں کے بیت المال کے سلسلے میں وہ کتنے زیادہ محتاط نہ ہوں گے؟ اور اس کی پائی پائی کس دقت سوچ بچار کے بعد خرچ کرتے ہوں گے؟

مواز نہ بھی اور نمونہ بھی: سفیان ثوریؒ کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی جب حج کے لیے مکہ آیا تو میرے گھر بھی مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ میں نے پوچھا: "اس سفر میں تم نے کتنا صرف کیا؟"

مہدی نے جواب دیا: "معلوم نہیں!"

میں نے کہا: "کل جب خدا بھی سوال کرے گا، تو کیا جواب دو گے؟"

عمرؓ نے جب حج کیا تو اپنے خادم سے پوچھا۔ "اس سفر میں کتنی رقم خرچ ہوئی ہے؟"

وہ کہنے لگا! "یا امیرالمومنین! ۱۸ (اٹھارہ) دینار!"
یہ سُن کر عمرؓ نے کہا: "تو سارا بیت المال خالی کیے دے رہا ہے؟"
حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بیت المال سے میرے لیے جو کچھ جائز ہے وہ
کہ ایک جوڑا جاڑوں کا، ایک گرمی کا، اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نان و
نفقہ، جتنا ایک متوسط الحال قریشی کا ہوتا ہے!

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "اپنے کھانے پینے سے جو مال زیادہ تم
نے جمع کیا ہے، وہ دوسرے کا ہے اور تم اس کے خزانچی ہو"!

یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جو دور شروع ہوا، اسے دیکھ کر
غیر مسلم مؤرخ آرنلڈ تک کہہ اٹھا:

"حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں قوت واقتدار آنے کے معنی یہ تھے کہ
سے وہ نظامِ شوریٰ ختم ہو رہا ہے جو خلفائے راشدینؓ کے انتخاب میں اساس
و بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، اور خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس
منصب پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہو، سیاست ہو
اور وہ اپنے دشمنوں کو دھوکا دینے کی تدبیریں جانتا ہو؛ اور حضرت امیر معاویہؓ
نے اپنے لڑکے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا، تو یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آئندہ
خلافت میں بھی وراثت چلے گی۔ بنی عباسؓ نے بھی اپنے عہد میں اسی
نظام کو اختیار کیا، اور اس طرح مسلمان اپنے "حق طبعی" یعنی "شوریٰ"
سے محروم ہو گئے۔ جس سے عرب مانوس تھے، جیسے لے کر آئے تھے۔
اور جس کی تائید احادیث نبویؐ نے کی تھی"[۴۲]

معاویہ بن یزید کی تقریر: اور یزید کے بعد تو اس کا بیٹا بھی چند ماہ
"یزید کی موت کے وقت بنی امیہ کی فوج مکہ کے محاصرہ میں مصروف تھی
یزید کا لڑکا معاویہ ثانی اس کا جانشین ہوا۔ اس کی خلافت چالیس دن سے
زیادہ نہ رہی۔ وہ خود خلافت سے دستبردار ہو گیا، اور ان الفاظ کے ساتھ

مسئلہ کو جمہور کے شوریٰ پر چھوڑ دیا کہ تم اپنے معاملہ کے سب سے زیادہ مالک مختار ہو۔ جسے چاہو، خلیفہ بنالو، پھر منبر پر آیا، اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"لوگو! جن لوگوں کا یہ معاملہ تھا، میرے دادا معاویہؓ ان سے جھگڑ بیٹھے، اور جو شخص اس امر کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف قرابت کی وجہ سے ان سے زیادہ حقدار تھا، اس سے لڑ گئے، یہ شخص حضرت علیؓ بن ابی طالب تھے، اور معاویہ نے تمہارے ساتھ بھی زیادتیاں کیں، جن سے تم واقف ہو یہاں تک کہ ان کی موت آئی اور اپنے بوجھ سے لدے ہوئے اور اپنی غلطیوں میں محبوس اپنی قبر میں چلے گئے، ان کے بعد میرے والد نے اس حق کو پہنچا، وہ اس امر کے اہل نہ تھے، انھوں نے ہوا و ہوس کو راہ دی، امارت نے بھی ان سے وفا نہ کی اور موت نے ان کا راستہ کوتاہ کر دیا۔ وہ بھی اپنے گناہوں میں لت پت اور اپنے جرم میں محبوس اپنی قبر میں چلے گئے۔" یہاں تک پہنچ کر معاویہ ثانی رونے لگا، اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پھر سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"تمہارے معاملہ کے بڑے حقدار تم خود ہو، اور ان کی قوت کی رسوائی ہے۔ انھوں نے آل رسولؐ کو تہ تیغ کیا، حرم پر قتل و غارت کی، اور کعبہ کو تباہ و برباد کیا۔ تمہارے بھلے یا برے کام کے انتظام کا میں ذمہ دار نہیں بن سکتا۔ تم اپنے معاملہ کے مالک و مختار ہو، اگر دنیا بھلی ہے تو خدا کی قسم ہم نے حصہ اس سے پا لیا، اور اگر برائی ہے تو اولاد ابی سفیان کو جو کچھ اس سے پہنچ چکا، وہی کافی ہے۔ انس ابن مالک نماز میں لوگوں کی امامت کریں، اپنی خلافت کے بارے میں تم لوگ باہمی مشورہ کر لو، اللہ تم پر رحم کرے۔" اس کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا، اور پھر باہر نہ نکلا۔ اسی سال میں اسی سال میں کچھ دن بعد انتقال ہو گیا۔

ایک بالغ نظر مؤرخ کہتا ہے:

"دوسرے لفظوں میں امویوں نے اس نظامِ خلافت کو بدل دیا جس کی بنیادیں شوریٰ اور دین پر قائم تھیں، اور اس کے بجائے سلطنت کے اس نظام کو پیش کیا، جس کی اساس وراثت پر مبنی ہوتی ہے اور جو اپنے سامنے سیاست کو پہلے اور دین کو دوسرے درجہ پر رکھتا ہے۔

خلافتِ اموی، مذہب کے مقابلہ میں سیاست سے زیادہ قریب تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ سلطنت کی شکل میں تبدیل ہوگئی، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے فرمانروائی کے وہ تمام مظاہر اختیار کیے جو ملوکِ قیاصرہ کا دستور تھے۔

مرتے وقت عبدالملک نے ایک دفعہ ایک خنزیر کو دیکھا کہ اپنے پاؤں سے کپڑے چیر رہا اور دھو رہا ہے، کہنے لگا:

"کاش میں بھی خنزیر ہوتا کہ روز کے روز کماتا اور مکھی کی زندگی بسر کرتا!"

یہ بات ابوحازم تک پہنچی، انھوں نے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ ہم کو وقت ہماری سی زندگی بسر کرنے کی آرزو نہیں رکھتے!"

کہا ہے کہ ایسے حضرات بھی تھے۔

"عمر بن عبدالعزیز: ۹۹ھ — ۱۰۱ھ، ۷۱۷ء — ۷۲۰ء خلافت کے والی ہوئے۔ ان میں دوسرے خلفاء بنو امیہ میں خوبیوں کے لحاظ سے بڑا فرق تھا۔ جہاں تک کہ بعض مؤرخین کی رائے ہے، ان کو خلفاء راشدین سے ملا دیتے ہیں، جو دین کے اعتراف سے مملو اور مستعد تھے، خون بہانے سے آمادہ نہ تھے۔"

حضرت عمرؓ کا قول: فرد واحد کی رائے کچھ دھاگے کی طرح ہے:

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار، سیرت اور شخصیت کا

یہ نظارہ ناتمام رہے گا، اگر شوریٰ، یعنی مشورت کے بارے میں ان کا نقطہ پیش نظر نہ ہو اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل پر نگاہ نہ ہو!

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے اصحابؓ سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا، نیز آپؐ سفر میں پیچھے رہتے، کمزور کو ساتھ ملا کر چلتے، اور نہ چل سکنے والوں کو ساتھ سوار کر لیتے تھے۔

اور یہ صرف آپؐ کا ارشاد ہی نہیں تھا، عمل بھی تھا،

ایک مرتبہ آپؐ نے انصار کو صلاح دی کہ اگر غطفان کے امراء سے کھیتوں کی ایک تہائی پیداوار پر صلح کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر انصار نہیں مانے۔ آپؐ نے اصرار نہیں کیا ان کی بات مان لی۔[۴۸]

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

الرای الفرد کالخیط السدیل "یعنی فرد واحد کی رائے کچے دھاگے کی طرح ہے!"[۴۹]

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک بار ایک کاغذ پیش ہوا جس میں ماہ شعبان درج تھا۔

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا، شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے؟ اس سال کا یا آئندہ سال کا؟"

پھر آپؓ نے اصحاب شوریٰ کو بلایا اور ان سے فرمایا: حکومت کے ملی وسائل میں اضافہ ہو گیا ہے جو کہ تقسیم کیے جاتے ہیں، یہ روپیہ ایک ہی دفعہ ختم نہیں ہو جاتا، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ حساب کتاب اس طرح منظم کیا جائے کہ اوقات کے بارے میں غلطی اور غلط فہمی نہ ہو!

لوگوں نے کہا: "بہتر ہو کہ ایرانیوں سے مشورہ کر لیا جائے کہ ان کے یہاں کیا طریقہ رائج ہے"؟

حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو طلب کیا۔ اس نے کہا: ہمارے ہاں تو ایک حساب ہے جسے "ماہ روز" کہا جاتا ہے، یہی ماہ روز عربی میں "مؤرخ" بن گیا!۔ پھر یہ سوال اُٹھا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لیے کون سا سنہ مقرر کیا جائے؟ اور اس کا آغاز کب سے کیا جائے؟

"سب کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ سالِ ہجرت مناسب رہے گا، آخر ہجری طے پایا!"

ابن المسیب کا قول ہے کہ ہجرت سے آغاز سال کی رائے حضرت علیؓ نے دی تھی، وہ فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا کہ کب سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اس روز سے جس روز سے آپؐ نے ہجرت کی، اور مکہ سے مدینہ تشریف لائے!"[50]

یعقوبی نے بھی اسی طرح کی روایت بیان کی ہے[51]:

حضرت عمرؓ تو مشورت کے بغیر خلافت کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ آپؓ فرمایا کرتے تھے:

لاخلافۃ الا عن مشورۃ![52] "یعنی بغیر مشورے کے خلافت بے معنی ہے"

ظاہر ہے جن خلفاء کے شوریٰ کی یہ کیفیت ہو ان کے کردار و سیرت اور ہیبت کا یہ عالم ہو تو خوارج کے اس اصول کو بڑی حد تک صحیح ماننا پڑتا ہے:

"ایک مرتبہ کوئی شخص خلیفہ منتخب ہو جائے۔ تو پھر اس باب میں اس سے جھگڑا نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر وہ جبر و جور پر اتر آئے تو اسے معزول کر دینا، اور اگر ضرورت ہو تو قتل کر دینا بھی جائز ہے[53]"

یہ قتل والی بات خوارج ہی کہہ سکتے تھے، کیونکہ ان کی انتہا پسندی تاریخ کی ایک مسلم حقیقت ہے۔ چونکہ وہ قتل کے خوگر اور کشت و خون کے

عادی تھے، لہٰذا ان کے نزدیک قتل کوئی ایسا سنگین معاملہ نہ تھا اور نہ اگر کسی کو قتل کرنے کی قوت حاصل ہے تو اسے معزول بھی کر سکتا ہے: رہا خفیہ طریقے استعمال کر کے قتل کرنا، سو یہ اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من قتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جہنم خالدًا فیھا ابدًا [۱] یعنی جس نے کسی مسلمان کو دانستہ طور پر قتل کیا، اس کی جزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

ماخذ:

[۱] السیاسۃ الشرعیہ ص ۱۱۰-۱۱۸ (علامہ خلاف) طبع مصر
[۲] مقدمۂ ابن خلدون، ص ۱۶۶، [۳] النظم الاسلامیہ (طبع مصر) ص ۳۴-۳۵، [۴] السیاسۃ الشرعیہ (علامہ عبدالوہاب خلاف) طبع مصر ص ۸۸، ۸۹، [۵] سورہ شوریٰ رکوع ۴، آیت ۳۹، [۶] سورۂ آل عمران، رکوع ۱۷، آیت ۶۰، [۷] تفسیر ابن کثیر طبع مصر ۱۳۴۸ھ، ج ۴، ص ۱۱۸، [۸] تفسیر خازن، طبع مصر، ج ۱، ص ۱۰۶، [۹] تفسیر معالم التنزیل، طبع مصر، ج ۱، ص ۱۰۶، بحاشیہ خازن، [۱۰] سراج الملوک، طبع مصر، للامام ابی بکر محمد بن الولید الفہری الطرطوشی، ص ۹۲، ۹۳، [۱۱] سورۂ نجم پارہ ۲۷، رکوع ۱، آیت ۴، [۱۲] زاد المعاد، ج ۲، ص ۱۸۷، [۱۳] مروج الذہب (مسعودی) ج ۲، ص ۳۰۷، [۱۴] مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۹۔
[۱۵] النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر احمد حسن ابراہیم حسن) مصر، ص ۵۰، [۱۶] تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۳۱، [۱۷] السیاسۃ الشرعیہ طبع مصر

(علامہ عبدالوہاب خلاف) ص ۸۸ ، ۱۸ سراج الملوک (طرطوشی) ،
طبع مصر، ص ۲۴۱ ، ۱۹ ابن خلدون، ج ۲ : ص ۸۱ ،
۲۰ طبری اور تمام کتب تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔
۲۱ السیاسۃ الشرعیہ (خلاف) طبع مصر، ص ۷۰ ، ۲۲ ابن کثیر ج ۵، ص ۸۱ ،
۲۲ صحیح بخاری، عن ابی سعید الخدری ، ۲۳ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص
۷۳، ۷۴ ؛ ۲۴ الفتنۃ الکبریٰ — (عہد عثمانی) ڈاکٹر طٰہٰ حسین، طبع مصر
ص ۱۷۰ ، ۲۵ ابن کثیر، ج ۷، ص ۱۴۶ ، ۲۶ سراج الملوک
(طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۸ ، ۲۷ طبری، ج ۵، ص ۳۴ -
۲۸ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۴۶ ، ۲۹ الکامل (ابن اثیر) ج ۳، ص ۲ ،
۳۰ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۴۱ ، ۳۱ الفتنۃ الکبریٰ — عہد عثمانؓ (ڈاکٹر
طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۴۵ ، ۳۲ الکامل (ابن اثیر) ج ۵، ص ۴۷ -
۳۳ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۸۹ ، ۳۴ ابن خلدون
ج ۲، ص ۱۰۵ ، ۳۵ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۸ -
۳۶ العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) ص ۱۰۳ -
۳۷ کتاب الخراج ص ۶۲ ، ۳۸ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۲۴۱، ۲۴۲ ،
۲۶۵ ، ۳۹ الفتنۃ الکبریٰ — عہد عثمانؓ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر،
ص ۱۸۵ ، ۴۰ علیؓ وبنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۲
نیز ۲۸۸ ، ۴۱ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۵۳، ۱۳۴، ۱۴۹
۴۲ [illegible]
۴۳ النجوم الزاہرہ لابی المحاسن، ج ۱، ص ۱۶۴ (بحوالہ النظم الاسلامیہ)
۴۴ النظم الاسلامیہ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۹۴ -
۴۵ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۲ -
۴۶ [illegible] (بحوالہ النظم الاسلامیہ

۴۷ زاد المعاد، ج ۲، ص ۱۳۳، (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر

۴۸ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۱،

۴۹ سراج الملوک (طرطوشی) ص ۱۴۵

۵۰ مقریزی، ج ۲، ص ۵۵، ۵۶

۵۱ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۶

۵۲ کنز العمال، ج ۳، ص ۲۹.

۵۳ تاریخ خلافت (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۱۱۰ ؛

(۴)

شرط قرشیت

حضرت ابوبکرؓ کی روایت سے منسوب ایک حدیث بیان کی جاتی ہے:
"الائمۃ من قریش" "یعنی امامت اور سرداری قریش کا حق ہے۔
یہ بات بھی روایات اور کتب تاریخ و سیر میں منقول ہے کہ انصار نے جب سعدؓ بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنی چاہی، اور اس منصب پر حقیقت بنو ساعدہ میں اپنا حق جتایا، اپنی قربانیاں پیش کیں، تو حضرت ابوبکرؓ نے یہی فرمایا تھا اور حضرت عمرؓ نے انصار کی ہر دلیل یہ کہہ کر رد کر دی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ قبیلہ ہیں۔ ہمارے ہوتے یہ منصب کسی اور کو نہیں جا سکتا، نہ قریش کسی اور کی حکومت قبول کر سکتے ہیں۔

ایک غلط حدیث سے استدلال: فحوائے تحقیق سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حدیث بھی غلط ہے، اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی طرف سے جو دعویٰ خلافت کے لیے شرطِ قرشیت سے متعلق کیا جاتا ہے، وہ بھی غلط ہے، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسولؐ اور عشرہ مبشرہ ایسی بات کیسے کہہ سکتے تھے جو روحِ اسلام کی نفی کرتی ہو، جو نص آثار، اخبار اور روایات کے یکسر خلاف ہو جس مساوات کے لیے اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا تھا، اگر اسلام میں وہی باقی نہ رکھی جائے تو پھر اسلام کے متعلق ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے مقصد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہی ناکام ہو گیا اور ایک عظیم اور مذہبی مقصد

ہیں فوراً ہی ناکام ہو جانے کے بعد نہ اسے تبلیغ کا حق رہ سکتا تھا، نہ وہ آفاقی مذہب کہلائے جانے کا سزاوار تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث اور حضرت عمرؓ کی طرف دعوئ قرشیت کی انتساب تمام تر غلط ہے سند کے اعتبار سے بھی، روایت کے لحاظ سے بھی اور درایت کے نظر سے بھی۔

اصولِ حدیث کی کتابوں میں، قبولِ حدیث کے جو شرائط ہیں، ان میں ایک اہم ترین شرط یہ بھی ہے کہ راوی کتنا ہی ثقہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسی روایت کرتا ہے جو قرآن کے خلاف ہو، سیرتِ رسولؐ کے خلاف ہو، اور اصولِ اسلام کے خلاف ہو تو رد کر دی جائے گی، قبول نہیں کی جائے گی[۱]۔ صرف اسی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی طرف یہ انتساب غلط اور نادرست ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ محض اپنے استحقاق اور اہلیت کی بنا پر اس منصب کے لیے منتخب کیے گئے، اس میں نہ قبائلی عصبیت کارفرما تھی نہ عشیرتی اصول۔

کیا قرآن کریم نے نہایت صاف طور پر نہیں فرمایا ہے:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" یعنی خدا کے نزدیک تم میں سب سے سربلند وہ ہے جو صاحبِ تقویٰ ہے[۲]۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا یہ ارشاد گرامی نہیں ہے کہ:

"اے لوگو! سن رکھو کہ تمہارا پروردگار ایک ہے، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سفید فام کو سرخ فام پر، سرخ فام کو سفید فام پر کسی طرح کی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کی بنیاد تو صرف تقویٰ ہے[۳]۔

پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ آپؐ کے دنیا سے پردہ فرماتے ہی، مدارِ اکرام و توقیر، قرشیت قرار دیا جاتا، اس طرح حکمِ الٰہی نظر انداز کر کے قریش کی سرداری اور امامت مسلط کر دی جاتی، دوسرے تمام لوگ اس سے محروم

کر دیے جاتے، اور حدیث و سنت کی اپنے عمل سے نفی کر دی جاتی!

ایک مصری محقق کے ارشادات: مصر کے ایک محقق اور عالم علامہ عبدالوہاب خلاّف نے اس مبحث پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"سرکارِ رسالتؐ کے اس جہان سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمان جب ثقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے تو ان میں اس مسئلہ پر شدید اختلاف پیدا ہوا کہ رسولؐ کے بعد زمامِ کار کس کے ہاتھ میں دی جاتی؟ انصار و مہاجرین ہر دو کے دلائل و براہین علیحدہ علیحدہ تھے۔ سعدؓ کی بیعت پر انصار نے لوگوں کو دعوت دی، بعض انصار نے مہاجرین سے کہا:

"ایک امیر ہم میں سے ہو۔ ایک تم میں سے!"

پھر جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ دلیل پیش کی کہ: "الائمۃ من قریش" تو انھوں نے اپنی دلیل کو یہ کہہ کر مبرہن نہیں کیا کہ یہ نص ہے اور دین کی طرف سے ایک فریضہ ہے۔ انھوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ قریش ہی وہ جماعت تھی جو متخالف اور متحارب فریقین میں اپنے زور، قوت اور دبدبہ کی بنا پر مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ یہ بات کہ زمامِ حکومت قبیلہ اوس کے ہاتھ میں دی جائے، قبیلہ خزرج کو مشتعل کر دے گی۔ اسی طرح اگر قبیلہ خزرج کو زمامِ حکومت سونپ دی گئی، تو قبیلہ اوس قوت سے باہر ہو جائے گا۔ اس لیے اس وقت عربوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ قبیلہ قریش سے رجوع کریں۔

اگر قریش کی حکومت نص ہوتی اور جزوِ دین ہوتی تو ثقیفہ بنو ساعدہ میں جو انصار کرام اور مہاجرین عظام جمع تھے وہ اس حقیقت کبریٰ سے ناواقف نہ ہوتے اور حضرتِ ابوبکرؓ کو انھیں یاد دلانے کی صورت پیش نہ آتی کہ اوس کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں خزرج اور خزرج کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں اوس آمادۂ پیکار ہو جائیں گے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ جب یہ سوچ رہے تھے کہ ان کے بعد ان کا جانشین کون ہو؟ تو یہ نہ فرماتے کہ حذیفہ کا غلام سالم آج زندہ ہوتا۔ تو میں اسی کو سب کچھ سونپ دیتا۔

عمرؓ اور علیؓ کی مثال: کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت عمرؓ ایک غلام کو کس طرح خلیفہ بنانے کا خیال ظاہر کر سکتے تھے، جب کہ "لا تبدوا من قریش" سے وہ واقف تھے، حالانکہ نصوص واردہ میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ فضیلت نسب کی نہیں، عمل کی ہے، نیز بار بار عصبیت جاہلیت سے برأت ظاہر کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"[۴]

علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے بھی اس کی تغلیط بڑے دل نشین انداز میں فرمائی ہے۔ ان کی تردید بظاہر تعریض معلوم ہوتی ہے، اور ہے بھی، لیکن اس کے اندر دبیں پوشیدہ ہے کہ روایت غلط اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

نہج البلاغۃ میں مذکور ہے کہ ثقیفہ بنو ساعدہ کے واقعات آپؓ کے سامنے بیان کیے جا رہے تھے، اور آپؓ سن رہے تھے، کیونکہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغولیت کے باعث اس موقع پر وہاں نہیں جا سکے تھے۔ بلا شبہ دونوں کام اپنی جگہ بڑے اہم تھے، آنحضرت صلعم کی تدفین بھی، اور امت کو ایک عظیم خطرے سے بچانے کی سعی و کوشش بھی۔ غرض:

امیر المؤمنین نے فرمایا:

"اور قریش اس معاملہ میں کیا کہہ رہے تھے؟"

عرض کیا گیا۔ وہ اس بات سے دلیل لا رہے تھے کہ وہ شجرِ رسولؐ ہیں۔

یہ سن کر امیر المؤمنین نے فرمایا: "یعنی درخت سے تو یہ دلیل لاتے ہیں لیکن اس کے پھل کو ضائع کر دیتے ہیں"[۵]

نہج البلاغہ کا مسلک: ڈاکٹر حسن علی ابراہیم حسن نے بھی اپنی کتاب میں اس پر

بحث و گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں:

خوارج خان فلوتن کے الفاظ میں جدید جمہوری مبادی کے نمائندے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خلافت ہر آزاد عرب کا حق ہے۔[۱۷]

بعد میں خوارج نے عربیت کی تخصیص بھی حد درجہ خالی از تشدد اسلامیت کے علمبردار ہونے کے باوجود رد کر دی تھی، اور ہر مسلمان کو منصب خلافت کا اہل تسلیم کر لیا تھا۔ خواہ وہ کسی ملک، نسل، قوم یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو۔

عمر ابو النصر کا بیان ہے:

یہ بات کہ خلافت کے سلسلے میں قریش کی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ منصب قریشیوں کے لیے مخصوص ہے یا دوسرے بھی اس کے حقدار ہیں؟ خوارج نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قریش کے حق خلافت سے متعلق جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ خوارج اپنے عقائد کے اعتبار سے قرآن و سنت سے بہت زیادہ قریب تھے اور ان کی لغت کا رتبہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ پس اگر استحقاقِ قریش کی حدیث نصِ صریح کی حیثیت رکھتی ہوتی تو خوارج اس کا انکار کرتے؟ اس سے ثابت ہو گیا ہے۔[۱۸]

اگر [illegible] تو [illegible] حضرت [illegible] بیعت کی [illegible] کی بیعت کے لیے بے تاب [illegible] سوال یہ ہے کہ حضرت [illegible] بوقت وفات یہ کیوں فرمایا تھا کہ:

اگر [illegible] تو [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible] کا [illegible]

ثابت ہے کہ حکومت اسلامیہ میں حکومت نہ "قریش" کا "حق" ہے، نہ کسی دوسرے کا۔ قرآن کریم اور سنتِ نبویہ میں کہیں بھی یہ وارد نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمانوں کی زمامِ حکومت فلاں خاص جماعت یا گروہ کا حق یا حصہ ہے۔ جس طرح اس سلسلہ میں کوئی جماعت فٹ نہیں کی گئی، اسی طرح افراد کو بھی نظر انداز کر دیا گیا اور ان کے لیے بھی کوئی ہدایت نہیں کی گئی۔ اس ترکِ تعیین کا مقصد و منشا جو کچھ ہے وہ یہی کہ حکومت کا معاملہ صرف اُمت کے ہاتھ میں رہے۔ اسے پورا اختیار ہو کہ جس کو چاہے چن لے اور برسرِ اقتدار اور اختیار کر دے۔

طبری اور ابن خلدون کی بحث: طبری نے قرشیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "حضرت عمرؓ نے خلافت کی، اور استحقاقِ خلافت پر دلائل پیش کیے۔ آپ نے فرمایا: بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک زمانہ میں دو امیر جمع ہوں۔ خدا کی قسم یہ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ تمہیں اپنا امیر منتخب کریں، درآنحالیکہ ان کا نبی دوسرے قبیلے سے ہو۔ لیکن ہاں عرب اس قبیلہ کو خلافت دینے میں کوئی تامل نہ کریں گے جس میں نبوت کا ظہور ہوا ہو۔ وہ صرف اسی قبیلے کے فرد کو اپنا امیر بنانا پسند کر سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت ایک عرب کے ہر فرد کے دل میں اترے ہوئے ایک زبردست دلیل اور کھلے ہوئے استدلال کی حیثیت رکھتی ہے۔"

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقتدار و وراثت کے بارے میں کیا کوئی [illegible] ہے؟ ہمارے آپ کے اولیاء [illegible] قبیلہ ہونے کا [illegible] ہوگا، اس سے انکار صرف وہی کرے گا جو غلط باتوں سے استدلال کرنا چاہتا ہو، جو [illegible] کی پہلے سے ٹھان چکا ہو، یا جو [illegible] پر بازی [illegible] رہا ہو۔"

ابن خلدون نے خلافت کی قریش کے ساتھ وابستگی کو ایک نئی نظریہ کا

ہے: "مسلمانوں نے خلافت کے ساتھ قریش کو مخصوص کر دیا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تنہا یہی قبیلہ اپنے غلبہ و اقتدار کی بناء پر جمہور کی قیادت کی صلاحیت رکھتا تھا، کسی دوسرے قبیلہ کو یہ بات نصیب نہ تھی، تمام جزیرۂ عرب ان کی فضیلت و برتری کا معترف تھا، کسی قبیلہ کو ان کی سیادت و ریاست سے انکار نہ تھا۔"[۱۲]

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کا نقطۂ نظر یہ ہے:

"جو لوگ عالمگیر مساوات کے قائل ہیں اور قریشی غیر قریشی کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں وہ متعدد دلائل سے استناد کرتے ہیں۔ مثلاً وہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ پیش کرتے ہیں:

"اگر آج "سالم" زندہ ہوتا، تو مجھے اس بارے میں کوئی شک و تامل نہ ہوتا"

یہ الفاظ آپؓ نے سالم کے بارے میں اس وقت فرمائے، جب آپؓ مسئلہ خلافت کو شوریٰ کے ہاتھوں میں دے رہے تھے، اگر حضرت عمرؓ کے خیال میں تمام مسلمانوں کو امامت کا حق حاصل نہ ہوتا تو اس قسم کے الفاظ آپ ارشاد نہ فرماتے؟ انھیں ابوحذیفہؓ کے غلام کی موت پر افسوس کبھی نہ ہوتا۔

فیصلہ کن ارشادِ رسولؐ: آنحضرتؐ سے بہت سی روایات اس کے متعلق منقول ہیں: آپؐ نے فرمایا: "سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ وہ ایک نکٹا غلام ہو۔"

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" "یعنی اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔"[۱۳]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت صرف ان کے ذاتی مجد و شرف کی بناء پر ہوئی تھی، نہ کہ قرشیت کی بناء پر، حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح نے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "امین امت" کا خطاب دیا تھا۔ حضرت

صدیقِ اکبر رضؓ کی بیعت کرتے ہوئے کتنی سچّی بات کہی تھی:

"مہاجرین میں سب سے افضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار آں حضرتؐ کی عدم موجودگی میں امامتِ نماز کے شرف سے مشرف آپ اور صرف آپ ہیں، لہٰذا آپ کے مقابلے میں کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا، جو خلافت کے بارِ گراں کو اُٹھا سکے[1]!"

مساوات اور اخوت کی نفی: اوپر جو تصریحات پیش کی گئی ہیں، ان سے یہ بات واضح ہے کہ خلافت یا امامت کے لیے قرشیت کی شرط پر جو زور دیا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح اور مستند طور پر ثابت نہیں ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیم مساوات اور اخوت کے منافی بھی ہے؛ بہت سی روایتیں ہماری بلند پایہ کتابوں تک میں اس طرح شامل ہو گئی ہیں کہ ان کی تنقیح نہیں کی گئی، اگر چھان بین سے کام لیا جاتا، اور درایت کی کسوٹی پر انھیں پرکھ لیا جاتا، تو جو چند در چند غلط فہمیاں ان کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں وہ ہرگز رونما نہ ہوتیں، نہ معاملات میں ابتری پیدا ہوتی۔ ترکوں نے کئی سو برس تک خلافت کا بار سنبھالا جنھیں ساری دنیائے اسلام بشمول ممالک عربیہ "امیر المؤمنین" تسلیم کرتی رہی۔ ظاہر ہے وہ قریشی نہیں تھے ـــــ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ!

واضح:

[1] شرح نخبۃ الفکر، اور اصول حدیث کی دوسری کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ احادیث نبویؐ کے رد و قبول کا معیار قائم کیا گیا، اور اس کی نشان دہی کی گئی ہے تفصیل کے لیے ان کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

[2] سورۂ حجرات رکوع ۲، آیت ۱۴، [3] متعدد کتب احادیث میں متعدد طرق سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے، بیہقی وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

[4] السیاسۃ الشرعیہ ص ۸۶، ۲۷،

۵۵ نہج البلاغۃ ۔ (ترتیب و تہذیب علامہ عبدہٗ) طبع مصر، ص ۴۹۸ ۔

۵۶ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۴۸ ۔ طبع مصر۔

۵۷ مذاہب الاسلامیہ (علامہ ابو زہرہ، مطبوعہ مصر) ۔

۵۸ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۸۰ ۔

۵۹ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۴۸ ۔

۶۰ سیاسۃ الشرعیۃ (علامہ عبدالوہاب خلاف، طبع مصر، ص ۵۵

۶۱ طبری ج ۳، ص ۲۰۷، ۲۰۹ ۔

۶۲ مقدمۃ ابن خلدون، ص ۱۵۳ ۔ ۱۵۴ ۔

۶۳ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۵۵ ۔

۶۴ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۸۵، طبع مصر ۔

(۵)

شرطِ اطاعت

ہر کہ فتح ہو، والی صوبہ ہو، یا سربراہِ مملکت، امیر ہو، امام، یا خلیفہ، بہ اس شرط واجب ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے لیے کہ نظامِ مملکت تک ہر معاملے میں، قرآن و سنتِ نبویؐ کی روشنی ہی میں کوئی قدم اٹھا سکتے، کوئی راہ عمل متعین کر سکتے ہیں۔ ہم اگر جمہوریت کے قائل ہیں تو صرف اس لیے کہ اسلام یہی سکھاتا ہے۔ مطلق العنانی، بے آئینی اور بے دستور سے دُور ہوتے گئے، اتنے ہی وہ خدا رسی پر مائل ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اسلام کی روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، صرف چند الفاظ کو متاعِ عزیز بنا کر اسی محور پر گردش کرنے لگے!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بڑی جماعت مفکرین اور اصحابِ علم و فضل کی اس طرف گئی ہے کہ اطاعت غیر مشروط ہونا چاہیے گویا ہمیں از خود ایک بُت بنا لینا چاہیے اور اس کی پرستش شروع کر دینی چاہیے۔ ہمیں از خود ایک "ملکِ معظم" کی تخلیق کر لینی چاہیے، اور اپنی فہم و دانش کو ایک سکہ کر اس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے اور اسلام نے جو حریتِ فکر و نطق اور اقدام و عمل عطا کی ہے، اس سے دست بردار ہو کر اپنے بادشاہ کا ہر حکم بے چون و چرا مان لینا چاہیے خواہ وہ حکم کتنا ہی غلط اور ناصواب کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کی روح کتنی ہی مجروح کیوں نہ ہو رہی ہو، اور اس کی تعمیل سے مفاسد و فتن کا کتنا ہی بڑا دروازہ کیوں نہ کھل جاتا ہو؟

ردّ و قبول کا اختیار: ادیانِ عالم میں اسلام وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے اپنی دعوت میں یہ کبھی نہیں کہا کہ:

"مجھے مان لو، اس لیے کہ میں کہتا ہوں کہ مجھے مان لو!"

قرآن حکیم کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ بار بار تفکر کی دعوت دیتا ہے، تعقل کی طرف بلاتا ہے، تدبر کی تبلیغ کرتا ہے وہ جذبات سے نہیں، عقل کے فہم و فراست سے اپیل کرتا ہے، وہ اپنے نہ ماننے والوں کو عذاب الیم کی بشارت تو دیتا ہے، لیکن دنیا میں ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کرتا نہ صرف سزا تجویز نہیں کرتا، بلکہ صاف اور واشگاف الفاظ میں فرما دیتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" "یعنی دین کے معاملے میں جبر و اکراہ نہیں کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔"

جب ہدایت نکھر کر سامنے آگئی تو اسے تسلیم نہ کرنا یا تو نادانی ہے یا یہ سرکشی پر مبنی ہے۔ پہلی صورت میں خدا "غفور رحیم" ہے اور دوسری صورت میں وہ "ذوانتقام شدید" ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے وہ خود نمٹ لے گا۔ اسلامی حکومت کو یا حکمران کو اس کا حق نہیں کہ جبر و اکراہ سے کام لے کر نادانوں کو بنا دے یا سرکشوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر کفر کا سر کچل دے۔ یہ تو خوش سودا ہے۔ جو حق کو قبول کرنا چاہتا ہے قبول کر لے، جو نہیں قبول کرنا چاہتا نہ کرے لکم دینکم ولی دین!

تو جب خدا دین یعنی اپنی حکومت کے معاملے میں عقل و فہم کی دعوت دیتا اور ردّ و قبول کا اختیار دیتا ہے تو خالص دنیاوی معاملات میں مطلق اور غیر مشروط اختیار کا حکم کسی حاکم یا فرماں روا کے لیے کیسے دے سکتا ہے؟

تعاون اور عدم تعاون کی شرط: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا ہے:

"تعاونوا علی البر والتقوی ولا" یعنی نیکی اور تقویٰ کے معاملے تعاون ضرور کرو،

تعاونوا علی الاثم والعدوان — لیکن اثم و معصیت کے معاملے میں تعاون ہرگز نہ کرو گے

جب باہمی زندگی میں روزمرہ کے معاملات میں سماجی اور جماعتی زندگی کے مختلف امور میں اسلام کی تاکید ہے کہ تعاون نیکی اور پرہیزگاری میں کرنا چاہیے گناہ اور معصیت میں ہرگز ہرگز نہ کرنا چاہیے تو کسی ایسے نظام حکومت سے وہ تعاون کیونکر پسند کر سکتا ہے جو نیکی اور پرہیزگاری کی نفی پر مبنی ہو؟

ظلم، حقوق کی پامالی، عدم مساواتِ خلق، عدل سے کنارہ کشی، بیت المال میں تصرف اور خیانت، بے خدا دستور اور غیر بیزار نظام، اگر کسی امیر یا حاکم اور فرماں روا کی خصوصیات بن جائے تو کیا اس کی اطاعت بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی جاتی رہے گی؟ اور اگر ایسا ہو تو کیا اسلام زندہ رہ سکے گا؟ اسلام کی روح قائم رہ سکے گی؟ جس تطہیر علم و فکر کا اسلام داعی ہے کیا اس کا اہتمام حاصل ہو سکے گا؟ وہ اقدار کیا باقی رہ سکیں گے جنہیں اسلام غیر معمولی اہمیت دیتا اور جن پر بار بار عمل کرنے کی تاکید کرتا ہے؟

جواب ظاہر ہے نفی ہی میں ہو سکتا ہے!

اور جب جواب نفی میں ہو سکتا ہے تو پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ کسی فرماں روا یا حاکم کی اطاعت غیر مشروط ہو سکتی ہے۔

یقیناً اسلام پر اس سے بڑا کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ اولی الامر کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیتا ہے۔

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" : قرآن کریم اور سیرت نبوی سے جو بات واضح اور غیر مشکوک ثابت ہوتی ہے، یہ ہے کہ اطاعتِ اولی الامر درحقیقت ایک معاہدہ ہے جس کے طرفین پابند ہیں۔ اگر راعی ان حدود و شرائط کا پابند ہے جو اسلام نے مقرر کر رکھے ہیں تو رعایا کسی اس کی اطاعت پر مجبور ہے، بصورتِ دیگر معاہدہ ختم!

نبیؐ کی طاعت امر معروف میں: اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو صرف سربراہِ مملکت ہی نہیں تھے، خدا کے برگزیدہ رسولؐ بھی تھے، اسوہ کیا تھا؟

آپؐ کسی کو مسلمان کرتے وقت جب بیعت لیتے تھے تو وہ پانچ چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

— : صرف خدائے واحد کی عبادت اور شرک سے اجتناب کامل۔

— : چوری اور زنا نہ کرنے کا عہد۔

— : وفورِ غیرت، بے حیا، خوفِ افلاس کے باعث اولاد (فرزند و دختر) کو قتل نہ کرنے کا وعدہ۔

— : تہمت، غیبت اور لگائی بجھائی سے اجتناب۔

— : نبیؐ کی اطاعت ہر امر معروف میں۔

بیعت کی آخری شرط پر غور فرمائیے:

شرط کیا ہے؟ — امرِ معروف (اچھے کام) میں نبیؐ کی اطاعت۔

کیا نبیؐ کسی ایسے کام کا حکم کبھی دے سکتا ہے جو اچھا نہ ہو؟

آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک کیا کوئی ایسا نبیؐ گزرا ہے جس نے کسی غیر اخلاقی یعنی ناجائز کام کا حکم اپنی امت کے کسی فرد کو دیا ہو؟

کیا نبوت کا مرتبہ، اور اس کی جلالتِ شان اس کی متقاضی ہو سکتی ہے کہ وہ ناجائز حکم صادر ہو؟

بات تو کوئی معمولی خدا ترس آدمی بھی نہیں کر سکتا، پھر نبیؐ جو معصوم ہوتا ہے، کیونکر اور کس طرح یہ کر سکتا ہے؟

بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ جب نبیؐ کی اطاعت بھی مشروط ہے، اور "معروف" کے ساتھ مشروط ہے تو ایک غیر نبیؐ کی اطاعت تو بدرجۂ اولیٰ اس شرط کے ساتھ مؤکد طور پر مشروط ہو گئی، تاکہ اس سے کہ وہ لشکر کا سالار ہو یا حاکم

جبار و ستم گار!

حقِ طاعت کب ساقط ہوتا ہے؟ درحقیقت اپنی بیعت میں یہ شرط رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک یہ بات واضح فرما دی کہ اطاعت مشروط ہے "معروف" کے ساتھ!

اس کے بعد بھی اگر کوئی اس کے خلاف سرکشی کرتا ہے، خروج کرتا ہے، بغاوت کرتا ہے، تو بلاشبہ وہ کشتنی اور گردن زدنی ہے۔ لیکن "معروف" کے بجائے اگر "غیر معروف" کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ظاہر ہے وہ واجب التعمیل نہیں۔

استاذ سید قطب شہید نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا یعنی اے مدعیانِ ایمان! اطاعت کرو، اور ان اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں[۵]۔

اس آیۂ کریمہ میں اللہ اور رسولؐ اور اولی الامر کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت اس کی ذاتِ خاص کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ اس اساس پر ہوتی ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی عطا کی ہوئی شریعت پر قائم رہتا ہے، اور اس کا اجرا اور نفاذ کرتا ہے۔ لیکن اگر (اس اپنے اصل کام سے) وہ روگرداں ہو جاتا ہے تو فوراً ہی اطاعت کا حق بھی سوخت ہو جاتا ہے اور اس کے ذاتی اور غیر شرعی احکام کی پابندی اور تعمیل لازمی نہیں رہ جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ہر مسلمان کے لیے واجب ہے کہ وہ حاکم کا حکم تسلیم کرے، خواہ (شخصی طور پر) اسے ناپسند کرتا ہو۔ بجز اس صورت کے کہ اسے گناہ کا حکم دیا جائے۔

نیز آپؐ نے فرمایا: "حاکم کا حکم سنو، اور اس کی اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کوئی ایسا حبشی غلام حاکم مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح (چھوٹا) ہو، جب تک کہ وہ کتاب اللہ کے احکام نافذ کرتا رہے[۶]!"

بصورتِ دیگر نہ حکم کا سننا واجب ہے، نہ اس کی اطاعت[۷]!

ماوردی کا استدلال : ماوردی بھی بالواسطہ طور پر اس مسئلے کو زیر بحث لاتے ہیں۔ "اہلِ اختیار میں تین صفات کا اعتبار کیا جاتا ہے :

۱۔ حق پر ہونا اپنے تمام شرائط کے ساتھ۔

۲۔ علم جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ امامت کا، اس کی تمام شرائط کے ساتھ کون استحقاق رکھتا ہے۔

۳۔ دانائی و فکر، کیونکہ یہ باتیں بہترین اہلیت رکھنے والے آدمی کے انتخاب میں ممد ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے :

"جو لوگ امام کے شہر میں سکونت رکھتے ہیں، انھیں اس معاملے میں دوسرے شہر والوں پر تفوق حاصل نہیں ہے مگر چونکہ یہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس شہر کے باشندے ہی امام کے اختیار کرنے کے اہل سمجھے گئے ہیں اس لیے یہ حق انھیں محض رسماً حاصل ہو گیا، لیکن شرعاً اس کے جواز کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔"

خلیفۂ اوّل کا پہلا فیصلہ اور اس کے مضمرات : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد آپؐ نے جو خطبہ دیا، وہ اپنی معنویت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام کا ایک ناقابلِ فراموش خطبہ ہے :

حضرت ابوبکرؓ نے اس خطبے میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور کئی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ہم صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔ آپؓ نے فرمایا :

"اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کسی ایسے کام کا ارتکاب ہو جو اللہ اور رسول اللہ کے خلاف ہو، تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔"

ان ارشادات پر جتنا جتنا غور کیا جائے گا، اتنی ہی اتنی یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ :

۱: حکمران یا سربراہِ مملکت سے اگر کسی غلط کام کا صدور ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کو ٹوکا جا سکتا ہے، بلکہ خود پہلا خلیفۂ راشد دعوت دیتا ہے کہ ایسا ہو تو مجھے ٹوکو۔

۲: دوسرے حکمرانوں اور سربراہانِ مملکت کا ذکر، پہلا خلیفۃ الرسول بہ الفاظ واضح ارشاد فرماتا ہے کہ شرطِ اطاعت یہ ہے کہ میں کتاب و سنت پر عمل کرتا رہوں اگر ایسا نہیں کرتا، تو پھر اطاعت ساقط ہو جائے گی، اور میں اپنے مطاع ہونے کا حق کھو دوں گا!

اور حضرت ابوبکرؓ ایسا کیوں نہ فرماتے، جب کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے واقف تھے۔

"امر معصیت میں سمع و طاعت روا نہیں!"[۹۶]

اور اس سے بھی واقف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"طاعت صرف امرِ معروف ہی میں ہے!"[۹۷]

حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ: حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ بر منبر انھوں نے حاضرین سے سوال کیا:

"اگر میں دنیا کی طرف مائل ہو جاؤں تو تمہارا رویہ کیا ہوگا؟"

یہ سنتے ہی مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا، اور اس نے میان میں سے تلوار نکالتے ہوئے جواب دیا:

"ہم تمہاری گردن اڑا دیں گے!"

حضرت عمرؓ نے اسے یوں ٹوکنے کے لیے زجر و توبیخ کے لہجے میں فرمایا:

"یہ الفاظ تو میرے لیے استعمال کر رہا ہے؟"

بے جھجک اس نے جواب دیا: "ہاں! تمہارے لیے!"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "خدا کا شکر ہے کہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو میری کجی کو سیدھا کر سکتے ہیں!"[۹۸]

علامہ محمد عبدہٗ کا تبصرہ : حضرت علیؓ کے ساتھ خوارج کا رویہ کیا تھا، یہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ وہ انھیں نعوذ باللہ کافر تک کہتے تھے اور ان کے ماننے والوں کو بے دریغ قتل کر دیتے تھے۔ لیکن خود حضرت علیؓ نے خوارج کے بارے میں کیا فرمایا؟

"میرے بعد خوارج کو ہلاک نہ کرنا جو حق کا طالب ہو۔ اور طلب حق میں اس سے خطا ہو جائے، تو وہ اس شخص کے مانند نہیں ہے جس نے باطل کو چاہا اور اسے حاصل بھی کر لیا"!

اس ارشاد پر علامہ عبدہٗ فرماتے ہیں:

"حضرت امیر المومنینؓ کی مراد یہ ہے کہ خوارج اگرچہ اپنے سوء عقیدہ کے باعث گمراہ ہیں، لیکن یہ گمراہی اس شبہ کے باعث پیدا ہوئی ہے جو ان کے نفوس میں جاگزیں ہو گیا ہے، یعنی ان کی نیت غلط نہیں۔ اگرچہ اقدام و عمل میں غلطی ان سے سرزد ہوئی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امام پر خروج جائز ہے یہ عقیدہ غلط ہے اور امام برحق پر خروج ہے بھی ناواجب۔ لیکن میرے وفات کے بعد صورت حال بدل جائے گی۔ اب خلافت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی، جو برسر باطل ہیں۔ اور باطل کی کمک پر انھوں نے مسند خلافت پر قبضہ کیا ہے، لہٰذا ایسے ملوک کے خلاف خروج جائز ہے، کیونکہ جن لوگوں کے خلاف اب یہ خروج کریں گے، یہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے غلط طور پر حق کو دبا کر اور باطل سے مدد لے کر اس منصب کو حاصل کیا ہے۔ پس ان کے خلاف خروج و بغاوت بالکل جائز ہے، لہٰذا خوارج ان کے ساتھ جو کچھ کریں گے، عین مناسب اور مستحسن اقدام ہوگا"!

علامہ فیض الاسلام کی تصریح : اس پر علامہ فیض الاسلام علی نقی (طہران) فرماتے ہیں:

"حضرت نے خوارج کی نفی فرمائی ہے اس لیے کہ مقصود اصلی تو ان کا حق

ہے، البتہ اس کے حصول کا راستہ غلط ہے، اور یہی ان کی گمراہی ہے۔ پس وہ لوگ سزاوار کشتن نہیں ہیں، جو معاویہؓ اور اصحاب معاویہؓ کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے خلافت کے نام سے حکومت خاص کی ہے، باطل کی مدد سے خاص کی ہے، غلط مقاصد کے تحت خاص کی ہے۔

"خود امیر المؤمنینؓ نے جو خوارج سے جنگ فرمائی تو اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی خود انھوں نے پیش قدمی نہیں کی، بلکہ بار بار ان کی اصلاح احوال کی کوشش فرمائی۔ جب کبھی امیر المؤمنینؓ نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی ان کے فتنہ و فساد سے مجبور ہو کر ان کے قتل و غارت کے مقابلہ میں کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر۔ چنانچہ ان لوگوں نے عبداللہ بن خباب کو جو اصحاب امیر المؤمنین میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے، بری طرح ہلاک کیا، ان کی اہلیہ کو جو پیٹ سے تھیں قتل کیا، اور شکم چاک کر دیا۔ اس موقع پر قتل خوارج کی جو نفی فرمائی ہے وہ اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر یہ فتنہ و فساد نہ کریں تو محض عقیدہ کی بنا پر ان سے قتل نہ کرو۔ کیونکہ جنگ اسی وقت جائز و مناسب و مباح ہوتی ہے جب خون بہنے بہانے کا خطرہ ہو، یا فتنہ و فساد کی گرم بازاری شروع ہو چکی ہو!"

چند اور مثالیں: حضرت عثمانؓ اور امیر معاویہؓ کا ایک واقعہ بھی اس سلسلے میں توجہ طلب ہے:

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے سیاست عہد عثمانؓ پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے ایک مرتبہ اپنے ایک قرابت دار کو خاصی بڑی رقم عطیہ دینے کا حکم صادر فرمایا تو خازن نے تعمیل ارشاد سے یعنی اس باب خاص میں تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا:

"تم ہمارے خازن ہو، تعمیل حکم کیوں نہیں کرتے!"

اس نے جواب دیا: "آپؓ کا خازن آپ کا غلام ہوگا۔ میں تو مسلمانوں کا خازن ہوں۔!"

پھر اس نے بیت المال کی چابیاں منبر نبوی پر رکھ دیں اور خانہ نشین ہو گیا۔[16]

مصر کے عامل ورداں کو امیر معاویہؓ نے حکم بھیجا کہ ہر قبطی سے ایک قیراط زیادہ وصول کیا کرو۔

وردان نے جواب لکھ کر بھیجا۔ "قبطیوں سے معاہدہ ہے کہ رقم بڑھائی نہیں جائے گی۔ تعمیل ارشاد کس طرح کروں؟"[17]

اور وردان کو یہ جرأت اس لیے ہوئی کہ ان کے دل میں نورِ اسلام روشن تھا اور وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"اطاعت امیر صرف معروف میں ہے"[18]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ایک اہم سوال: اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ نے جب سرمایہ داری کے خلاف لب کشائی فرمائی تو مروان کی شکایت پر حضرت عثمانؓ نے انھیں اس آتش نوائی سے باز رکھنے کی کوشش کی، انھوں نے اپنی روش بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور فرمایا:

"اللہ کی رضا حاصل کرنے کے سلسلے میں عثمانؓ کی ناراضی مول لینا میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہے"[19]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب میں حضرت عثمانؓ کا نہایت موثر اور کامیاب دفاع کیا ہے اور ان کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ان کے اقدام کو بالکل فکر پر مبنی قرار دیا ہے۔ اور بالکل بجا کیا ہے لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے تمہید کے طور پر انھوں نے جو سوال اٹھایا ہے وہ شرط اطاعت کی بڑی اچھی وضاحت کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ آیا حضرت عثمانؓ نے کتاب و سنت اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کی یا نہیں؟ اگر نہیں تو مسلمانوں سے اطاعت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، اگر کی تو مسلمان نافرمانی کا حق نہیں رکھتے۔"

ان مباحث سے یہ بات صاف ہوگئی کہ اطاعتِ امیر اسلام میں غیر مشروط نہیں ہے۔ وہ جانبین کا ایک معاہدہ ہے جس پر دونوں کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ شارع کی نظر میں جس طرح انفرادی طور پر طلاق ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سے ہے درجہ نامرغوب اور غیر پسندیدہ چیز ہے اسی طرح اجتماعی طور پر خروج اور بغاوت بھی حد درجہ نامطبوع اور ناگوار چیز ہے، غور کیجیے تو دونوں چیزیں امن و سکون، اطمینان و عافیت اور تعمیر و اصلاح کی غارت گر ہیں۔ طلاق صرف دو ہستیوں کی جدائی کا نام نہیں ہے، ایک پورے کنبے کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔ مرد کے سکون، عورت کی زندگی اور اولاد کے مستقبل پر اس کا بہت گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے، اس لیے کتنی حد بندیوں کے ساتھ اسے صرف اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ کوئی صورت مفاہمت اور مصالحت کی باقی نہ رہ گئی ہو۔

یہی کیفیت خروج و بغاوت کی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلتا کہ ایک جماعت نے بغاوت کی اور ایک شخص مسند حکومت سے دست بردار ہو گیا، یا معزول کر دیا گیا، بلکہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مدت کے لیے عام میں بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے، کاروبار معطل ہو جاتا ہے، نظام حکومت کی استمراری متوازل ہو جاتی ہے، نشاط کار کی جگہ یہ مفقود ہو جاتا ہے، شورش پسندوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں، امن و امان غارت ہو جاتا ہے، غرض طرح طرح کے مفاسد رونما ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس کی اجازت بھی شاذ صورتوں میں ہے اور وہ بھی نہایت کراہت کے ساتھ، کیونکہ اس کا سب سے بڑا اور برا اثر شیرازہ بندی پر ہوتا ہے، تنظیم اور ملی وحدت کا سمجھنا چاہیے خاتمہ ہو جاتا ہے، انارکی، طوائف الملوکی اور انتشار کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

وحدت ملی کا قیام سب پر بالا ہے: عوام کو اور فرد کو اسلام کی طرف سے جتنے جمہوری حقوق حاصل ہیں ان سب کو قربان کر کے بھی اگر جمعیت قائم رہتی ہے

اور وحدت ملی میں رخنہ نہیں پڑتا۔ تو بغاوت اور خروج سے احتراز کرنا واجب ہے۔ البتہ جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے، اور اسلام کو یکسر معطل کر دیا جائے اور کتاب و سنت کو نظر انداز کر دیا جانے لگے تو ہتھیار اٹھانا جائز ہے۔ اس لیے کہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ لیکن ہتھیار اٹھانا بھی غیر مشروط طور پر جائز نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کامیابی کا پورا یقین ہو، اور ایسے وسائل میسر آ جائیں جو حصولِ مقصد میں فیصلہ کن حد تک معین و مددگار ثابت ہوں، بغیر اس کے خروج و بغاوت ہی ہستی ذاتی طور پر بھی نقصان دہ اور ضرر رساں ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ ذاتی طور پر یوں کہ جان دے دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اجتماعی طور پر بایں صورت کہ ایک اچھے مقصد کی بری طرح ناکامی آئندہ دوسرے اصلاح طلب عزائم کے لیے بھی ہمت شکن ثابت ہو سکتی ہے۔ پس یہ قدم صرف آخری چارۂ کار کے طور پر اٹھایا جا سکتا ہے، اور وہ بھی متوقع کامیابی کے تمام وسائل فراہم کر لینے کے بعد۔

جمہوریت مذہب میں: اسلام مذہبی معاملات تک میں کس درجہ جمہوری ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے جمودِ فکر اور شخصیت پرستی کو مکمل طور پر اجتہاد اور اجماع کا دروازہ کھول کر ختم کر دیا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس نے اتنے وسیع اور ہمہ گیر پیمانے پر اجتہاد کو واجب قرار دیا ہو، اجماع کو ارکانِ دین میں شمار کیا ہو۔۔۔ پس جب دین کے معاملے میں اتنا وسیع انقلاب بنتے تو دنیا کے معاملے میں ظاہر ہے اسے اور زیادہ فراخ حوصلہ ہونا چاہیے۔ اور وہ ہے بھی کتاب و سنت کی پابندی کے ساتھ۔ اس نے انسان کو وہ حقوق دے دیے ہیں۔ جو آج تک نہ کسی مذہب نے دیے ہیں نہ کسی سوسائٹی نے نہ کسی حکومت نے۔

ماوردی اور عدل و خوارج: ماوردی نے عزل اور خروج و بغاوت کے

موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

اگر دو باتوں میں ایک بات بھی خلیفہ میں پیدا ہو جائے تو وہ امامت سے خارج ہو جائے گا۔

پہلی بات اس کے اخلاق (یعنی عدالت) کی خرابی ہے۔ دوسری جسمانی نقص۔ عدالت (یعنی اخلاق) میں خرابی پیدا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فاسق ہو جائے، محرمات شرعیہ کا ارتکاب کرنے لگے، اور ہوس ذاتی سے مغلوب ہو کر ناروا باتیں اس سے سرزد ہونے لگیں، یہ ایک ایسا حق ہے جس کے باعث نہ کوئی شخص امام بن سکتا ہے، نہ رہ سکتا ہے، جب کسی امام پر یہ حالت طاری ہو جائے گی وہ امامت سے خارج ہو جائے گا، اور پھر گو وہ اپنے اخلاق درست کر کے اول بن جائے، مگر جب تک تجدید بیعت نہ ہو، وہ منصب خلافت و امامت پر متمکن نہیں ہو سکتا۔[۲۰]

سمع و طاعت: غزل و خروج کے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے ان سب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سمع و طاعت پر بحث کر لی جائے۔

اسلام نے امکان و استطاعت کے مطابق سمع و طاعت پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن کریم میں سمع و طاعت سے متعلق متعدد آیات وارد ہوئی ہیں:

اطیعوا اللہ والرسول	یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو![۲۱]
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو۔[۲۲]
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔[۲۳]
اطیعوا اللہ و رسولہ	یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو![۲۴]
اطیعوا اللہ و الرسول	یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو![۲۵]

اطیعوا اللہ و رسولہ — یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو۔[۲۶]

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول — یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔[۲۷]

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم — یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس حاکم کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہو۔

کسی غیر مذہب اور عقیدت کا پیرو ہو تو ظاہر ہے اس کے احکام معصیت خالق پر مبنی ہوں گے۔ جن کی تم پیروی نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ وہ تمہارے دینی مزاج سے بھی ناواقف ہوگا، اس لیے نیک نیتی کے باوجود وہ تمہارا صحیح سربراہ نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر وہ حاکم جو "منکم" ہو۔ اور فسق و معصیت اختیار کرلے تو اس کی بیعت ساقط ہو جائے گی، وہ امامت کے حق سے محروم ہو جائے گا۔ اور جب بیعت ساقط ہوگی اور حقِ امامت سوخت ہو گیا، تو اب سمع و طاعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے، اور اگر وہ مقابلے پر اتر آئے اور تم مقابلے کی سکت رکھتے ہو تو اس کے خلاف خروج و بغاوت بھی جائز ہے۔

احادیث کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سمع و طاعت کی زیادہ سے زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اور ناگوار حالات برداشت کر لینے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔ اور امام ڈھال کی طرح ہوتا ہے جس کے پیچھے جنگ لڑی جاتی ہے۔ اور اس سے پناہ لی جاتی ہے پس اگر وہ اللہ سے ڈرنے کا حکم دے اور عدل و انصاف کرے تو اس کا ثواب ملے گا، اور اگر اس کے خلاف کرے گا تو گناہ گار ہوگا![۲۸]

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حاکم کی سنو، اور مانو، خواہ تم پر کوئی ایسا حاکم بنا دیا جائے جس کا سر خشک انگور یا کشمش کی طرح ہو!"[۳۰]

ساتھ ہی ساتھ احتساب کی اجازت بھی فرمائی۔ حضرت انسؓ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم!

لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کرنا تو ممکن ہے لیکن ظالم کی مدد ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا: "اس کا ہاتھ پکڑ لو!"[۳۱]

یعنی ظالم کو ظلم سے روکنا، درحقیقت اس کی مدد کرنا ہے!

حضرت علیؓ کا ارشاد: جماعت اور جمعیت سے رشتہ قائم رکھنے کی تاکید خلفاء راشدین بھی کرتے رہے، حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

"تم عذاب الٰہی سے اگر بچنا چاہتے ہو تو ہر شر کے پرچم اور فتنوں کے نشان نہ بن جانا، اس قانون پر ہمیشہ استوار رہنا جس پر نظام جماعت مبنی ہے، اور پابند طاعت و بندگی قائم رہنا خدا کے حضور میں سرکش بن کر پہنچنا۔ ستم گر بن کر نہیں، شیطان کے راستوں اور ظلم و ستم کی منزلوں سے دور رہنا، لقمہ ہائے حرام کو اپنے شکم میں داخل نہ ہونے دینا۔"[۳۲]

حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا جوا اتار دیا۔"[۳۳]

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوگی، لہٰذا تم جماعت سے وابستہ رہو، کیونکہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"[۳۴]

معزولی اور دوسری عہدی: خلافت کے شروط معتبرہ میں سے جو شخص متفق علیہ

شرائط کو پورا کرتا ہو، وہ کبھی اس وقت تک مستحق اطاعت نہ ہوگا، جب تک اہل حل وعقد اس کی بیعت نہ کرلیں، جنھیں امت نے صاحب عدالت، اہل علم ورائے سمجھ کر اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔

امام بیعت، امام استخلاف نہیں: بعض علماء کا خیال ہے کہ جس طرح امام، امام بیعت ہوتا ہے، اسی طرح امام، امام استخلاف و ولایت عہد بھی ہوتا ہے یعنی جس طرح اس کے تمام احکام واجب التعمیل ہوتے ہیں، اسی طرح اپنی جانشینی کے سلسلہ میں جسے اپنا خلیفہ یا ولی عہد وہ بنا دے، اس کی تعمیل بھی کرنی چاہیے، لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں، اس لیے کہ خلیفہ نے اپنے بعد کے لیے جو خلیفہ بنایا ہو، یا جسے ولی عہد مقرر کیا ہو، اگر اہل حل وعقد اس کی تائید نہ کریں تو وہ ہرگز امام اور خلیفہ نہیں بن سکتا۔ اور نہ اس کی بیعت جائز ہے، نہ کہ استخلاف اور ولایت عہد، اگر مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو بہتر پایا اور ان کی بیعت کرلی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوا۔ باقی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عمرؓ کو اپنا ولی عہد بنانا، مسلمانوں کے لیے کوئی حجت یا دلیل یا حکم واجب الاطاعت نہیں تھا، اسی طرح استخلاف عمرؓ کے بارے میں مسلمانوں کو حق تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کی بیعت کرلیتے جو ان لوگوں میں حق تھا جنھیں خلافت کے لیے حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا، لہٰذا استخلاف اور ولایت عہد، سلف کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے، جو خلف کے لیے واجب اور ضروری ہو کہ اس کے بعد بھی امت کو پورا پورا اختیار رہتا ہے، اور اسی کا قول قول فیصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا امام اور خلیفہ بنالے جس طرح امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی خلیفہ یا امام کو دیکھے کہ وہ راہ صواب سے ہٹ رہا ہے۔ معزول اور برطرف کردے۔

لہٰذا خلیفہ کے تقرر کے بارے میں اصل رائے اہل حل وعقد کی ہے کہ

فرد واحد کی نہیں ہے، خواہ وہ کوئی ہو۔[۳۱]

خوارج نے "الائمۃ من قریش" کو کبھی نہیں مانا:

"پہلے وہ ہر آزاد عرب کو اس منصب کا مستحق قرار دیتے تھے، بعد میں انھوں نے ہر مسلمان کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا، خواہ وہ عربی ہو یا عجمی۔ البتہ اس کا عادل ہونا ضروری تھا۔

شاید اس کا سبب یہ تھا کہ خوارج کے ساتھ غیر عرب بھی ان کا جمہوری رجحان دیکھ کر شریک ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس اصول میں لچک پیدا کی، اور ہر مسلمان کے لیے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام رہ چکا ہو، یہ حق تسلیم کر لیا۔[۳۲]

خوارج کا نظریہ جماعت کی انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور عزل و خروج سے متعلق ان کا نظریہ تھا:

"خوارج کے نظریہ کے مطابق بیعت کے بعد خلیفہ کا معزول کرنا جائز نہ تھا لیکن اگر خلیفہ ظلم کا مرتکب ہو تو اس کا عزل یا بتقاضائے ضرورت قتل کرنا جائز تھا۔ بعد کو خوارج نے اپنی شرط اولیٰ میں ترمیم کی۔ عربیت و حریت کی جگہ صرف اسلام و عدالت کی شرط کو ضروری قرار دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب کثرت سے عجمی مسلمان ان کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر انھوں نے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، خلافت میں برابر کا حق دار قرار دیا۔[۳۳]

حضرت عمرو بن العاص بھی ان لوگوں میں تھے، جو اگرچہ بعد میں قصاص عثمانؓ کے مدعیوں کے ساتھ ہو گئے لیکن شروع میں مخالفین عثمانؓ کے ساتھ تھے۔ اور عزل عثمانؓ کے مؤید تھے جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے۔

عمرو بن العاصؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا۔

آپ کے طرز عمل نے لوگوں کو دیانت کے ساتھ احتجاج پر اکسایا ہے۔

اس صورت حال کا مداوا صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو عدل و انصاف سے کام لیجیے، ورنہ پھر مسندِ خلافت خالی کر دیجیے، اور اگر ان میں سے کوئی بات منظور نہیں تو آپ جانیں، آپ کا کام۔

امام ابوحنیفہؒ ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے اس خلافت کو، جو منہاج خلافت راشدہ سے جدا ہو، نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ جب کبھی اس کے خلاف کوئی صالح تحریک عالمِ وجود میں آئی تو اس کی علی الاعلان تائید کی۔ امام زید نے جب خروج کیا تو انھوں نے اسے "جنگ بدر" سے مشابہ قرار دیا۔ امام صاحب ان اکابر میں تھے، جو خلیفہ اور امام کو بیت المال اور بیت المال کے پیمانے سے ناپتے تھے، یعنی اگر خلیفہ یا امام بیت المال میں غلط قسم کا تصرف نہیں کرتا، اسے فلاح امت پر خرچ کرتا ہے، اور خود قوت لایموت پر کفایت کرتا ہے اور ظلم و جور کو اپنا شعار نہیں بناتا تو وہ سمع و طاعت کا مستحق ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا، ظلم کرتا ہے، اور بیت المال کی رقم ناجائز طور پر صرف کرتا ہے تو اس کی بیعت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور وہ خلیفہ نہیں رہتا[۳۸] بلکہ خوارج تو اس کے بھی قائل ہیں کہ ایسے خلیفہ کے خلاف مسلح بغاوت کی جا سکتی ہے[۳۹]۔ خوارج کا مسلک یہ ہے:

"قتل عثمانؓ نے اس جماعت کو ایک نیا مسلک بہم پہنچایا، جو سیاست و حکومت سے تعلق رکھتا تھا، یعنی یہ کہ اگر خلیفہ وقت جماعت کی رائے سے انحراف کرے۔ اپنے منصب سے دست بردار نہ ہو، بلکہ اصرار کرے کہ وہ اپنی مسند پر قائم رہے گا۔ عامۂ مسلمین اس کی سیاست کو ناپسند کرتے ہوں تو بھی وہ ان سے بے پرواہ رہے۔ عوام اس کی خلافت و حکومت کو ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوں، پھر بھی وہ اپنی جگہ پر قائم رہے تو ایسی صورت اسے قتل کیا جا سکتا ہے[۴۰]۔"

خروج کی تائید و حمایت کب؟ امام اعظمؒ ابوحنیفہ کو ہم دیکھتے

ہیں کہ انھوں نے نفس زکیہ اور نفس رضیہ کے خروج کے موقع پر خلیفہ منصور کی سطوت و جبروت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر علی الاعلان اور بر سرِ عام ان کی تائید کی، انھیں امام حق قرار دیا، ان کا ساتھ دیا، پھر لوگوں کو اکسایا، بلکہ اس خروج میں شرکت کی؛ ایسے حج سے پچاس گنا زیادہ افضل خیال فرماتے تھے جو نفل کے طور پر کیا جا رہا ہو[۴۱]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قید کیے گئے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

امام مالکؒ اس باب میں امام ابو حنیفہؒ سے بھی آگے تھے، ان کے نزدیک خلیفۂ وقت کی بیعت اصل بیعت ہی نہیں تھی، جبری بیعت تھی اور انھوں نے طلاق جبری اور بیعت جبری کے خلاف فتویٰ دے دیا جس کی سزا یہ ملی کہ انھیں کوڑے مارے گئے اور تشہیر کرائی گئی۔ اس حالت میں بھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکل رہے تھے وہ یہ تھے:

"جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالکؒ بن انس فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری ناجائز اور بے اثر ہے!"[۴۲]

اموی اور عباسیوں کے خلاف شورش اور خروج و بغاوت کی تحریکوں کا سلسلہ غیر منقطع طور پر جاری رہا، لیکن اس دور کی سب سے زیادہ شوخ اور غیر اور ناقابل فراموش تحریک وہ تھی جو کربلا میں اختتام پذیر ہوئی۔ واقعۂ کربلا: اس خروج کو غیر معمولی اور یادگار حیثیت اس لیے حاصل ہوئی کہ وقت کی منظم، محکم اور مستحکم حکومت سے جس شخص نے ٹکر لی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ تھا، فاطمۃ الزہرا کا لختِ جگر، علی مرتضیٰ کا فرزند ارجمند اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور عین جس کے لیے آپ نے "سردارِ جوانانِ جنت" فرمایا تھا، اور عبداللہ رضؓ کی روایت کے مطابق ان دونوں بھائیوں کو "ریحانتای من الدنیا" یعنی میرے پھول دنیا کے فرمایا تھا[۴۳]۔ اور جن لوگوں نے اسے اور اس کے مختصر سے کنبے کو انتہائی

شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ قتل کیا، وہ کافر اور مشرک نہ تھے۔ خود کلمہ گو اور اسلام کے مدعی تھے۔

دیکھنا چاہیے کہ اس تحریک کی بنیاد کیا تھی؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یزید کی حکومت درست نہ تھی، اس کی بنیاد جبری بیعت پر تھی[۴۳] اور ابھی تو یہ امام مالک کا فتویٰ مذکور ہو چکا ہے کہ جبری بیعت، جبری طلاق اور جبری یمین کی شرعاً کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کے خلاف جس کی خلافت شرعاً نادرست ہو، اگر کوئی شخص یا گروہ صف آرا ہوتا ہے تو اسے باغی نہیں کہہ سکتے۔ "باغی" تو اس کو کہیں گے جو ایک جائز حکومت کے خلاف صف آرا ہو۔

ماوردی، تفتازانی اور ابن حجر کے افکار: دوسری یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیے کہ شخصی اور ذاتی طور پر یزید ان شرائط کو پورا نہیں کرتا تھا جو ایک خلیفہ کے لیے ضروری ہیں۔ جن کا ذکر ماوردی نے اپنی کتاب "احکام السلطانیہ" میں کیا ہے، اور جن کا ذکر اپنے موقع پر کیا جا چکا ہے۔ اس کی سیرت اور کردار کو مؤرخین کے کسی گروہ نے بھی نہیں سراہا، بلکہ اسے موردِ طعن و قدح قرار دیا، اور یہی وجہ ہے کہ اسے اور امیر معاویہؓ کو خلیفہ برحق کسی نے بھی نہیں مانا ہے، البتہ ملک اور سلطان ضرور تسلیم کیا ہے۔ شرح عقائد میں علامہ تفتازانی نے لکھا ہے:

"فبعاویۃ ومن بعدہٗ ملوک" یعنی معاویہ اور ان کے بعد کے حکمران نہیں بادشاہ اور امراء تھے۔

علامہ ابن حجر نے فتح الباری، شرح صحیح بخاری میں تحریر فرمایا ہے:

"واما معاویۃ ومن بعدہٗ" یعنی معاویہ اور ان کے بعد کے حکمران

فعلی طریقۃ الملوک ولو سمّوا الخلفاء — جس راستے پر چلے وہ بادشاہوں کا راستہ تھا۔ اگرچہ انھیں خلیفہ کہا جاتا رہا ہو۔"

ابن خلدون کی رائے : ابن خلدون امویوں کے زیر بارِ احسان تھے، ان کے ممنونِ کرم تھے، ان کی تائید و حمایت میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے ان کی ساری زندگی امویوں کے زیر سایہ گذری، اور یہ اثر اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہے، لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں :

"معاویہ نے افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا، تاکہ مسلمانوں کی بیعت قائم رہے۔"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصریحات : ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصر) نے یزید کے کردار اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :

"یزید اپنے دادا ابوسفیان کی ہو بہو تصویر تھا۔ وہ ہر چیز کو عصبیت کی نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔ یزید ہی وہ شخص تھا جس کی بدولت حرہ (واقعہ مدینہ منورہ) کا سانحہ پیش آیا، جس میں قریش (بنو امیہ) نے چن چن کر ان ہی انصار سے بدلہ لیا، جنھوں نے جنگِ بدر میں ان کے خلاف داد شجاعت دی تھی۔ اسی واقعہ میں اسّی کے قریب وہ انصار قتل کیے گئے، جنھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی، یعنی جنھوں نے اس جنگ کے موقع پر قریش (بنو امیہ) کو شکست دی اور انھیں نیچا دکھایا تھا۔"

یزید کے بارے میں اہل مدینہ کا جو وفد تحقیق احوال کے لیے گیا تھا اس کے سربراہ ایک بزرگ شخص عبداللہ بن حنظلہ انصاری تھے، ان کے ساتھ ان کے آٹھ بیٹے بھی تھے۔ یزید نے وفد کی شاندار طریقے سے پذیرائی کی اور انعام و اکرام سے نوازا، تاکہ یہ لوگ مدینے واپس جا کر اس کے گن گائیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اہل وفد نے واپس آکر بیان کیا :

"ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں ہے۔

وہ شراب پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، مغنّی و مطرب اس کے پاس بیٹھے گاتے بجاتے رہتے ہیں، وہ کتوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ رات میں اس کے پاس اخلاق باختہ لوگ آکر مجلس آرائی کرتے ہیں!"

رئیس وفد عبداللہ بن حنظلہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

"خدا کی قسم! یزید شراب پیتا ہے، بخدا وہ اتنا متوالا ہوجاتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے[۴۵]"

ابن خلدون نے لکھا ہے:

"جب یزید میں فسق و فجور پیدا ہوگیا تو صحابہ اس کے بارے میں مختلف الرائے ہوگئے۔ بعض نے اس کے خلاف صف آرا ہونا ضروری خیال کیا، جیسے حسینؓ اور عبداللہؓ بن زبیرؓ۔ بعض اس لیے خاموش بیٹھے رہے کہ ابھی کشت و خون اور فتنہ و فساد سے گریزاں تھے[۴۶]"

یہ حالات تھے جب حضرت حسینؓ نے یزید کے خلاف صف آرا ہونے کا فیصلہ کیا۔

ظاہر ہے، اس فیصلے میں کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں تھی، نہ حب جاہ و اقتدار کا جذبہ کارفرما تھا، یہ بات ہوتی تو وہ امیر معاویہؓ کے خلاف بھی صف آرا ہوتے لیکن چونکہ امیر معاویہؓ سے معاہدہ ہوچکا تھا اور از روئے معاہدہ انھیں یقین تھا کہ وہ یزید کو ولی عہد نہیں بنائیں گے، اس لیے اس دور کی بعض غیر شرعی باتوں کو انھوں نے گوارا کرلیا، لیکن جب یزید کی جبری ولی عہدی عمل میں آگئی اور یزید خلیفہ بن گیا، اور اسلامی اصول نظر انداز کیے جانے لگے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنی بڑی قوت سے وہ عہدہ برآ نہیں ہوسکیں گے۔ انھوں نے دین کی حرمت پر زندگی قربان کردینے کا فیصلہ کرلیا۔

امام حسینؓ کی تقریر سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

یہ سبطِ رسولؐ تاج و تخت کا جویا نہیں تھا، مال و دولت کا طلب گار نہیں تھا، اسلامی حکومت کا

علمبردار تھا۔ دینِ محمدیؐ کے اصولوں اور قدروں کو مٹتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے کربلا کی طرف جاتے ہوئے بیضہ کے مقام پر ایک خطبہ دیا اور اور اس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا، اس نے کہا:

لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے کسی ظالم، محرمات الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کا عہد توڑنے والے، احکامِ خدا اور رسولؐ کی مخالفت کرنے والے، خدا کے بندوں پر زیادتی کرنے والے بادشاہ کو دیکھا، اور قولاً و فعلاً اس پر غیرت نہ آئی، تو خدا کو حق ہے کہ اس شخص کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے۔

لوگو! خبردار ہو جاؤ۔

ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی، اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدودِ الٰہی کو معطل کر دیا ہے۔ مالِ غنیمت میں اپنا حصہ بڑھا لیا ہے، خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے، اس لیے مجھے غیرت آنے کا حق ہے!

اور بالآخر وہ حادثۂ عظیم — شہادتِ حسینؓ — رونما ہو گیا۔

چشمِ فلک نے ایک نبیؐ کے نواسے کو، اسی نبیؐ کے امتیوں کے ہاتھوں ہر اس احیاءِ دین کے جرم میں قتل ہوتے، کاہے کو کبھی اس سے پہلے دیکھا ہوگا؟

"یہ ایسا حادثہ تھا، جس پر شجر و حجر اور زمین و آسمان تا قیامت خون کے آنسو روئیں گے۔ وجلہ بہ دجلہ: نیم بہ نیم!"

یزید کی مدتِ حکومت چار سال سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد خاندان بوسفیان کا خاتمہ ہو گیا، کیونکہ یزید کا بیٹا معاویہ بن یزید یہ ہولناک مناظر دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی دست برداری اختیار کر لی، اور خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہا۔ اور کچھ عرصے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مروان نے یزید کی بیوی سے نکاح کیا، اور تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا اس طرح حکومت سفیان کے خاندان سے مروان کے خاندان میں منتقل ہو گئی، اور عبدالملک بن مروان وغیرہ نے جو کچھ کیا، وہ تاریخ کے کس طالب علم یا مطالعہ کرنے والے کو نہیں معلوم؟

عمر بن عبدالعزیز کا استعفا اپنی خلافت کے لیے: اسی خاندان کے ایک فرد عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کا دورِ خلافت درحقیقت بالواسطہ طور پر ان تمام سنگین اور شنیع الزامات کی تصدیق تھا جو اس خاندان کے ملوک و سلاطین پر مؤرخوں کی طرف سے لگائے جا رہے تھے۔

عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:

"خدا نے جو چیز حرام کر دی، وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے، جو حلال کر دی وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے۔ میں صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں، کسی کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔"

عمرؓ بن عبدالعزیز نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ "چونکہ میری نامزدگی اور بیعت مشورے سے عام رائے میں نہیں ہوئی ہے، میں بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، جسے چاہو، اپنا خلیفہ منتخب کر لو!"

اتنے دنوں کے بعد، ایسا باخدا اور خدا ترس خلیفہ میسر آیا تھا کون خلع بیعت پر آمادہ ہوتا، سب نے تجدید بیعت کر لی، گویا شورائے عام کے بعد انھوں نے زمامِ کار سنبھالی۔

غرض جب رائے عامہ کی توثیق حاصل کر لی، اور اپنے آپ کو امارت و خلافت کا مستحق بنا لیا، تب وہ انقلاب انگیز قدم اٹھایا جو بنو امیہ کے قصرِ امارت کے لیے زلزلہ فگن ثابت ہوا۔

اموالِ مغصوبہ اور جاگیرات کی ضبطی: اس خاندان کے لوگوں کے پاس

بہت سی جاگیریں تھیں، جو اموالِ مغصوبہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان جاگیروں کو ضبط کر لیا، خود اپنی جاگیر بھی حکومت کو واپس کر دی، لوگوں نے پوچھا:

"آپ کی اولاد کا کیا ہوگا؟"

فرمایا: "وہ خدا کے حوالے ہیں"[۳۱]۔

اس کے بعد تمام مسلمانوں کے سامنے مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اموی خلفاء نے ہم خاندان والوں کو جاگیریں بخشیں۔ خدا کی قسم نہ وہ دینے کے مستحق تھے نہ ہم لینے کے، اب میں ان جاگیرداروں کو واپس کرتا ہوں اور آغاز اپنی جاگیر سے کرتا ہوں!"۔

اس کے بعد جاگیروں کے پروانے منگائے، قینچی لی اور انھیں کاٹ کاٹ کر پھینکنا شروع کر دیا[۳۲]۔

عبدالملک کی بیٹی، فاطمہ آپؒ کی بیوی تھیں۔ ان کا بیش قیمت ہار بھی بیت المال میں داخل کر دیا[۳۳]۔

باغِ فدک کو عبدالملک نے اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ وہ بھی واپس کیا گیا[۳۴]۔

تمام مالِ مغصوبہ واپس کر دیا۔ عراق میں حکومت کو اتنا زیادہ مال واپس کرنا پڑا کہ اخراجات کے لیے مرکز سے روپیہ روانہ کرنا[۳۵]۔ اپنا سارا ذاتی سامان بھی جو جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کی صورت میں تھا، بیت المال کو واپس کر دیا[۳۶]۔

حجاج بن یوسف نے نومسلموں سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے یہ رسم فوراً بند کر دی۔ چنانچہ مصر میں اس کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، کہ جزیہ کی آمدنی میں نمایاں کمی ہو گئی۔

عامل نے لکھا۔ "اب کیا کریں؟"

جواب دیا: "نومسلموں سے جزیہ تو کسی صورت میں بھی نہیں لیا جا سکتا رسول اللہ کو ہادی بنا کر خدا نے بھیجا تھا عامل بنا کر نہیں"[۳۷]۔

اس کے علاوہ آپؐ نے گورنروں اور حاکموں کو تاکید کی کہ جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے[۳۸]۔

ظاہر ہے ایسی حکومت کے خلاف خروج و بغاوت عند اللہ بھی جرم قرار پائے گا اور عند الناس بھی!

ماخذ:

۱ سورہ مائدہ، رکوع ۱، آیت ۳ ۲ طبری ج ۱، ص ۳۵

۳ سورۂ نساء، آیت ۵۹۔ ۴ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی عن ابن عمرؓ۔

۵ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (طبع مصر) ص ۱۸۰

۶ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۲۔

۷ طبری، ابن اثیر، مسعودی، کنز العمال، یعقوبی، ابن خلدون اور دوسری تمام کتابوں میں یہ خطبہ مذکور ہے۔

۸ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۲۹، ۹ نسائی کتاب البیعۃ

۱۰ کتاب الخراج، (امام ابو یوسفؒ) طبع مصر، ۱۱ مراد خوارج ہیں

۱۲ مراد امیر معاویہ اور ان کے اصحاب ہیں، ۱۳ شرح نہج البلاغۃ از محمد عبدہٗ طبع مصر ص ۲۷

۱۴ شرح و ترجمہ فارسی از علامہ فیض الاسلام، سید علی نقی، مطبعۂ تہران ص ۱۳۲۔

۱۵ الفتنۃ الکبریٰ — عثمانؓ (طٰہٰ حسین) طبع مصر۔

۱۶ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہیدؒ)

۱۷ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۲، ص ۲۴)

۱۸ الفتنۃ الکبریٰ — عثمانؓ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر)

۱۹ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۳۴، ۳۵۔

۲۰ سورۂ آل عمران، پارہ ۳، رکوع ۴، آیت ۳۴۔

۲۱ سورۂ نور، پارہ ۱۸، رکوع ۷، آیت ۵۵۔

۲۲ سورہ حجرات، پارہ ۲۶، رکوع ۷، آیت ۵۵۔

۲۳ سورۂ انفال، پارہ ۹، رکوع ۱، آیت ۲، ۲۴ سورۂ آل عمران، پارہ ۳۔

۲۵ سورۂ انفال، پارہ ۹، رکوع ۶، آیت ۴۷؛ نیز سورہ مجادلہ رکوع ۲، آیت ۱۴۔

۲۶ سورۂ نور، پارہ ۱۸، رکوع ۷، آیت ۵۷،

۲۷ سورۂ مائدہ، پارہ ۶، رکوع ۱۲، آیت ۹۳، نیز سورۂ تغابن رکوع ۲، آیت ۱۳

۲۸ سورۂ نساء پارہ ۴، رکوع ۸، آیت ۱۰،

۲۹ باب الدنیا الی الاسلام، (صحیح بخاری) عن ابی ہریرۃ

۳۰ باب الایمان (صحیح بخاری) عن انس بن مالک۔

۳۱ کتاب النکاح (صحیح بخاری) عن انس بن مالک۔

۳۲ نہج البلاغۃ (تہذیب علامہ عبدہٗ) طبع مصر، ص ۱۰۴۷۔

۳۳ سنن ابی داؤد عن ابی ذر غفاری رض ۳۴ جامع کبیر عن عبداللہ بن عمر رض

۳۵ سیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ۱۴۲، ۱۴۳

۳۶ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۱۹۲،

۳۷ نظم سلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۸ – ۴۹)

۳۸ مناقب امام اعظم ابی حنیفہ، ص ۱۰، ج ۲۔ (الموفق المکی)

۳۹ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۸۱)

۴۰ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۵۸، ۵۹،

۴۱ الیافعی الشافعی، ج ۱، ص ۳۰۰ ۴۲ طبقات ابن سعد (سوانح مالک)

۴۳ صحیح بخاری، مناقب قرابۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۴۴ کامل (ابن اثیر) ج ۳، ص ۲۲۰ — ۲۲۱،

۴۵ ادب جاہلی (ڈاکٹر طٰہٰ حسین، شائع کردہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ص ۲۰۷، ۲۰۸

۴۶ تاریخ الکامل لابن اثیر، ج ۴، ص ۲۲۵۔

۴۷ تاریخ ابن خلدون، ج ۱، ص ۷۷، ۴۸ الطبری، ج ۴، ص ۴۰-۴۵

۴۹ سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن الجوزی) ص ۱۰۸

۵۰ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۵۲۔

۵۱ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۲۳۳

۵۲ ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ۔

۵۳ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۵۲،

۵۴ تہذیب الاسماء، ج ۱، ص ۱۱۔

۵۵ المقریزی، طبع مصر، ج ۲، ص ۴۰۵۔

۵۶ طبقات ابن سعد، ج ۴، ص ۱۳۵۔

(۶)

سربراہِ مملکت

مشرق ہو یا مغرب، جنوب ہو یا شمال، جمہوریت کا چلن ہر کہیں جاری و ساری ہے اور ہر جگہ جمہوریت کو بادشاہت سے زیادہ فروغ و استحکام بخشنے کا عمل بھی جاری ہے۔ یقیناً یہ ایک مبارک اور نیک اقدام ہے اور بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ فروغ و استحکام کے اس سلسلے میں مزید ترقی ہوگی۔

صدرِ مملکت کی ذات اور شخصیت: ہر جمہوریت کا ایک صدرِ مملکت ہوتا ہے۔ اس موقع پر صدر کے حدود و اختیارات سے بحث نہیں گفتگو صرف بہ حیثیت صدر اس کی ذات اور شخصیت سے ہے۔

روس کی شورائیت، فرانس اور برطانیہ کی محدود، امریکہ کی لامحدود آزادی، امریکہ کی لامحدود تر، ایشیا اور افریقہ کی تمل پسند اور وسعت پذیر جمہوریت کے سربراہِ مملکت پر ایک نظر ڈالیے۔ یہ منصب کسی سربراہ کو موروثی طور پر نہیں ملتا۔ انتخاب کے ذریعے ووٹ کی سیڑھی چڑھ کر وہ اس بامِ بلند تک پہنچتا ہے اور پہنچتے ہی بند بام ہو جاتا ہے۔ سربراہِ مملکت بننے سے پہلے اس کی حیثیت کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو، لیکن قصرِ صدارت میں داخلے کے بعد اس میں اور بہت سے سلاطین والا شان کے کروفر، جاہ و جلال اور رعب داب میں کوئی مابہ الامتیاز باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے پاس باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ اس کے تصرف میں بے حد و نہایت دولت ہوتی ہے وہ گراں قدر مشاہرہ پاتا ہے، جو ہر طرح کے محاصل سے بنتی ہوتا ہے، اس کی تنخواہ خزانے میں جمع

ہوتی رہتی ہے اور اس کے جملہ مصارف حکومت کے خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ انعام دے سکتا ہے۔ لطف و عنایت کی بارش کر سکتا ہے، تحفے اور خطاب عطا کر سکتا ہے۔ ریل پر سفر کرتا ہے تو اسپیشل ٹرین اس کے لیے جاری ہوتی ہے، موٹر پر نکلتا ہے تو دور دور تک سڑک خس و خاشاک یعنی رہروؤں سے پاک کر دی جاتی ہے۔ وہ کسی مجمع میں جلوہ فرما ہوتا ہے تو اس کی آمد سے پہلے لاکھوں روپے صرف کر کے استقبال کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اس کے خیر مقدم کو بے شمار لوگ حاضر کیے جاتے ہیں، اور وہ دو صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سفرا کو باریاب کرتا ہے۔ انھیں بیش قیمت تحفے تحائف دیتا ہے۔ سلیتے ہیں انھیں رخصت کرتا ہے اور ان کی دعوت میں طرح طرح کے الوانِ نعمت دسترخوان پر چن کر دیئے جاتے ہیں، انھیں بیروشکار کی دعوت دیتا ہے اور اس ادائے مہمان نوازی پر بھی بے اندازہ روپیہ صرف ہو جاتا ہے، غرض جب تک وہ اس منصب پر فائز ہے، اس میں اور ایک بادشاہ ذی جاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ بادشاہ ان کے پیٹ سے تاجِ خسروی پہن کر نمودار ہوتا ہے اور اس کے سر پر تاجِ ہمایونی رکھنے والے لوگ قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ورنہ عملاً اس میں اور ایک شاہ حشمت مآب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سربراہِ مملکت اپنی قوم کا اپنے ملک کا سب سے اہم فرد ہوتا ہے، اس کی زندگی اور طرزِ رہائش میں اگر شان و شوکت کا جلوہ نہ ہو تو وہ اب حکومت میں فرق آتا ہے۔ اس کی وقعت کم ہوتی ہے، اور اس کی وقعت کم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی، ملک کی اور قوم کی سبکی ہوتی ہے۔

اسلامی جمہوریت کا صدر اور اس کے خصائص، سربراہِ مملکت کے طرزِ ماندوبود اور اس کی ذات والا صفات کے ٹھاٹھ اور تجمل کے بارے میں

جو "اختیار" پیش کیا جاتا ہے ممکن ہے وہ اپنی جگہ وزن رکھتا ہو اور بالکل بجا اور درست ہو۔ اس کی مدح و قدح سے متعلق کچھ عرض کرنا مقصود نہیں، گفتگو کا موضوع تو یہ ہے کہ "اسلامی جمہوریت" میں صدرِ مملکت کی ذات اور شخصیت کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس کا طرزِ رہائش کیا ہوتا ہے؟ اس کے مصارف کے مدات کیا ہوتے ہیں؟ اور ان پر کس طرح عمل درآمد کیا جاتا ہے؟ آیا وہ بھی مذکورہ بالا حقوق و مراعات سے بہرہ یاب ہے کہ نہیں؟ آیا اسے بھی اپنی منصبی حیثیت میں بے تحاشہ خرچ کرنے اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے کا اختیار ہے کہ نہیں؟ آیا اپنے منصب پر فائز رہنے کے دوران میں یعنی وقتی اور عارضی طور پر وہ شاہانہ زندگی بسر کر سکتا ہے کہ نہیں؟

آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کا نمونہ: صرف منطق اور فکر اور نظریے کے مقابلے میں حقائق و واقعات اور مشاہدات زیادہ کارگر اور مستند ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ گرامی کو پیش کریں گے کہ آپؐ دوگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ نبی برحق بھی سربراہِ مملکت بھی۔ آپؐ جس طرح کی زندگی چاہتے بسر کر سکتے تھے۔ کسی کو یارائے دم زدن نہ تھا۔ ایک سربراہِ مملکت پر تو اعتراض کیا جا سکتا ہے اور قانون پاس کر کے یا دوسرے ذرائع سے قدغن لگائی جا سکتی ہے لیکن ایک نبیؐ کی حیثیت ان سب چیزوں سے بالا ہوتی ہے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہو سکتی، نہ اس کا احتساب کیا جا سکتا ہے نہ اس پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اور

گفتۂ او، گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اس باب خاص میں ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے؟

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کے فرزند و زن ہوتے ہیں، وہ خود تکلیف اٹھا سکتا ہے مگر اپنے اہل و عیال کی تکالیف برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ خود دکھ جھیل

سکتا ہے لیکن اپنی آل و اولاد کو دکھ جھیلتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر اسے اختیارات وسیع ہوں، اس کے قبضے اور تصرف میں خزانۂ عامرہ ہو وہ غیر مسئول طور پر خرچ اور تصرف کے باب میں آزاد ہو، اور اسباب تنعم فراوانی کے ساتھ اسے حاصل ہوں تو زیادہ سے زیادہ جس پر وہ خرچ کرتا ہے وہ اس کی اولاد ہوتی ہے، خود بھی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے بہیتوں کو اپنے سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کراتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہونے کے باوجود "بشر" بھی تھے اور آپ کو اپنے اہل و عیال سے غیر معمولی اُلفت اور محبت بھی تھی۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کے ساتھ آپؐ کو جو محبت تھی، اس سے تاریخ و سیر اور حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح ازواج مطہرات سے بھی آپؐ کو گہرا لگاؤ تھا، ان کی خاطر اور دل جوئی میں کوئی دقیقہ آپؐ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، اور جو حدود آپؐ نے مقرر کر لیے تھے، ان کے اندر رہتے ہوئے انھیں زیادہ سے زیادہ سکھ اور آرام پہنچانے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔

الفقر فخری: عسرو فقر یعنی مکہ مکرمہ کی پُرفتن زندگی اور مدینہ منورہ کے عالم مہاجرت میں ازواج مطہرات نے بڑی استقامت اور عزم و ثبات کے ساتھ تمام تکلیفیں برداشت کیں، فاقے کیے، تنگدستی کے شب و روز خاموشی کے ساتھ بسر کیے، گو شرعاً گندم جو اس طرح کی دوسری چیزوں سے تو کوئی سروکار نہ رکھا، کبھی روکھی سوکھی کھا لی اور کبھی بھوکے پیٹ گزارہ کر لیا۔

لیکن جب حالات بدلے، خوش حالی اور فتوحات کا دور شروع ہوا، مال غنیمت بہ افراط اور بکثرت آنے لگا تو قدرتاً ان کے دل میں خیال پیدا ہوا، جب خوش حالی کا دور شروع ہو چکا ہے تو ہم بھی اس سے کیوں نہ بہرہ ور ہوں؟ اب کیوں فاقے کریں؟ اب کیوں روکھی سوکھی کھائیں؟ اب کیوں پیوند لگے اور پرانے کپڑے پہنیں؟ اب کیوں نہ خادموں اور چاکروں، خدمتگاروں اور باندیوں سے کام لیں؟ یہ کوئی غلط جذبہ نہ تھا، تقاضائے بشریت کے عین مطابق تھا، لیکن جب ہی آپؐ نے

"الفقر فخری" کہہ کر فقر پر فخر کا اظہار فرمایا تھا، وہ اپنی زندگی میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے پر تیار نہیں تھا۔ حضرت فاطمہ رضؓ آپؐ کی چہیتی بیٹی تھیں، جب آتیں آپؐ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے، انھیں بٹھا کر بیٹھتے، لیکن انہی حضرت فاطمہ رضؓ کے ہاتھ میں جب چکی پیستے پیستے گھٹے پڑ گئے تو ایک روز حاضر ہوئیں، شرم سے کچھ نہ کہہ سکیں، حضرت علی رضؓ نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک باندی کی استدعا کی۔ آپؐ نے یہ استدعا منظور نہیں کی، ایک دعا بتا دی اور رخصت کر دیا۔

اصولاً حضرت فاطمہ رضؓ کی راحت و آسایش کے ذمے دار حضرت علی رضؓ تھے لیکن ازواج مطہرات کا نفقہ اور راحت اور آسایش کا سر و سامان تو آپؐ کے ذمے تھا۔ بدلے ہوئے حالات دیکھ کر انھوں نے بھی توسیعِ نفقہ چاہی اور اس پر اصرار بھی کیا۔ پیش پیش حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ یعنی ابوبکر صدیق رضؓ اور عمر فاروق رضؓ کی صاحبزادیاں تھیں۔

لیکن آپؐ نے ان کا یہ مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ دراصل آپؐ کی حیاتِ فقر و استغنا سے میل نہیں کھاتا تھا، اور جو اسوۂ حسنہ آپؐ اُمت کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، اس سے ہم آہنگ نہ تھا۔

ازواج مطہرات کی طرف سے مطالبہ نے جب اصرار کی صورت اختیار کر لی تو آپؐ نے بظاہر ان سے قطعِ تعلق کر لیا اور حجرہ نشین ہو گئے، جہاں کسی اور کو آنے کی اجازت نہ تھی، اس سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ آپؐ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔

حضرت عمرؓ کی بیان کردہ تفصیل! اس واقعہ کی پوری تفصیل حضرت عمر رضؓ نے اپنے خاص انداز میں بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں:

"اسلام سے پہلے ہمارا سلوک عورتوں سے اچھا نہیں تھا، انھیں کسی طرح کے حقوق حاصل نہ تھے، ہم عورتوں کو بے حقیقت اور ناشے سمجھ کرتے تھے، پھر اسلام آیا اور جب تبارک و تعالیٰ نے حقوقِ نسواں کے متعلق احکام صادر فرمائے، اور ہم

پر اُن کے حقوق قائم کر دیئے۔ اس کے بعد تو بالکل ہی عورتیں تبدیل ہو گئیں اور طلبِ حقوق میں ان کی جرأت بڑھ گئی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی بات پر اپنی عادت کے مطابق میں نے اپنی اہلیہ سے درشت الفاظ میں بات چیت کی۔ بات بڑھی تو انھوں نے بھی آنٹ کر ویسا ہی جواب مجھے دے ڈالا۔ میں نے جھڑکا اور ان سے کہا:

"کچھ ہوش میں ہو؟ میری باتوں کا جواب اس انداز میں دے رہی ہو!"

وہ کہنے لگیں: "تم میں ایسی کون سی بات ہے کہ چپ چاپ سنتی رہوں اور جواب نہ دوں، ذرا اپنی بیٹی پر بھی تو نظر ڈالو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پلٹ کر جواب دیتی ہے، بعض دفعہ تو روٹھ جاتی ہے۔"

یہ سُن کر میں نے دل میں سوچا، یہ تو عجیب ماجرا ہے۔ چنانچہ میں اُٹھا اور سیدھا حفصہؓ کے پاس پہنچا اور ان سے سوال کیا۔

"کیوں بیٹی! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کرتی ہو؟ اور کیا دوسری ازواج بھی ایسا ہی کرتی ہیں؟"

حفصہؓ نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ سچ ہے، ہم یہ کرتے ہیں!"

مجھے غصہ آگیا، میں نے کہا: "تو خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ سے نہیں ڈرتی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے۔ واللہ! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال نہ ہوتا، تو وہ تجھے طلاق دے چکے ہوتے۔ تو اپنی ضرورت مجھ سے بیان کر دیا کر، جو مانگے گی دوں گا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان مت کیا کر!"

حفصہؓ کے پاس سے اُٹھ کر میں ام المؤمنین ام سلمہؓ کی خدمت میں آیا۔ ان سے بھی میں نے وہی کہا جو حفصہؓ سے کہہ آیا تھا۔ میری بات سنتے ہی وہ بول پڑیں۔

"خطاب کے بیٹے تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم ہر معاملے میں دخل دینے لگے ہو۔

اور اب نوبت یہ آپہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے ہو؟"

ام سلمہؓ نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ پھر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ چپ ہو رہا اور واپس چلا آیا۔

اسی زمانے میں میرا ایک انصاری پڑوسی تھا، ہم دونوں باری باری سے ایک ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارا کرتے تھے اور پھر باہم دگر اپنے اپنے واقعات و مشاہدات سنا دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ پر ہر آن یہ کھٹکا لگا رہتا تھا، کہیں دشمن چڑھائی نہ کر دیں۔ خود میں بھی فرمانروائے غسان کی طرف سے فکرمند رہا کرتا تھا۔

ایک شب خلافِ معمول اور خلافِ وقت میرے انصاری پڑوسی نے میرے دروازے پر دستک دی، اور بآوازِ بلند کہا۔ "دروازہ کھولو!"

میں فوراً باہر نکلا اور پوچھا۔ "خیر تو ہے، کیا غسانی مدینے پر حملہ آور ہوئے ہیں؟"

انصاری پڑوسی نے جواب دیا۔ "غسانیوں نے حملہ تو نہیں کیا ہے، مگر ایک سانحہ اس سے بھی بڑھ کر ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے!"

میں نے خیال کیا، یہ سب عائشہؓ اور حفصہؓ کی باتوں کا نتیجہ ہے۔

میں نے لباس تبدیل کیا، اور فوراً دربارِ رسالت میں پہنچا۔ آپ نمازِ فجر کے بعد بالاخانے پر تشریف لے گئے تھے۔ مسجد میں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ دیر تک اس تغیر پر غور کرتے رہے۔ میں صبر نہ کر سکا۔ بالاخانے پر جا کر آپ سے کہا۔

"آنحضرت صلعم کو میری حاضری کی اطلاع دے دو!"

مگر خاموشی کی اجازت نہ ملی۔

کچھ دیر انتظار کے بعد پھر میں نے بلالؓ سے کہا: "آنحضرت صلعم کو میری اطلاع کر دو!"

مگر اس مرتبہ بھی اذن باریابی نہ ملا۔

آخر میرا پیمانہ صبر جھلک پڑا، میں نے بہ آواز بلند کہا۔

"شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہؓ کا سفارشی بن کر آیا ہوں، بخدا! میں تو صرف رضائے رسولؐ کا آرزومند ہوں، اگر ان کا ارشاد ہو تو اپنے ہاتھ سے حفصہؓ کی گردن اڑا دوں!"

اس مرتبہ مجھے اجازت ملی، اور میں بالاخانے پر پہنچا۔ میں نے دیکھا آپؐ ایک کھری چارپائی پر لیٹے ہیں، جسم اطہر پر بانوں کے نشان نظر آ رہے ہیں، ایک طرف تھوڑے سے جَو رکھے ہیں ایک گوشے میں کسی جانور کی کھال لٹکی ہوئی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میں ضبط گریہ پر قادر نہ رہا، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آپؐ نے دریافت فرمایا: "عمرؓ! یہ گریہ کیسا؟"

میں نے عرض کیا۔ "کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے کہ قیصر و کسریٰ عیش اور راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا سے غافل اور بے بہرہ ہیں، اور آپؐ کہ خدا کے نبیؐ اور رسول ہیں، حالت یہ ہے کہ آرام کی کوئی چیز بھی میسر نہیں، کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور بانوں کے نشانات جسم پر صاف نظر آ رہے ہیں؟"

آپؐ نے میری باتیں سن کر فرمایا: "ہاں ٹھیک ہے، مگر کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ کے حصے میں دنیا آئے اور ہمارا حصہ عقبیٰ ہو؟"

میں نے دریافت کیا۔ "کیا آپؐ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے؟"

جواب میں فرمایا: "نہیں"!

جوشِ مسرت سے بے اختیار "اللہ اکبر" کا نعرہ میری زبان سے بلند ہوا۔ پھر میں نے عرض کیا۔

ہم قریشی ہمیشہ عورتوں پر غالب رہے، مگر اب تو رنگ ہی دوسرا ہے۔ یہ

سُن کر آپؐ نے تبسم فرمایا۔ پھر میں نے وہ باتیں دہرائیں، جو حفصہؓ اور ام سلمہؓ سے میں نے کی تھیں۔ یہ سُن کر پھر لب مبارک آشنائے تبسم ہوئے۔

پھر میں نے عرض کیا۔ "مسجد میں لوگ ملول و دلگیر بیٹھے ہیں، اجازت ہو تو انھیں اطلاع دے دوں کہ طلاق کی خبر غلط ہے"!

حضرت عائشہؓ کا جواب: اس کے بعد آیۂ تخییر نازل ہوئی:

"اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے، اگر تم دنیا کی زندگی اور زینت کی طلبگار ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں تمھیں احترام و عزت کے ساتھ رخصت کر دوں، اور اگر اللہ اور رسولؐ کی رضامندی اور آخرت کی طلبگار ہو تو پھر اسی کی ہو رہو، خدا نے تم میں سے نیکوکار عورتوں کے لیے بڑا درجہ رکھا ہے"!

اس کے بعد آپؐ ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لے گئے، اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو کہ بھی اضافۂ نفقہ کے مطالبے میں پیش پیش تھیں، یہ آیۂ مبارک سنائی اور فرمایا۔

"جلدی کی ضرورت نہیں، سوچ سمجھ کر بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دو"۔

حضرت عائشہؓ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ "مشورہ کیسا؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے دو راستے رکھ دیے ہیں ـــ فقر و استغنا، یا عیش و تنعم ـــ تو جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دنیا اور نعائم دنیا کی قدر و قیمت بھلا آپؐ کی رفاقت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے سب کچھ چھوڑا، میں تو اللہ اور رسولؐ اللہ کی محبت ہی کو ترجیح دیتی ہوں"!

دوسری ازواجِ مطہرات نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں۔

یہ تھا اسلامی جمہوریہ کے سربراہ کا اسوۂ حسنہ جو تا قیامِ قیامت سورج کی طرح تابناک اور درخشاں رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ وفات سے ایک دن پہلے:

"آپؐ نے سات درہم ـــــ جو کُل پونجی تھی ـــــ غرباء کو بانٹ دیے، اس روز عائشہ صدیقہ رضؓ نے گھر میں چراغ جلانے کے لیے ایک ہمسائی سے تیل قرض منگوایا تھا۔"

آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس چند صاع جَو کے عوض رکھی ہوئی تھی۔

جس مملکت کو اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے والے اور اس سربراہِ مملکتؐ کی سنت پر عمل پیرا ہونے والے مل جائیں، کیا وہ اب بھی مادی دنیا پر چھا نہیں سکتی؟

جواب دہی عوام کے سامنے بھی خدا کے سامنے بھی حقیقت یہ ہے کہ سربراہِ مملکت کے لیے آپؐ نے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا، اور پھر خلفاء راشدین نے اس پر جس طرح عمل کیا، اس کا جلوہ تاریخ کے کسی دور میں بھی نظر نہیں آتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جمہوریت کا سربراہ نہ صرف عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، بلکہ خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے۔ عوام کی نگاہ سے تو بعض چیزیں چھپ سکتی ہیں، بہت سے کام اور بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو چشمِ مردم سے پنہاں رہتی ہیں، اور رہ سکتی ہیں لیکن خدا سے تو کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ جب کچھ دیکھتا اور جب کچھ سنتا ہے، وہ خبیر ہے، علیم ہے، سمیع ہے، اس سے تو کچھ بھی نہیں چھپا جا سکتا۔ لہٰذا اگر خدا کے سامنے جواب دہی کا واقعی تصور موجود ہو تو غلط کاری کا امکان ہی نہیں۔

رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ: آپؐ کی حالت یہ تھی کہ:

"کبھی آپؐ بستر پر ہوتے، کبھی چمڑے پر، کبھی چٹائی پر، بلکہ زمین پر بھی سو جاتے۔ کبھی چارپائی پر اور کبھی سیاہ کمبل پر آرام فرماتے۔ عباد بن تمیم رضؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں چت لیٹے دیکھا کہ آپؐ نے ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا ہوا تھا اور آپؐ کا بستر چمڑے کا تھا جس میں

کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپؐ کے پاس بالوں کا ایک کمبل تھا، جسے دوسرا کر کے بچھا دیا جاتا۔

حضرت جابرؓ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اونٹ خریدا پھر اس کی قیمت ادا فرمائی اور زیادہ قیمت عطا فرمائی۔ مزید برآں اونٹ بھی واپس کر دیا۔

انصار نے اجازت چاہی کہ عم رسولؐ حضرت عباسؓ سے فدیہ کی رقم نہ لی جائے آپؐ نے فرمایا: "ایک درہم بھی نہ چھوڑو!"

حالانکہ کتب تاریخ و سیر سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ کو اپنے عزیزوں سے بہت زیادہ محبت تھی، گرفتاری کے بعد ان کی کراہ کی آواز سن کر رات بھر نیند نہیں آئی۔ لیکن یہ گوارا نہیں فرمایا کہ عم رسولؐ ہونے کے باعث، وہ فدیہ سے مستثنیٰ کر دیے جائیں۔ اور دوسرے لوگوں سے لے لیا جائے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی کا اظہار حقیقت: مشہور فرنچ مورخ موریس بوکائی آنحضرت صلعم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اظہار عقیدت نہیں کہ وہ مسلمان نہ تھا، بلکہ اظہار حقیقت ہے، وہ لکھتا ہے:

"آپؐ خندہ رو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکر خدا کرنے والے، خوبیوں سے مزین، بیہودہ پن سے نفور، بہترین رائے اور عقل رکھنے والے تھے۔ انصاف کے معاملے میں قریب و بعید، آنحضرتؐ کے نزدیک برابر ہوتا تھا۔ مساکین سے محبت فرمایا کرتے تھے، غرباء میں رہ کر خوش ہوتے اور کسی فقیر کو اس کی تنگدستی کی وجہ سے حقیر نہ سمجھتے تھے، اسی طرح کسی بادشاہ کو بادشاہی کی وجہ سے بڑا نہ جانتے، اپنے پاس بیٹھنے والوں کی تالیف قلوب فرماتے، جاہلوں کی حرکات سے صبر فرمایا کرتے، کسی شخص سے خود خاطب نہ ہوتے جب تک وہ خود نہ چاہتا، صحابہؓ سے کمال محبت فرمایا کرتے، اپنے جوتے کو خود گانٹھ لیتے اور کپڑے کو خود پیوند لگایا کرتے تھے۔"

"بندہ و آقا اور سفید فام و سیاہ رنگ کسی شخص کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہ کرتے، سب سے یکساں خوش روئی اور خوش خلقی کے ساتھ ملاقات فرماتے[۹]"

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں نے دس سال تک آپؐ کی خدمت کی، مگر کبھی آپؐ نے ڈانٹنا تو کجا، کبھی میری غلطی پر اُف تک نہیں کی[۱۰]

ایک مرتبہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، جلالتِ نبویؐ دیکھ کر ہراساں ہو گیا۔

آپؐ نے اس کی دلدہی کرتے ہوئے فرمایا: "کیا میں کوئی بادشاہ ہوں؟ میں تو قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں[۱۱]"

انصار کا اپنے "سربراہِ مملکت" پر اعتراض اور اس کا جواب:

مؤلفۃ القلوب کو یعنی نومسلموں کو آپؐ نے ایک مرتبہ مالِ غنیمت میں بہ نسبت انصار کے زیادہ حصہ دیا، بعض نوجوان انصاریوں کو یہ بات گراں گذری۔ آپؐ نے انھیں طلب فرمایا اور کہا:

"اے جماعت انصار! مجھے تمھاری ایک بات پہنچی ہے کہ تمھارے قلوب میں وہ چیز کھٹکتی ہے۔ کیا تم گمراہ نہ تھے؟ پھر اللہ نے میری وجہ سے تمھیں ہدایت دی؟ کیا تم مفلس نہ تھے؟ اللہ نے میری وجہ سے تمھیں غنا عطا کیا؟ کیا تم آپس میں دشمن نہ تھے، پھر اللہ نے میری وجہ سے تمھارے دلوں میں محبت بھر دی؟"

انھوں نے جواب دیا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کا بہت بڑا احسان و فضل ہے!"

پھر فرمایا: "اے انصار کی جماعت، تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟"

انھوں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! ہم کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کا احسان اور فضل ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "بخدا! اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو، اور تم سچ کہو گے، اور میں تمھاری تصدیق کروں گا۔ کہ اے محمدؐ! تو ہمارے پاس آیا، ہم نے تجھے پناہ دی، جب قریش نے تیری تکذیب کی تھی۔ ہم نے تیری تصدیق کی، تو کمزور تھا، ہم نے تیری مدد کی۔

تجھے وطن سے نکال دیا گیا، ہم نے تجھے پناہ دی تھی، تو مفلس آیا تھا، ہم نے تیری مؤاساۃ کی۔

کیا تمہارے دلوں میں دنیا کی محبت ہے؟ میں نے اس مالِ غنیمت سے ایک قوم کا دل رکھا ہے، تاکہ وہ اسلام میں پختہ ہو جائے، اور تمہیں تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے۔

اے جماعتِ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسولؐ کو لے جاؤ، اُس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، جو کچھ تم لے کر جا رہے ہو، وہ اس سے بہتر ہے جو وہ لے کر جا رہے ہیں۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار کا ایک آدمی ہوتا، اور اگر لوگ ایک علاقہ اور وادی میں چلیں اور انصار دوسرے علاقہ اور وادی میں چلیں، تو میں انصار کے علاقہ اور ان کی وادی میں چلوں گا۔ انصار (شعار) داخل ہیں، اور لوگ دثار (بڑی چادر) ہیں۔ اے اللہ! انصار پر، انصار کے بیٹوں پر، اور انصار کے پوتوں پر رحم فرما۔

راوی کا بیان ہے کہ انصار رو پڑے، حتیٰ کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ اور کہنے لگے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر راضی ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور لوگ بھی منتشر ہو گئے۔

اور جو وہ سروں کو دینے میں اتنا فیاض تھا، اس کی اندرون خانہ زندگی کا کیا حال تھا؟

حضرت فاطمہؓ کا ایک واقعہ: ایک مرتبہ آپؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے، ہند بنت حبیرہ کو وہ اپنی گردن سے اتار کر طلائی بالا دکھا رہی تھیں، اور کہہ رہی تھیں۔

"یہ مجھے علیؓ نے دیا ہے"!

آپؐ نے بیٹی کے ہاتھ میں یہ ہار دیکھا اور اُلٹے پاؤں تشریف لے گئے۔ آپؐ

کی مزاج شناس بیٹی رضؓ نے سمجھ لیا، اس طرح واپس چلے جانے کا سبب کیا ہے؟ فوراً ہار بیچ ڈالا۔ اس رقم سے ایک غلام خریدا، پھر اسے آزاد کر دیا، آپؐ کے سمع مبارک تک یہ بات پہنچی تو مسرور ہوئے، اور فرمایا۔ "الحمد للہ!"[۱۳]

"میں بادشاہ نہیں تم میں کا ایک فرد ہوں ...": داعیٔ اسلام علیہ الصلاۃ والسلام اور جمہوریت اسلامیہ کے بانیؐ کے نزدیک بادشاہت یعنی شخصی اور مطلق العنان فرماں روائی کی حیثیت کیا تھی، اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے ایک ازار خریدا، بیچنے والا محبت سے دست بوسی کے لیے جھکا، آپؐ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا:

"میں کوئی بادشاہ تو نہیں۔ تمھیں میں سے ایک ہوں!"[۱۴]

وفات سے پانچ روز پہلے (جمعرات کے دن) آپؐ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا: "عائشہؓ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "رکھی ہیں۔"

فرمایا: "کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو!"[۱۵]

آں حضرتؐ فرمایا کرتے تھے: "جو حکام کے جھوٹ کی تصدیق اور ظلم میں مدد کرے وہ مجھ سے نہیں، نہ حوض کوثر پر مجھ سے ملے گا۔"[۱۶]

اور یہ جو بادشاہ نہیں تھا۔ مگر سرورِ کائنات اور فخرِ موجودات تھا، اس کی زندگی یہ تھی:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔[۱۷]

خلفائے راشدین کا اسوہ: جب زمام کار خلفائے راشدین کے

ہاتھوں میں آتی، تب بھی جس جادۂ صواب پر وہ گامزن رہے، وہ اسوۂ رسولؐ کے سوا کچھ نہ تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے فرمایا: "بارِ خلافت اٹھانے کے بعد میرے مال اور املاک میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے بیچ کر لو، جو چیزیں زیادہ نظر آئیں، وہ سب میری وفات کے بعد میرے بعد ہونے والے خلیفہ کو دے دو، بیت المال سے میں اسی قدر لیتا تھا، جتنا اپنی تجارت سے کمایا کرتا تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے:

"وفات کے بعد جب ہم نے آپؓ کے ترکہ کو جانچا، تو دو چیزیں ملیں، ایک غلام اور ایک اونٹنی، یہ دونوں چیزیں ہم نے خلیفہ کو دے دیں۔"[18]

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے مزاج و طبیعت میں جو سختی اور شدت تھی وہ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔

حضرت عمرؓ کی ایک عہد آفریں مجلسِ مشاورت: بااینہمہ مشورت پر آپؓ بھی عامل تھے، آپ نے کبھی اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے اور اپنے فیصلے کو زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں سوادِ عراق کا واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے جس کی تفصیل امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں بیان فرمائی ہے: "جب عمرؓ بن خطاب کے پاس سعد بن ابی وقاص کی طرف سے جیش عراق آیا، تو آپؓ نے اصحابِ رسول سے اس زمین کی تقسیم کے بارے میں مشورہ فرمایا، جو عراق و شام میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی: ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ زمین جن مجاہدوں نے فتح کی ہے، انہیں میں تقسیم کر دی جائے۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس بات سے اختلاف کیا۔

عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف نے پوچھا، آپؓ کی رائے کیا ہے؟ حالانکہ زمین پر تو انہی لوگوں کا حق ہے جنھوں نے اسے فتح کیا ہے!

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اگر میں ارضِ شام اور ارضِ عراق کو فتح کرنے

والی افواج میں تقسیم کردوں تو پھر سرحدوں کی حفاظت، افواج کی تیاری، امن وامان کی بحالی اور نظم وانتظام کرنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟

حضرت عمرؓ سے اختلاف کرنے والوں کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہمارے تلوار نے فتح کیا ہے وہ ہمارا حصہ ہے اس سے بعد کے آنے والوں کا حق کیسے ہو سکتا ہے!

لیکن حضرت عمرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔

لوگوں نے کہا۔ "اچھا مشورہ کیجیے"۔

چنانچہ مہاجرین اولین سے مشورہ کیا گیا، یہاں بھی اختلاف رونما ہوا۔ اکثریت کی رائے تھی کہ زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے۔ حضرت علیؓ کی رائے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق تھی۔

اب حضرت عمرؓ نے دس انصار کو بھی شریک مشورہ کیا، پانچ نمائندے قبیلہ اوس کے تھے اور پانچ قبیلہ خزرج کے۔ یہ حضرات اپنے اپنے قبیلے کے کبار واشراف تھے، جب یہ سب حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے بعد حمد وثنا فرمایا۔

حضرت عمرؓ کی معرکۃ الآرا تقریر: "آپ کے معاملات کا بوجھ میں نے اٹھا رکھا ہے، اور جو امانت میں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اس میں شرکت کے لیے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں بھی آپ میں سے ہوں، آج آپ حق کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ خواہ کسی بات سے اختلاف ہو یا اتفاق، مگر یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ صرف میری رائے کی پیروی کریں۔ آپ کے پاس خدا کی کتاب ہے جو حق ہی کہتی ہے، پس خدا کی قسم میں جو کچھ کہتا ہوں، میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے مطابق ہو، لوگوں نے کہا:

"ہم سن رہے ہیں، فرمائیے یا امیر المومنین!"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "آپ نے ان حضرات کی رائے سن لی جن کو

خیال ہے کہ میں ان کے حقوق پر چھاپہ مار رہا ہوں اور میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ظلم سرزد ہو۔ اگر میں نے ان پر ذرا بھی ظلم کیا ہو اور ان کا حق کسی اور کو دے دیا ہو تو یقیناً میں نے شقاوت کی، لیکن میرا خیال ہے کہ ارضِ کسریٰ کی فتح کے بعد اب کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی زمین، ان کے مکان اور ان کی املاک کا مالک بنا دیا ہے، ان لوگوں کے درمیان میں نے مالِ غنیمت تقسیم کر دیا اور خمس نکال لیا۔ لیکن زمین کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ فوج میں تقسیم نہ کی جائے اور اسے خراج پر وہیں کے رہنے والوں کو سونپ دیا جائے۔ اور جزیہ بھی ان پر عائد کر دیا جائے۔ یہ مقاتلہ کرنے والے مسلمانوں کے لیے ہوگا، اور ان مسلمان نسلوں کے لیے بھی جو بعد میں آئیں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لیے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان بڑی بڑی متمدن مملکتوں مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر — کے لیے مکمل اور بہت بڑی فوج کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔ اب اگر یہ زمین تقسیم کر دی جائے تو ان واجبات، دفاع، حفاظت اور حملہ آور دشمن کے مقابلہ کہاں سے آئیں گے؟"

حاضرین نے بالاتفاق کہا۔ "آپ کی رائے بہتر اور انسب ہے، جو آپ نے کہا وہ ٹھیک ہے، جو آپ نے سوچا وہ درست ہے۔ اگر ان ممالک کی سرحدوں کا انتظام نہ کیا گیا، انہیں قابو میں رکھنے کے لیے فوج کا بندوبست نہ کیا گیا، تو اہلِ کفر پھر ان ممالک پر چڑھ دوڑیں گے۔

قرآن سے استدلال: حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ہاں اب حقیقت منکشف ہو گئی۔"

پھر آپؓ نے فرمایا: "کوئی ایسا عقیل و فہیم آدمی چاہیے جو اس زمین کا صحیح بندوبست اور پیمائش کر سکے۔"

لوگوں نے کہا: "عثمان بن حنیف اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ انہیں

آپ اس سے بھی اہم کام سونپ سکتے ہیں، وہ عقل، بصیرت، تجربہ، ہر چیز رکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے سلسلۂ بحث میں یہ بھی فرمایا: "میں اس خیال کی تائید کلام پاک سے بھی دیکھ رہا ہوں، پھر آپؓ نے سورۂ حشر کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جو فئے سے رکھتی ہیں[۱۹]۔"

اپنے عاملوں اور گورنروں کو کبھی بھی حضرت عمرؓ نے عیش، عشرت اور جاہ و جلال کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت: امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے: "مصر کے عامل عیاض بن غنم کے بارے میں معلوم ہوا کہ دروازے پر پہرے دار مقرر کر رکھے ہیں۔ آپؓ نے انھیں واپس بلوایا اور بکریاں چرواہے کا کام سونپ دیا۔

وہ کہنے لگے۔ "اس سے موت بہتر ہے!"

یہ سن کر فرمایا: "بکریاں چراتے ہوئے تجھے شرم دامن گیر ہے؟ تیرے باپ کا نام غنم پڑا ہی اس لیے تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

آخر عیاض تائب ہوئے اور آئندہ پھر کبھی ایسی جرأت نہ کی۔

حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل یا گورنر بناتے تو اس کے مال و منال کی فہرست لے کر رکھ لیتے جو اضافہ ہوتا، وہ بیت المال میں داخل کرا دیتے۔

ابنائے عمرؓ اور گورنر مصر: اسلامی جمہوریت میں سربراہ مملکت کے سربراہ ہوتا ہے۔ وہ مساوات عام کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اپنے اور اپنے کنبے کے معاملے میں اس درجہ محتاط ہوتا ہے کہ کسی فرد خاندان کے ساتھ خواہ وہ اس کا لخت جگر ہی کیوں نہ ہو کسی طرح کی رعایت اور سلوک کا برتاؤ نہیں کر سکتا۔

۲۱ھ میں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن

بن عمرؓ مصر گئے، یہاں کے گورنر عمرو بن العاص تھے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھ بھیجا، خبردار میرے خاندان کا کوئی آدمی اگر تمھارے پاس آئے تو نہ اسے تحفہ دینا۔ نہ سوغات، نہ اس کے ساتھ خصوصی اور امتیازی برتاؤ روا رکھنا۔

عمرو بن عاص کا بیان ہے، میں نے تعمیل حکم کی،

ایک روز عبدالرحمٰنؓ بن عمرؓ آئے اور شراب نوشی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کی اور کہا۔

"اگر آپ نے مجھ پر حد جاری نہ کی تو میں مدینہ منورہ جا کر امیر المؤمنین کو مطلع کر دوں گا۔ اتنے میں ان کے بھائی عبداللہ بن عمرؓ آ گئے، میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور مجلس میں بٹھانا چاہا، لیکن انھوں نے معذرت کر دی، اور کہا:

"والد نے مجھے آپ سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے، بجز اس صورت کے کہ ملاقات ناگزیر ہو، اور اس وقت ایسی ہی صورت پیش آ گئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بھائی عبدالرحمٰن کا سر بے سرِ عام نہ مونڈا جائے، حد جہاں چاہیے جاری کر دیجیے، میں نے گھر کے صحن میں حد لگائی۔

پھر عبداللہ بن عمرؓ بھائی کو لے کر ایک کمرے میں گئے اور وہاں ان کا سر مونڈ دیا۔

اس واقعہ کو تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ مجھے امیر المومنین کا یہ مکتوب ملا۔ لکھا تھا:

"عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے، عاصی بن عاصی کو سلام علیک، مجھے حیرت ہے تم پر اور تمھاری جرأت پر کہ تم نے میری ہدایات کی خلاف ورزی کی۔ میں نے امیر بنا کر تم کو تمام لوگوں کو نظر انداز کر کے منتخب کیا تھا، تم گھبرا گئے تھے، مگر تم کو پچھلی صف سے نکال کر پہلی صف میں کھڑا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا تھا تم جرأت و ہمت سے کام نہ لو گے اور میں دیکھ رہا ہوں، ویسا ہی ہوا، جیسا انھوں نے کہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، تم کو بری طرح معزول کرنا پڑے گا۔ تمھارا برا ہو

عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں حد لگاتے ہو اور اس کا سر بھی گھر کے اندر مونڈتے ہو حالانکہ تم کو معلوم تھا کہ یہ بات میری مرضی کے خلاف ہوگی۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعیت کا ایک فرد تھا، اور تم کو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جیسا کہ کسی دوسرے مسلمان کے ساتھ، لیکن تم نے کہا۔ امیر المومنین کا لڑکا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت کرو۔ حالانکہ تم جانتے ہو حقوق اللہ ہو یا کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

یہ خط پاتے ہی عبدالرحمٰن کو عبا (بالوں کا لمبا کوٹ) پہنا کر اور بغیر کجاوہ کے اونٹ پر سوار کر کے روانہ کر دو، تاکہ اپنی بدکرداری کا مزہ چکھ سکے۔[۲۱]

حضرت عمرؓ کی چند اور مثالیں: حضرت عمرؓ باوجود جلالتِ شان اپنے آپ کو کبھی غیر مسئول نہیں سمجھا، یہی نہیں کہ ان پر اعتراضات کیے گئے، اور ٹھنڈے دل سے ان کا جواب دیا اور معترض کو ساکت کر دیا۔ بلکہ وہ خود لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ اگر ان میں کوئی بات قابلِ گرفت نظر آئے اور اپنے حقوق پامال ہوتے دیکھیں تو باز پرس کریں۔[۲۲]

حضرت عمرؓ ایک بہت بڑی مملکت کے سربراہ تھے، قیصر و کسریٰ کا خزانہ ان کے تصرف میں تھا اور دنیا کا بہت بڑا حصہ ان کے زیرِ نگین تھا، بڑے بڑے ممالک کے سفیر جب آتے تو ان کو دیکھ کر کانپ جاتے تھے کہ جس کا نام سن کر وہ ہیبت سے لرزنے لگتے تھے۔ وہ سر کے نیچے تکیے کے بجائے اینٹ رکھے لیٹا ہے۔ جامہ دریدہ ہے، لباس میں ان گنت پیوند، پاؤں کے چپلوں کا یہ حال کہ گھسے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے۔

قحط کے زمانے میں اپنے لڑکے کو پھل کھاتے دیکھا تو بہت خفا ہوئے۔ فرمایا: "لوگ بھوکے مر رہے ہیں تو بچوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے"[۲۳]

علی مرتضیٰ کی نگاہ میں سربراہِ مملکت کا تصور: علی مرتضیٰؓ نے سربراہِ مملکت کی خصوصیات یہ بتائی ہیں:۔

"اور تم جانتے ہو، وہ شخص ناموس و خونِ مردم، غنیمت، احکام معاملہ اور

امانتِ مسلمین کا سزاوار نہیں، جو بخیل ہو کہ وہ طمع و حرص میں مبتلا ہو جائے گا۔ نہ اسے جاہل ہونا چاہیے، ورنہ اپنی نادانی سے دوسروں کو گمراہ کر دے گا۔ ستم گر نہ ہونا چاہیے ورنہ اپنے ظلم و جور سے لوگوں کو پریشان کرے گا، نہ تغیرِ ایام سے ڈرنے والا ہونا چاہیے، ورنہ ایک طاقتور گروہ سے مل کر دوسرے کمزور گروہ کو ذلیل و خوار کرے گا، نہ ایسے رشوت لینے والا ہونا چاہیئے کہ مال لے کر باطل کو حق اور حق کو باطل کر دے گا اور حقوق ضائع ہو جائیں گے، حدودِ الٰہی نافذ نہ ہو سکیں گے، سنت کا معطل کرنے والا نہ ہونا چاہیئے ورنہ امت کو ہلاک کر دے گا!"

پھر ایک موقع پر فرمایا: "اے لوگو! اپنے نفوسِ امارہ پر میری اعانت کرو، ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو، میری اطاعت کرو، خدا کی قسم میں ستم گر سے ستم دیدہ کا حق حاصل کرنے کے لیے از روئے عدل و انصاف حکم کرتا رہوں گا اور ستم گار کو حلقہ بینی کھینچوں گا، اونٹ کی طرح کہ اس کی ناک میں حلقہ ڈال دیتے ہیں، اور پھر مہار سے پکڑ کر کھینچتے ہیں، یہاں تک کہ اسے چشمۂ حق پر لے آؤں گا۔ اگرچہ یہ بات اسے گراں کیوں نہ گزرے۔"[۲۴]

حیاتِ حضرت علیؓ کے چند نمونے: حضرت علی مرتضیٰؓ سردی سے ٹھٹھرتے رہے لیکن بیت المال کے روپے سے سرمائی لباس بنانا پسند نہ فرمایا۔ آپؓ کی خیاط پسندی کا اس باب میں یہ عالم تھا کہ پورے عہدِ خلافت میں کوئی نیا کپڑا، اپنے لیے نہ بنوایا نہ پہنا۔[۲۵]

ایک مرتبہ آپؓ کی صاحبزادی نے بیت المال سے کچھ شہد منگوایا، آپ کو پتہ چلا تو اس کا بھاؤ معلوم کر کے قیمت بیت المال میں داخل کرا دی۔[۲۶]

آپؓ کا ارشاد تھا اور اس ارشاد پر عمل بھی تھا:

"اے لوگو! میں کسی طاعت کی تمہیں ترغیب نہ دوں گا، مگر یہ کہ تم سے پہلے میں خود اس پر عمل پیرا ہوں، اور کسی معصیت سے تمہیں نہ روکوں گا جب تک خود

س سے کنارہ کشی اختیار نہ کروں[۲۷]

آپؓ کا لباس کیا تھا؟ معمولی کپڑے کا تہہ بند قمیص کی آستین چھوٹی، اور دامن اونچا کہ بیت المال کا روپیہ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ ہو۔ خلیفہ کی حیثیت سے گشت پر نکلتے تو راستہ چلنے کو تیار کہ خود آگے آگے ہوں اور لوگ پیچھے پیچھے، فرماتے:

"اس میں فرماں روا کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے"[۲۸]!

سربراہِ مملکت کا یہ معیار موجودہ زمانے میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا اپنے آپ کو فنا کر دینا ہے، اور اس کے لیے نہ جمہوریت کو تیار کیا جا سکتا ہے، نہ آمریت کو۔ نہ شورائیت کو، نہ شخصی آمریت اور بادشاہت کے ادارے میں اس پر عمل پیرا ہونے کا خیال کسی دل میں آ سکتا ہے۔؟

سربراہِ مملکت کے لیے ماوردی کی شرطِ انتخاب

سربراہِ مملکت کے انتخاب کے لیے ماوردی نے لکھا ہے کہ اس کی لازمی شرط انتخاب ہے۔ جمہور فقہاء متکلمین کہتے ہیں کہ جب تک اس کا باقاعدہ انتخاب نہ کیا گیا ہو اور اسے لوگوں نے پسند نہ کر لیا ہو اس کی امامت صحیح نہیں ہے۔ اہلِ حل و عقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ باضابطہ طور پر کسی انتخاب کے بعد امام کی بیعت کریں اگر سب نے اتفاق کیا تو اس کی امامت مکمل ہو جائے گی[۲۹]!

اموی دورِ حکومت جیسا کچھ تھا، ظاہر ہے، لیکن اس عہد میں بھی روشن اور تابناک مثالیں مل جاتی ہیں۔

عبدالملک رشوت خوری کو بے حد ناپسند کرتا تھا۔ اسے ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے ایک کاتب نے ہدیہ قبول کر لیا ہے۔ اس نے کاتب کو بلا کر کہا:

"خدا کی قسم اگر تم نے یہ اس نیت سے قبول کیا ہے کہ ہدیہ پیش کرنے والے کو تمہیں اس کا کچھ بدلہ نہیں دینا ہے تو تم لئیم ہو۔ اگر تم نے اس ارادے سے

اسے قبول کیا ہے کہ اس آدمی کی وہ حاجت پوری کر دو گے جسے ہدیہ نہ ملنے کی صورت میں تم پورا نہ کرتے تو تم خائن ہو۔ اگر تمہارا منشا یہ ہے کہ اس شخص سے ہدیہ کا عوض تم اسے ضرور دو گے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کی خاطر تم امانت میں خیانت کر دو گے، اپنی ساکھ پر آنچ بھی نہ آنے دو گے تو تم نے جو کچھ قبول کیا ہے اس کا کم سے کم یہ نقصان ضرور ہو گا کہ جن لوگوں کے ساتھ تمہارا معاملہ ہے، ان کی زبان تم پر دراز ہو گی، جن لوگوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست ہے، وہ تمہارے سامنے دلیر ہوں گے۔ اور تمہاری قوت و اقتدار کی ہیبت جاتی رہے گی، اس کے بعد اس کو برطرف کر دیا۔[۳۰]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال : اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے تو اس خاندان کی مجموعی زیادتیوں کی تلافی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آپؓ نماز پڑھنے کے لیے باہر تشریف لائے، ایک شخص نے جو یمن سے آیا تھا، استغاثہ کیا، اور ایک شعر پڑھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"امیر المومنین! آپ پریشان مظلوم کو اپنے دروازہ پر بلاتے ہیں، یہ لیجیے ایک دُور سے آیا ہوا مظلوم آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

آپؓ نے پوچھا: "تم پر کیا زیادتی ہوئی ہے؟"

میں نے عرض کیا: "حضور! عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے میری زمین دبالی ہے!"

"آپؓ نے رجسٹر منگا کر اسے دیکھا، تو اس میں لکھا ہوا تھا، عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے فلاں شخص کی زمین اپنے لیے انتخاب کی ہے۔ آپؓ نے حکم دیا کہ اسے کاٹ کر لکھ دو، اصل مالک کو واپس دی گئی، اور اسے دو چند خرچہ دیا جائے۔[۳۱]"

عباسی خلفاء میں منصور "سفاح" کے نام سے مشہور ہے، یعنی خوں ریز! لیکن اس کے دور میں کچھ روشن چراغ یہاں بھی نظر آتی ہیں۔

"منصور کی آنکھیں بیدار رہا کرتی تھیں۔ وہ اپنے عمال کی طرف سے بے فکر غفلت کی نیند نہیں سوتا تھا، بُرا یا بھلا جو کام بھی وہ کرتے، اس کی اسے خبر ہوتی۔ ایک مرتبہ عمال کا خبر بدلے اسے اطلاع دی کہ حضرت موت کا والی کثرت سے شکار کھیلتا ہے۔ اس پر منصور نے والی کو لکھا:

"تمہاری ماں تم کو روئے اور تمہارا خاندان تم سے ہاتھ دھو بیٹھے، جنگلی جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے یہ کیا انتظامات تم نے کر رکھے ہیں، میں نے تو مسلمانوں کی ذمے داریاں تمہارے سپرد کی تھیں، جنگلی جانوروں کی قسمتوں کا مالک تمہیں نہیں بنایا تھا۔ اپنے عہدہ کا چارج فلاں شخص کو دے دو، اور مطیعوں اور راندۂ درگاہ اپنے گھر واپس آجاؤ!"[۳۲]

سربراہِ مملکت کے شرائط استحقاق پر ماوردی کا تبصرہ:

ماوردی نے امام، خلیفہ یا سربراہِ مملکت کے شرائط استحقاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امامت کی اہلیت کے لیے ان سات شرطوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:-

۱- حق پژوہی (اپنی تمام شرطوں کے ساتھ)

۲- علم۔ (امام ایسا عالم ہو کہ وہ عام حالات اور غیر معمولی واقعات کے وقت اجتہاد کر سکے)۔

۳- صحت، حواس و نطق۔

۴- صحت اعضاء تاکہ وہ اسے حرکت سے نہ روکے، اور بہ آسانی اٹھنے بیٹھنے میں حارج نہ ہو۔

۵- عقل و فراست (جو رعیت کی نگہبانی اور مصالح ملکی کے روبکار لانے میں معین ہو)۔

۶- شجاعت و دلیری (جس سے ملک کی حفاظت اور دشمن سے جہاد کیا جائے)

۷- نسب، (یعنی امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ قریش سے ہو، کیونکہ اس

بارے میں نص موجود ہے، دوسرے یہ کہ اس پر اجماع امت ہو چکا ہے[۳۳]۔
یہ آخری شرط یعنی شرط قرشیت درست نہیں ہے، اس پر ہم نے ایک مستقل باب قائم کر کے مفصل گفتگو کی ہے!

مآخذ:

۱ صحیح بخاری، باب من قب اصحاب النبی ص
۲ صحیح مسلم "کتاب الطلاق"، صحیح بخاری "کتاب العلم"
۳ سورۂ احزاب، پارہ آیت
۴ صحیح نسائی "کتاب النکاح"
۵ صحیح بخاری عن عمر رض
۶ صحیح بخاری عن عائشہ رض
۷ زاد المعاد، ج ۲ (ابن قیم) ص ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۴۷
۸ تاریخ عرب (سدیو) شائع کردہ الناظر پریس لکھنؤ ص ۴۲۔
۹ کیمیائے سعادت (امام غزالی) ص ۲۷۹
۱۰ حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) ص ۳۸۴
۱۱ صحیح بخاری و دیگر کتب صحاح
۱۲ زاد المعاد، ج ۲، ص ۲۲۳، ۲۴۰، ۳۲
۱۳ صحیح نسائی۔ عن ثوبان رض
۱۴ ترمذی (شمائل نبی)، عن ابی ہریرۃ رض
۱۵ کتاب شفاء (قاضی عیاض) ص ۶۳
۱۶ مسند امام حنبل رح، ج ۴، ص ۴۹۔
۱۷ صحیح بخاری عن ابی ہریرہ رض، نیز مسلم عن ابی سعید خدری رض
۱۸ طبری ج ۲، ص ۵۔
۱۹ سیاست شرعیہ (علامہ عبدالوہاب خلاف) طبع مصر، ص ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۸،
۲۰ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۷۲۔
۲۱ طبری، ج ۴، ص ۲۴۵ و شرح نہج البلاغہ (طبع مصر) ص ۱۲۳۔
۲۲ کتاب الخراج (امام ابو یوسف رح) ص ۶۶،
۲۳ کنز العمال، ج ۶، ص ۳۴۴، ۳۵۰،
۲۴ نہج البلاغہ (طبع مصر) ص ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۶۰۔
۲۵ مروج الذہب (مسعودی) ج ۳، ص ۹۲۹، ۹۳۰، نیز ۹۶۰۔

۲۶ کامل ابن اثیر ج ۵، ص ۹۵،

۲۷ نہج البلاغۃ (طبع مصر) ص ۱۱۴۹ - ۱۱۵۰

۲۸ طبری، ص ۲۴۸ -

۲۹ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۷

۳۰ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۱، نیز السیاسۃ الشرعیہ (خلاصہ عبدالوہاب خلاف) طبع مصر ص ۵۴ -

۳۱ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۲

۳۲ طبری، ج ۴، ص ۳۱۱ - مروج الذہب (مسعودی) ج ۲، ص ۲۲۳

۳۳ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳ -

(۷)

بنیادی حقوق

دنیا کی ہر جمہوریت کی گراں بہا پونجی وہ ہے جسے بنیادی حقوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مایۂ فخر و ناز "بنیادی حقوق" تحفے کے طور پر نہیں دیے گئے تھے انھیں حاصل کرنے میں خون کی ندیاں بہ گئی تھیں اور بہتی رہی تھیں۔ کشت و خون ہوا تھا، اور ہوتا رہا تھا۔ خانہ جنگی برپا ہوئی تھی اور ایک طویل مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا۔ باپ نے بیٹے کو قتل کیا، عمارتیں جلائی گئیں، اور جس کرف کنتر ہو گئیں۔ امن و امان درہم برہم ہوا۔ خانیت نے کنارہ کشی اختیار کر لی، انارکی اور طوائف الملوکی کا سلسلہ شروع ہو گیا، تب جا کر کہیں یہ کل سر سبز حاصل ہوا۔

یہ بھی یاد رہے "بنیادی حقوق" عہد مظلمہ کی پیداوار نہیں ہیں۔ اس دور کے گزر چکنے کے بعد ہی جمہوریت وجود میں آئی، اور رفتہ رفتہ بنیادی حقوق نے بھی ایک خاص وضع و ہیئت اختیار کر لی، عرصہ دراز تک ان کی نوک پلک درست ہوتی رہی، اور اب جا کر انھوں نے ایک معین اور متعین صورت اختیار کی ہے۔ اور اس کے باوجود "ہنگامی حالات" کی صورت میں یہ معطل ہوتے رہتے ہیں، اور اسے جمہوریت کی نفی نہیں سمجھا جاتا، نہیں جمہوریت قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام کے شاندار روایات: لیکن اسلام نے "عہدِ مظلمہ"

میں پوری دریا دلی کے ساتھ بنیادی حقوق عطا کر دیے تھے، اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام، نیز خلفائے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بہت سے دوسرے مسلمان فرماں رواؤں نے ان پر عمل درآمد کر کے بھی دکھایا تھا۔ یہ سب چیزیں احترام آدمیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں اسلام نے ایسے شاندار روایات قائم کیے ہیں۔ جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

بنیادی حقوق جو کچھ اور جتنے کچھ بھی متعین کیے گئے ہیں، وہ بہر حال درست ہیں۔ لیکن ہم امکانی حد تک الخفیف زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کے اندر ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کا نفاذ کس طرح ہوتا رہا ہے؟

بنیادی حقوق کا لب لباب: بنیادی حقوق کی پوری فہرست سامنے رکھ لیجیے۔ اس فہرست کا لب لباب جس چیز میں پوشیدہ ہے، وہ ہے مساوات! اگر حقیقی معنی میں کوئی حکومت اپنے باشندوں کو مساوات عطا کرتی ہے تو بلاشبہ وہ خدائی مملکت بھی ہے، اور کیسی بہترین حکومت بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب تک دنیا کی پہلی اسلامی جمہوریہ کے سوا کوئی دوسری مملکت اور حکومت اس معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔

آزادی عامہ: ہم جملہ بنیادی حقوق پر اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ گفتگو کی کوشش کریں گے لیکن سب سے پہلے آزادی عامہ کو، اور اس کے بعد مساوات کو زیر بحث لائیں گے۔ بعد ازاں دوسرے حقوق پر گفتگو ہوگی۔

یہ دونوں عناصر پر نمودار ہوتے ہی اسلام نے وہ تمام بوجھل بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں، جو مذہب، حکومت کے نام پر انسان کے پاؤں میں ڈالی گئی تھیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے:

ویضع عنہم اصرہم والاغلال التی — یعنی وہ نبی امیؐ لوگوں کی گردن پر سے (غلامی کا)

کانت علیہم اغلالا — بوجھ اور طوق الگ کر دیتا ہے[۱]

اور اس کی تعلیم یہ اور صرف یہ ہے:

ان الحکم الا للہ — یعنی حکمران تو صرف خدا ہے[۲]

گویا اسلام کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کے پاؤں میں دیر و کلیسا اور قیصر و سلطان کی خدائی اور عبودیت مطلقہ کی جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، انہیں کاٹ کر پھینک دے، اور خدائے واحد کے آستانہ کبریائی پر لا کر کھڑا کر دے، اور اس آستانے پر سر جھکانے کے بعد وہ سب کچھ ماننا پڑے گا، جس کا اسلام حکم دیتا ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑے گا جس سے اسلام منع کرتا ہے۔ آزادیٔ عامہ کا یہ کتنا روشن پہلو ہے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

ضرب اللہ مثلاً عبدا مملوکا لا یقدر علی شیء ومن رزقناہ منا رزقا حسنا فہو ینفق منہ سرا وجہرا ہل یستوون — یعنی اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے، مملوک کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، اور ایک دوسرا شخص ہے جسے ہم نے اچھی روزی دی ہے، اس میں سے وہ پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتا ہے، کیا یہ دونوں اس طرح کے آدمی برابر ہو سکتے ہیں؟[۳]

کیا اس سے بڑھ کر بھی آزادیٔ عامہ کا کوئی پروانہ ہو سکتا ہے؟ اب بنیادی حقوق کو لیجیے:

حریت ذات اور مساوات بین الافراد: اگر غور کیجیے تو جمیع حقوق انسانی دو چیزوں پر مبنی ہیں:

۱۔ حریت شخصی یعنی ذاتی آزادی

۲۔ مساوات بین الافراد یعنی افراد قوم کے مابین کامل مساوات و مساوات کے کیا معنی ہیں؟

حقوق مدنی و سیاسی میں بالکل یکسانیت، مساوات اور برابری۔ نہ کسی کے ساتھ رعایت، نہ کسی پر ظلم۔

علامہ خلاف کی یہ تعیین اگر غور کیا جائے تو بالکل درست اور صحیح نظر آئے گی۔ دیکھنا چاہیے، مساوات بین الافراد یعنی افراد قوم کے مابین مکمل مساوات سے متعلق اسلام کا اصول کیا ہے؟ اور یہ اصول اسلامی جمہوریہ میں کس حد تک کبھی بن سکا یا نہیں؟

سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ مساوات فی نفسہ ہے کیا؟

ظاہر ہے مساوات کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ نیک اور بد، شریف اور رذیل، باکردار اور بے کردار، پاک نہاد اور عصیاں شعار، سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں۔ مساوات کا مفہوم یہ اور صرف یہ ہے کہ سماجی، قانونی اور اخلاقی حیثیت سے ہر فرد کو بغیر امتیاز رنگ، نسل اور بلا تفریق دین و مذہب، یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں، کوئی فرد اس لئے ممتاز نہ ہو جائے کہ وہ اکثریت کی، یا حکمران اور فاتح کا ہم مذہب ہے، کسی کو اس لیے حقیر اور مرتبہ نہ دیا جائے کہ اقلیت یا محکوم طبقے کا ایک فرد ہے، قانون کو ہر حالت میں بے لاگ پر لٹکنا چاہیے، خواہ وہ کسی مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہو، مجرم کو ہر حالت میں سزا ملنی چاہیئے، خواہ اس کا دین اور مذہب کچھ ہی ہو، اور اسے دفاع کا پورا حق بھی ملنا چاہیئے، ذہانت، قابلیت، اہلیت اور استعداد کی ہر حیثیت سے قدر ہونی چاہیئے۔ خواہ اس کا تعلق کسی فرقے، کسی قوم، کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، ترقی کے مواقع سب کو یکساں طور پر حاصل ہونے چاہئیں، اور اس راستے میں دین و مذہب اور قوم و ملت کا سوال ہرگز نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔

سیکولرازم، عقل اور عمل: جہاں تک افراد و اعتراف کا تعلق ہے جمہوریت، نظری طور پر مساوات کو تسلیم کرتی ہے، اگرچہ جمہوریتیں جو اپنی آزاد پسندی کے باعث "سیکولر" ہونے پر فخر کرتی ہیں، اس باب میں بہ ظاہر اپنے

آپ کو فراخ حوصلہ اور فراخ دل منوانے کی کوشش کرتی ہیں؟

لیکن عمل کیا ہے؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کسی تہذیب میں کبھی خواہ وہ بیکور ہو یا نہ ہو، اعلیٰ ترین من منصب اور کلیدی عہدے صرف اکثریت یا حکمران قوم ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور اقلیت یا محکوم قوم، ہر طرح کی قابلیت اور اہلیت کے باوجود محروم رہ جاتی ہے۔

فکری، ذہنی، مالی اور عملی اعتبار سے آج یہودیوں کا دنیا میں کون ہمسر ہے؟ کتنے بڑے بڑے ملک ہیں جو ان کے اشارۂ چشم پہ اپنی پالیسی میں تبدیل کر لینے کے خوگر ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان کا، یا فرانس کا، یا جرمنی وغیرہ کا وزیر اعظم یا امریکہ کا صدر کوئی یہودی منتخب ہو جائے؟

ہمارا پڑوسی ملک بھی سیکولرزم پہ نازاں ہے۔ اور جب تک وہ آزاد نہیں ہوا تھا اس نے مسلمان اکابر کی شخصیت سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن اب ذرا کسی ہندو سال کی مدت گذر چکی ہے کیا وہاں کا وزیر اعظم کوئی مسلمان ہو سکا؟ کسی صوبے کا وزیر اعلیٰ کوئی مسلمان بنایا گیا؟ آزادی سے پہلے ہر دوسرے تیسرے سال کانگریس کا صدر کوئی مسلمان منتخب ہوتا رہتا تھا، لیکن تقریباً ربع صدی کی اس مدت میں کوئی مسلمان اس عہدے پر فائز ہوا؟

کیا آئندہ بھی اس کا کوئی امکان ہے؟

یقیناً یہ مستبعد ترین چیز ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہ کیسی مساوات ہے جس کی مدح و تحسین کا بازار گرم ہے؟ اگر یہ مساوات یہ ہے تو عدم مساوات کو کیا کہیں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ نہ فاتح اپنے حقوق بالادستی سے دستبردار ہونے پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔ نہ اکثریت اپنی قوت و اقتدار کا زعم فراموش کر سکتی ہے۔ یہ اس کی توہین ہے کہ اس کا وزیر اعظم، یا وزیر اعلیٰ، یا اس کی سب سے بڑی سیاسی جماعت

کا سربراہ کوئی ایسا فرد منتخب ہو جائے جو اس میں سے نہ ہو۔

ارباب اقتدار کو استثنار کا حق: یہ تو ہوا فلسفہ دونوں لیکن ذرا ایک نظر خود اپنے میں سے جو غیر مساویانہ نظام اُبھرتا ہے اس پر ڈال لیجیے۔

کیا کسی جمہوریہ کے سربراہِ مملکت یا حکومت کے کارندے کو عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے؟ اس سے بیان حلفی لیا جا سکتا ہے؟ اس کے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے؟ اسے سزا دی جا سکتی ہے؟ — یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے منصب سے رضاکارانہ طور پر دست بردار نہ ہو جائے یا استعفیٰ نہ کر دیا جائے، اس لیے کہ ادب حکومت کا تقاضا یہی ہے۔

کیا کوئی بڑا سرکاری ملازم، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرم کا مرتکب نہ ہو، دیا گیا ہو حکومت کی پیشگی اجازت کے بغیر گرفتار کیا جا سکتا ہے؟ یا اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے؟ یہ دونوں سوال بہت اہم ہیں لیکن ان کا جواب نفی میں ہے۔

نفی میں جواب دوسروں کے ہاں ہے، اسلام میں نہیں!

اسلامی جمہوریت میں قانون سب کے لیے یکساں ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو امیر میں، غنی اور اعلیٰ، امیر اور غریب، سلطان و گدا، سربراہ دار اور مزدور، عام اور رعایا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

اسی طرح جملہ انسانی حقوق میں بھی سب برابر ہیں۔ مرد و زن، مرد کہن سال اور جوانِ رعنا کے مابین کسی طرح کا تفاوت نہیں، سب ایک ہیں سب یکساں ہیں۔

اسلامی مساوات کی اساس: اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سید قطب نے فرمایا ہے، اور بڑے دل نشین انداز میں فرمایا ہے:

"اسلامی مساوات جس اساس پر قائم ہے، وہ خالص انسانی ہے۔ یہ مساوات ہر طرح کے تعصب، انتہا یہ کہ مذہبی تعصب سے بھی ماورا ہے۔

مثلاً قتل کا معاملہ لیجیے، اسلام نے مشرکوں کو بھی وہی حقوق دیئے ہیں۔

جو مسلمانوں کو حاصل ہیں بشرطیکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدۂ صلح ہو جنگ کی صورت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن قتل مؤمناً خطأ فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة الی اھلہ الا ان یصدقوا فان کان من قوم عدو لکم وھو مؤمن فتحریر رقبة مؤمنة وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق فدیة مسلمة الی اھلہ وتحریر رقبة مؤمنة۔

یعنی جو شخص کسی مومن کو غلطی (قتل غیر عمد) سے قتل کرے تو اس پر ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے اور اگر وہ شخص تمہارے دشمن قوم سے ہو اور مقتول مومن ہو تو ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے اور اگر وہ شخص تمہاری قوم سے ہو کہ تمہیں اور ان میں معاہدۂ صلح ہے تو خون بہا ہے جو اس کے اہل خاندان کے حوالے کر دیا جائے نیز ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن قوموں سے معاہدہ ہو ان کے مقتولوں کی کفارہ یہی ہے جو مسلمان مقتول کے لئے ہے۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام نے قتل خطا کے کفارہ میں ایک غلام کو آزاد کرنا رکھا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غلام کو آزاد کرنا ایک انسان کو زندگی دینے کے مترادف ہے۔

رہا قتل عمد یا قتل اعضاء کا مسئلہ سو ایسی صورت میں "النفس بالنفس" والی قرآنی حکم جاری ہوگی۔ اور اس باب میں قطعاً کسی کے ساتھ اس کی حیثیت یا مرتبے کو پیش نظر رکھ کر کوئی رعایت نہیں کی جائے گی خواہ اس سے کہ وہ دوست ہو یا مملوک مال، آقا ہو یا غلام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اگر کسی نے اپنے غلام کو قتل کیا، ہم بھی اسے قتل کر دیں گے۔ اگر غلام

کی ناک قطع کرے گا۔ ہم اس کی ناک کاٹ لیں گے۔ اگر اسے آختہ کرے گا ہم بھی اسے آختہ کر دیں گے!"

کیا اب یہ بات واضح اور روشن نہیں کہ اسلام مذہب و قبیلہ اور نسل و اعتقاد ہر قسم کے تعصب سے مبرا ہے؛ اور ایسے مقام بلند پر فائز ہے کہ مذہبی تہذیب کے لیے اس بلندی کو چھو لینا ممکن نہیں جدید تہذیب کو دنیا میں نشو و نما پانے والا امر یہ اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا کہ ریڈ انڈین نسل کو فنا کر دینے کی منظم کوشش کرے۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں ایسے قوانین بلا جھجک وضع کیے جا سکتے ہیں جو نسلی امتیاز پر مبنی ہیں!

غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید: اسلام اسی مساوات کا علمبردار نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ انسانی مساوات کا داعی اور نقیب ہے، وہ تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور عدل و قسط کی تاکید فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں ان لوگوں (غیر مسلموں) کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں فرماتا، جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے مقاتلہ نہیں کیا اور تمھیں تمھارے وطن سے نہیں نکالا، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس سے بڑھ کر انسانی مساوات اور کیا ہو سکتی ہے؟

دنیا میں جو نظام رائج ہے، اس کی دو عدل و مساوات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اپنوں کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ۔ اپنوں کے ساتھ کامل عدل اور کامل مساوات، غیروں کے ساتھ صرف ایسا عدل اور ایسی مساوات جو نہ قرآن کے عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن اسلام اس دوغلی کو پسند نہیں کرتا، وہ دینی اور قومی یا درجہ آخر کسی

مساوات کے بجائے خالص انسانی مساوات کا علمبردار ہے، قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ اور اس میں وہ اس درجہ بے لچک ہے کہ مسلمانوں کے دل میں یہ بات پختہ اس طرح راسخ ہو گئی ہے کہ انھوں نے اپنوں کے گلے تو خوب کاٹے، اور اپنوں کا خون بے دریغ بہایا لیکن غیر مسلموں کے ساتھ کبھی موجب شکایت روش نہیں اختیار کی۔ مجھے نہیں یاد کہ تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہو کہ حجاج بن یوسف کے بارے میں بھی ثابت کیا جا سکے کہ اس نے غیر مسلموں کو عدل و انصاف سے کبھی محروم رکھا ہو۔

آں حضرتؐ اور انسانی مساوات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی مساوات کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، چنانچہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"لا فضل العربی علی العجمی الا بالتقوی" — یعنی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے البتہ تقویٰ ضرور باعث امتیاز ہے۔

یہ بھی ارشاد رسولؐ ہے جو آپ نے بنی ہاشم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"یا بنی ھاشم خیبتن الناس بالاعمال وتجیئون بالانساب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" — "اے بنی ہاشم! لوگ میرے پاس اپنے اعمال لے کر آتے ہیں اور تم حسب نسب لے کر میرے پاس آتے ہو۔ خدا کے نزدیک معزز وہی ہے جو متقی ہے۔"

متعدد نصوص میں مساوات پر زور دیا گیا ہے اور واضح الفاظ میں اسے تسلیم کیا گیا ہے اور شعار ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد خداوندی ہے کہ:

"انما المؤمنون اخوۃ" — یعنی مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اخوانکم خدمکم" — یعنی تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں۔

یہ بھی ارشاد رسولؐ ہے کہ:

"الناس سواسیۃ کاسنان المشط لافضل لاحمر علی اسود ولا لعربی علی عجمی"

یعنی لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

غرض احکام اسلام کا مطالعہ کیجیے۔ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان میں مساوات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور امت کے مختلف طبقات کے لیے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔

حج میں ہر مسلمان بلا تمیز و تفریق مجبور ہے کہ ایک لباس پہنے، ایک رنگ کا اور سلا ہوا کپڑا نہ پہنے۔

نماز میں ہر مسلمان صف باندھنے اور اندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہونے پر مجبور ہے۔ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے خواہ وہ فقیر بے نوا ہو یا سلطانِ اورنگ نشین۔

تعزیرات میں مساوات: جنایات و جرائم میں صرف قانون موجود ہے کہ:

"النفس بالنفس والعین بالعین والجروح قصاص"

جان کے بدلے میں جان، آنکھ کے بدلے میں آنکھ، نیز خون کا بدلہ لیا جائے گا۔

ہر شخص کو پوری پوری سزا دی جائے گی ہر شخص سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔ خواہ وہ کوئی ہو۔ اس میں نہ کسی کے ساتھ رعایت ہے نہ تخصیص۔۔۔!

اسلام کے احکام میں سب لوگ برابر قرار دیئے گئے ہیں، کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس میں کسی کے لیے تخصیص ہو، تمام قوانین میں تمام افرادِ امت برابر ہیں۔

انسانی مساوات کا روح پرور منظر: صدرِ اسلام میں یہ مساوات حالت جنگ اور حالت امن، ہر حالت میں مسلمانوں کا عام شعار تھا۔ اس نعمت سے صرف مسلمان ہی بہرہ اندوز نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ذمی اور معاہد بھی پورے طور سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

"لھم ما لنا وعلیھم ما لنا"

یہ بھی ارشادِ رسول ہی تھا کہ:

"من اذی ذمیا فانا خصمہ یوم القیامۃ"

جس نے کسی ذمی کو ایذا دی تو قیامت کے دن میں اس کا مدعی ہوں گا۔

ذیل کا واقعہ انسانی مساوات کا کتنا روح پرور مرقع ہے:

فرمان کے فرماں روا جبلہ بن ایہم نے اسلام قبول کر لیا۔ طوافِ کعبہ کے وقت اس کی چادر کا ایک گوشہ کسی بدو کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر ایک زور چپت رسید کی۔ بدو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جبلہ نے عمرؓ سے شکایت کی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تم نے جیسا کیا ویسا پایا۔"

جبلہ نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے!"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "ہاں! عہدِ جاہلیت میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا ہے۔"

مساواتِ انسانی اسی وقت بروئے کار لائی جا سکتی ہے جب صحیح معنی میں مساوات باہمی قائم ہو چکی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک قابلِ اعتبار نہیں جب تک جو کچھ وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے۔"

یہ واقعہ بھی کتنا قابلِ آفرین ہے:

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم سب نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔

ایک اعرابی نے جو نماز میں شامل تھا کہا: "اے اللہ! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم

فرمایا: "اور تم اپنے ساتھ کسی دوسرے پر رحم نہ کرو"۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو اعرابی سے فرمایا:

"تو نے خدا کی رحمت کو تنگ کر دیا!"

آزادیٔ رائے: بنیادی حقوق میں آزادیٔ رائے بھی شامل ہے۔ حریت رائے کے معاملے میں اسلام نے دو پہلو اختیار کیے ہیں، جس میں حریت رائے مطلوب ہے، آیا وہ امر دینی ہے یا غیر دینی؟

اگر معاملہ غیر دینی ہے تو ہر فرد کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جو رائے مناسب سمجھے قائم کرے اور اسے جس طریقے سے چاہے بروئے کار لائے۔ تلاش و تفحص کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ حدود اسلام میں اور اس کے بعد بھی ایسے متعدد واقعات پیش آئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے حریت رائے کو کس درجہ اہتمام کیا ہے اور کہاں تک آزادی بخشی ہے؟

مثلاً خود سرکار رسالتؐ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غزوہ میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں جگہ پر اتریں۔ ایک صحابیؓ نے آپؐ سے سوال کیا، کیا یہ وہ منزل ہے جس کے بارے میں آپؐ کو اللہ نے وحی بھیجی ہے یا صرف آپؐ کی رائے ہے؟

آپؐ نے فرمایا: "یہ میری ذاتی رائے ہے"!

صحابیؓ نے عرض کیا: "تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں منزل مناسب ہوگی"، چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اختلاف ہے، جو جنگی قیدیوں کے بارے میں تھا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی، انھیں قتل کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کہتے تھے، فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی صحابہؓ کا اختلاف ہے جو خلافت اور دوسرے معاملات میں رونما ہوا۔

اسلام میں اجتہاد اور قیاس کی اہمیت: اگر معاملہ دینی ہے تو ہر

شخص کو اجتہاد کا اذن عام ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ رائے ظاہر کرے جس کی طرف اس کا اعتقاد رہنمائی کر رہا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اجتہاد نص سے متصادم نہ ہو اور رائے اصول دین سے متجاوز نہ ہو۔ اور ان قوانین کلیہ و نصوص صحیحہ سے بھی مخالف نہ ہو جو ثابت ہیں۔

چنانچہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے "قیاس" کو اپنے اہم ترین اصولوں میں سے ایک اہم رکن قرار دیا ہے۔ بلکہ غور کیجیے تو مصادر تشریع میں سے ایک مصدر یہ بھی ہے کہ جو احکام منصوص نہ ہوں ان سے استنباط کے لیے ایک نظیر سے دوسری نظیر پیدا کر لینا، ایک واقعہ پر دوسرے واقعہ کو ڈھال لینا ایک مشابہت سے دوسری مشابہت بنا لینا، یہی اسلامی اصطلاح میں "قیاس" ہے۔ قیاس کے سلسلے میں الحاق اور استنباط کے لیے اسلام نے بڑا وسیع میدان کھلا چھوڑ دیا ہے اور راستہ نظر کو بھی پوری پوری آزادی مرحمت فرمائی۔

سنتِ رسول ﷺ سے بھی ان حقائق کی تائید ہوتی ہے فرمایا:

"ان لک اجتہد ماجورا ان اخطأ فلہ اجر وان اصاب فلہ اجران"

یعنی ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے، اگر اس نے اجتہاد میں چوک کی تو اسے ایک اجر ملے گا، اور اگر صحیح اجتہاد کیا تو دو اجر ملیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اجتہاد کبھی کبھی غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن بہ باعثِ اجر یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ اسلام میں رائے اور قیاس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

آزادیٔ رائے کی چند مثالیں: آزادیٔ رائے کے سلسلے میں امثلہ ذیل بھی غور طلب ہیں۔ جو ہر تربیت ضمیر کی ترجمان ہیں، اور خوف و اندیشہ سے بے نیاز:

ابن السماک نے ایک مرتبہ ہارون الرشید سے کہا:

"یا امیر المومنین! جب آپ مر جائیں گے اور تنہا حساب کتاب (خدا کے سامنے)

دیں گے تو بھی ایسے ہی ہوں گے!

شبیب بن شیبہ نے خلیفہ منصور کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

"امیر المومنین! خدا سے ڈریے، اپنے خیال کو اپنی آخرت برباد کرکے نہ ارزیے"

زیاد بن ہارون سے روایت کرتے ہیں کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے ایک روز مجھے اور ابن طاؤس کو بلا بھیجا، ہم دونوں حاضر ہوئے۔ وہ مسند پر تکیہ لگائے بیٹھے رکھا تھا، اور پاس ہی جلاد تلوار ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

خلیفہ نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھایا، اور ابن طاؤس سے کہا:

"اپنے والد سے روایت کردہ کوئی حدیث سناؤ!"

طاؤس نے کہا: میرے والد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو شرک کی تدبیر کرتا رہا ہو۔ اور ظلم و جور سے کام لیتا رہا ہو!"

کچھ دیر ابو جعفر خاموش رہا، مالک کا بیان ہے، میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے کہ اب ابن طاؤس کی گردن اڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹے مجھ پر پڑیں گے۔

پھر ابو جعفر نے کہا: "ابن طاؤس ذرا یہ دوات تو ادھر بڑھانا!"

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اس نے کہا:

"آخر یہ دوات اٹھا کر مجھے کیوں نہیں دیتے؟"

ابن طاؤس نے کہا: "مجھے اندیشہ ہے، آپ کوئی ایسی بات نہ لکھ دیں جو معصیت ہو اور اس طرح میں بھی اس میں شریک بن جاؤں۔"

جعفر نے کہا: "تم دونوں چلے جاؤ یہاں سے!"

"ہم اٹھے تو یہی تھے، چلے آئے۔

مالک کا بیان ہے: اس دن سے فارس کی عظمت میرے دل سے نکل گئی۔
ابن سماک ہارون رشید کی طلب پر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور
فرمایا: "یا امیر المومنین! اللہ نے آپ کو جو رتبہ دیا ہے اس کا حق یہ
ہے کہ جو خدا کو پسند ہو وہ بھی محبوب ہو، جو خدا کو ناپسند ہو وہ آپ
کے لیے بھی مبغوض ہو۔ لیکن فارس کی قسم نہ آپ اس گھر (جنت) کو پسند کرتے ہیں
آپ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اور خدا اس گھر (جہنم) کو ناپسند کرتا ہے۔ آپ اسے
پسند کرتے ہیں

امیر المومنین! یاد رکھیے۔ آج جو قوت اور حشمت آپ کے ہاتھ میں ہے
اگر آپ کے پیش رو کے پاس باقی رہتی۔ تو آپ کے پاس نہ پہنچتی۔ اور جس طرح یہ
دوسروں کے پاس باقی نہیں رہی۔ آپ کے قبضے میں بھی نہیں رہے گی۔ پس
خدا سے ڈریے!

حجاج نے ایک سفر میں ایک شخص سے پوچھا:
"کیا تم محمد بن یوسف کو جانتے ہو؟"
وہ کہنے لگا: "ہاں! کیوں نہیں جانتا!"
حجاج نے کہا: "کچھ اس کے چال چلن کے بارے میں بتاؤ!"
اس نے کہا: "وہ تو بڑا ہی برا آدمی ہے، اللہ کی اور اس کے احکام
کی سرتابی میں فرد!"
حجاج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، پوچھا:
"کمبخت تجھے نہیں معلوم، وہ میرا بھائی ہے؟"
اس نے جواب دیا: "میں جانتا ہوں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ میرا رب
ہے۔ اور خدا کی قسم وہ تجھ سے کہیں زیادہ محبوب و مطلوب ہے، جتنا تجھے
تیرا رب ہے۔"

سفیان ثوری نے خلیفہ ابو جعفر منصور سے کہا:

"میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں کہ اگر وہ مر جائے تو ساری اُمّت مر جائے گی!"

ابوجعفر منصور نے (اشتیاق کے ساتھ) سوال کیا،

"کون ہے وہ شخص؟"

سفیان ثوریؒ نے جواب دیا: "آپ!"

ایک مرتبہ ہارون رشید حج کے لیے گیا، دوران طواف عبداللہ عمری سے آمنا سامنا ہوا۔ عبداللہ عمری نے آواز دی۔

"اے ہارون!"

ہارون نے جواب دیا: "عمِ محترم۔ خاکسار حاضر ہے!"

عبداللہ عمری نے پوچھا: "بتا سکتے ہو، حج کے لیے یہ لوگ جو آتے ہیں، ان کی تعداد کیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا: "بے شمار۔ ان کی تعداد تو خدا ہی کو معلوم ہے!"

عبداللہ عمری نے کہا: "اے شخص! اس حقیقت کو نہ بھول کہ اس انبوہ خلائق میں سے ہر ایک خدا کے سامنے صرف اپنے لیے جواب دہ ہے اور تو ان سب کا جواب دہ! ذرا سوچ محاسبے کے وقت تجھ پر کیا گزرے گی!"

ہارون رونے لگا، اتنا رویا کہ کئی روز آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

ابن الکوا سے ایک مرتبہ منصور نے پوچھا۔

"بتاؤ تو سہی، زمانے کی تعریف کیا ہے؟"

ابن الکوا نے جواب دیا: "زمانہ تو خود آپ ہیں، اگر آپ اچھے ہیں تو وہ بھی اچھا ہے۔ آپ بُرے ہیں تو وہ بھی بُرا ہے۔"

حجاج بن یوسف ثقفی نے قطری بن فجاءۃ کو گرفتار کر لیا۔ اور کہا:

"میں تجھے قتل کر کے رہوں گا!"

قطری نے پوچھا: "وہ کس لیے؟"

حجاج نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ تیرے بھائی نے میرے خلاف چڑھائی کی ہے۔!"

قطری نے کہا: "میرے پاس امیر المومنین کا مکتوب ہے کہ میرے بھائی کے جرم میں آپ مجھے ماخوذ نہ کریں!

حجاج نے کہا: "کہاں ہے وہ خط؟"

قطری نے جواب میں کہا: "میرے پاس تو اس سے بھی زیادہ واجب التعظیم خط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ"

حجاج کو یہ جواب پسند آیا اور اس نے اسے رہا کر دیا۔[۱۵]

حقوقِ شہریت: بنیادی حقوق کی ایک شق یہ بھی ہے کہ مملکت کے شہریوں کو بلا امتیاز حقوقِ شہریت دیے جائیں اور انھیں ترقی کے یکساں مواقع عطا کیے جائیں۔

ابو الفرج یعقوب بن کلس کی وفات کے بعد خلیفہ عزیز باللہ نے عیسیٰ بن نسطورس نصرانی کو وزیر مالیات کے منصب پر فائز کیا۔[۱۶]

حاکم بامر اللہ کے زمانے میں یہ شخص منصب وزارت پر فائز ہوا۔ اس سے پہلے کاتب کا منصب رکھتا تھا اور رئیس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کے لیے مصیبت اور عیسائیوں کے لیے رحمت ثابت ہوا۔

خلیفہ حافظ کے عیسائی وزیر کا جب انتقال ہوا تو خلیفہ کو بہت صدمہ ہوا۔ اس کے تابوت پر ریشم کی چادریں ڈالی گئیں۔ اردگرد عیسائی لوگ اور خود خلیفہ نے ننگے سر پیدل چل کر اپنے وزیر کی تعظیم اور اعزاز کے طور پر جنازہ کی مشایعت کی۔ خود خلیفہ بہ نفسِ نفیس ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سب سے پیچھے راہبوں اور قسیسوں کی ایک جماعت انجیل کی تلاوت کرتی چلی آ رہی تھی۔ جب لاش قبر میں رکھی گئی تو خلیفہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔[۱۷]

فاطمی خلفاء میں ایک کم تعصب میں بدنام ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کا برتاؤ کیا جس کا غیروں کو بھی اعتراف ہے۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں:

"جو امور عام معاشرت سے متعلق تھے مثلاً معاملات، جائداد اور وراثت وغیرہ وغیرہ ان کو عربوں (فاطمیوں) نے اس عمدگی سے رسم و رواج کے مطابق ٹھہرا دیا تھا کہ ذمی بھی بالالتزام انھیں قواعد کی پابندی کرتے رہے۔

فاطمیوں کی حکومت میں عیسائیوں کو مذہب و رسم و رواج اور قانون کی پوری آزادی تھی۔ ایک راہب جو پلہ موکے کلیسا کا قسیس ہے۔ کہتا ہے کہ پادریوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنا مذہبی لباس پہن کر بیماروں کو تسلی دینے کے لیے جایا کریں۔"

ایک دوسرا قسیس سوردکوں بیان کرتا ہے کہ سینا میں عام رسوم مذہبی کے وقت دو جھنڈے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک جھنڈا مسلمانوں کا اور دوسرا عیسائیوں کا، فتح کے وقت جتنے کلیسا موجود تھے قائم رکھے گئے تھے۔ البتہ انا لیس کی طرح نئے کلیسے بنانے کی یہاں اجازت نہ تھی۔

مسٹر اسکاٹ کا بیان: مسٹر اسکاٹ بیان کرتے ہیں:

"عرب جاہلیت کے قصے اور نقشے نہ صرف پلرمو (پلرم) میں بلکہ ہمسایہ شہر روم میں اسی قدیم شان اور سب مذہبوں پر کھلی جاتی تھیں اور مسلمان اور غیر مسلمان دونوں تحسین و آفرین کرتے اور داد دیتے تھے۔"

جیسا کہ معاہدہ عمرانی میں روسو نے لکھا ہے:

"حکومت کی بنیاد اکثریت کا اس کے وجود اور قیام پر اتفاق ہے۔"

اور یہ اتفاق اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب تک حکومت عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہ کرے۔ بنیادی حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اس وسیع دائرے کے تمام مقتضیات کا پورا کرنا حکومت کے فرائض اور واجبات میں داخل ہے۔

ضروریاتِ زندگی کی ذمے داری: اسلامی جمہوریت نے اس پہلو پر جتنی شدت اور اہمیت سے توجہ کی ہے اس کے تناظر میں دوسرے نظریات کے ایک مفکر کا ارشاد ہے:

"ضروریاتِ زندگی کی فراہمی حکومت کا فرض ہے!"

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاحب جوامع الکلم تھے یعنی آپ کی گفتگو ایسی ہوتی تھی کہ بات مختصر ہوتی۔ لیکن اس کے اندر ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا تھا جس کی وسعت اور اہمیت کے مختلف پہلو کھل کر سامنے آتے جائیں گے جس پہلو کو دیکھیے وہ ہمہ پہلو ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس میں نہ آگیا ہو۔ کوئی امر ایسا نہیں ہے۔ جو تشنہ رہ گیا ہو۔

ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے متعلق حکومت کے فرائض کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صرف چند بول ہیں جن سے تمام باتیں صاف ہو گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اگر کوئی شخص مقروض ہو اور مر جائے اور کوئی مال باقی نہ چھوڑے، تو ہم سے ادا کریں گے۔ اگر کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ حق وارثوں کا ہے۔"

معاویہ بن زیاد حسنؓ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی آیا جو حقوق اللہ دینے والا ہے۔ بھرے ہوئے اور کھرے تھے آں حضرت صلعم نے سب سے بیٹھ جانے کو فرمایا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا کہ ان کو عطا فرماتے۔ اسی اثنا میں ایک شخص آیا اور اس نے چار اوقیہ چاندی آپ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے ایک ایک اوقیہ ان تینوں میں تقسیم فرما دی۔ ایک اوقیہ جو بچ رہی تھی اس کے لیے پوچھا، کون لینے والا ہے؟ مگر

کوئی نہ اٹھا۔

رات ہوئی تو آپؐ نے وہ چاندی اپنے سر ہانے رکھ لی؟

حضرت عائشہ رضؓ نے دیکھا کہ آپؐ استراحت نہیں فرماتے، بار بار اٹھتے ہیں اور نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں، نماز پڑھ کر ذرا دیر استراحت فرماتے ہیں، پھر نماز پڑھنے لگتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا: "کچھ مزاج تو ناساز نہیں؟"

فرمایا: "نہیں!"

حضرت عائشہ رضؓ نے پھر عرض کیا: "کیا خدا کا کوئی خاص حکم آیا ہے جو موجب اضطراب بن گیا ہے؟"

فرمایا: "نہیں!"

حضرت عائشہ رضؓ نے کہا: "پھر آپؐ استراحت کیوں نہیں فرماتے؟"

آپؐ نے وہ چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا۔

"یہ ہے وہ چیز جس نے مجھے وقف اضطراب کر رکھا ہے کہ مبادا یہ میرے پاس رہ جائے اور میرا بلاوا آجائے۔"[۲۱]

آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عقیدہ: بنیادی حقوق میں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عقیدہ بھی شامل ہے۔ اور یہ آزادی جس فراخ حوصلگی سے اسلام نے عطا کی ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی:۔

علامہ خلاف لکھتے ہیں:

"قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں اکراہ و جبر کے ساتھ ایمان کی مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً:

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی"۔

یعنی دین کے معاملے میں جبر و جور روا نہیں کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔[۲۲]

نیز دوسری جگہ قرآن پاک نے فرمایا:

"افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین"[۲۳] یعنی کیا تم لوگوں کو مجبور کرنا چاہتے ہو کہ وہ مسلمان ہو جائیں؟

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"لکم دینکم ولی دین"[۲۴] یعنی تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین!

پھر جبکہ اسلام میں اعتقاد کی بنیاد غور و فکر اور آیات الٰہی پر فکر و تعمق ہے، نہ کہ محاکاۃ، نہ کہ تقلید، نہ کہ جبر و جور، تو اس سے بڑھ کر حریت اعتقاد اور کیا ہو سکتی ہے؟

خلافت پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اسلام نے جہاں مسلمانوں کے لیے اقامت شعائر کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہاں اس نے یہ بھی کیا ہے کہ غیر مسلموں کے لیے اس امر کی پوری آزادی تسلیم کر لی ہے کہ وہ اپنے شعائر دینی قائم کریں۔ غیر مسلموں کو اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے معاملات اور احوال شخصی میں دینی احکام کی پوری آزادی کے ساتھ پیروی کریں۔

اس رواداری اور اسلامی طرز عمل اور حریت اعتقاد کی بنیاد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے، جو آپؐ نے ذمیوں کے بارے میں فرمایا تھا:

"لہم ما علینا وعلیہم ما علینا" یعنی اگر ہم راحت میں ہیں تو وہ بھی آرام پائیں گے، اور اگر ہم دکھ میں ہیں تو وہ بھی دکھ جھیلیں گے۔"

"جتنے عہد نامے غیر مسلموں سے لیے گئے، ان میں جہاں ان کی حریت ذات و مال تسلیم کی گئی وہاں ان کے عقائد اور اقامت شعائر کی آزادی بھی مانی گئی تھی۔"

آزادی ذات: بنیادی حقوق میں آزادی ذات بھی شامل ہے۔ اور اسلامی

جمہوریت میں یہ آزادی بھی پورے طور پر ملی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔

چنانچہ علامہ ابن قیم رح فرماتے ہیں:

"یہ جائز نہیں کہ کسی کافر کے قتل کی وجہ سے کسی دوسرے کافر کو پکڑا جائے یہ تو اہل اسلام کے حق میں بھی نہیں ہے۔ اور یہ دونوں صورتیں ظلم کہلائیں گی۔"

درحقیقت: "حریت شخصی" سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی شخصی معاملات میں بالکل آزاد ہو نیز ان تمام امور میں بھی اسے آزادی حاصل ہو جو اس کی ذات سے متعلق ہوں۔ غرض وہ اپنے نفس، اپنی جان، اپنے اہل و عیال، اپنے تمام حقوق میں بالکل آزاد ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آزادی کسی دوسرے کی آزادی اور حقوق پر اثر انداز نہ ہوتی ہو۔

حریت شخصی کن آزادیوں سے عبارت ہے؟

اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حریت شخصی چند قسم کی آزادیوں سے عبارت ہے:

۱۔ حریت ذات۔ ۲۔ حریت مادی اشیاء۔ ۳۔ حریت عمل

۴۔ حریت اعتقاد۔ ۵۔ حریت رائے۔ ۶۔ حریت تعلیم

اگر یہ آزادیاں کسی شخص کو میسر ہیں، تو سمجھنا چاہیے کہ وہ حریت شخصی سے بہرہ ور ہے۔

آیئے! اب دیکھیں کہ اسلام نے ان آزادیوں کو برقرار رکھا ہے یا انہیں چھین لیا ہے؟

حدود اور تقرر: اسلامی احکام کی رو سے حریت ذات مکمل طور پر تسلیم کی گئی ہے اور اسے ہر ناروا پابندی اور زیادتی سے محفوظ رکھا گیا ہے البتہ اسلام نے اپنے دائرہ نواہی کے حدود ضرور مقرر کر دیے ہیں اور ان حدود سے تجاوز کرنے پر شرعی سزائیں بھی تجویز کر دی ہیں۔ بعض سزائیں تو وہ ہیں جن کی

صرف صرف نوعیت اور تعیین و کیفیت بتا دی گئی ہے، جنھیں ہم اصطلاح میں "حدود" کہتے ہیں۔ اور بعض سزائیں ہیں جن کو حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کا اصطلاحی نام تعزیرات ہے۔ اب سمجھ لینا چاہیئے کہ مجرم وہی ہے جو حدود الٰہی سے تجاوز کر جائے اور سزا بھی وہی ہے جو شرع اسلامی کے موافق ہو۔

علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ عقوبات وہی جائز ہیں جو نص سے ثابت ہوں۔ شکست اور قیاس سے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا عدوان الا علی الظلمین"۔

نیز فرمایا:

"فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ"۔

اب ذرا غور کیجیے۔ نبی تو یہ ہے کہ انسان کو اللہ کے سوا کسی اور پر نہ ہو۔ اور یہ ہے کہ ظلم کو جو سزا دی جائے وہ اس کو ایذا رسانی سے زیادہ نہ ہو۔ ان حقائق کی بنا پر ثابت ہوا کہ سزا شرع کے مطابق ہی دی جا سکتی ہے۔ شخصی اور حریت ذات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے!

جتنا بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا استقصا کیا جائے گا۔ یہی معلوم ہوگا کہ ظلم اور ایذا رسانی کی ممانعت کی گئی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، اور حریت ذات اور امان انسان کی تاکید کی گئی ہے اور اسے دوسروں کی طرح سے بغیر استحقاق دی و قتل [illegible] کی گئی ہے۔

علامہ ابن قیم کی تصریحات: علامہ ابن قیم اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"[illegible] کا [illegible] بن مشرک کے لیے [illegible] کی سفارش پر، یہ سوال کہ آیا یہ آپ کا حکم ہے؟ اور آپ کا جواب کہ نہیں ہیں تو صرف سفارش کر رہا ہوں، پھر

بریرہؓ کا کہنا کہ مجھے اس (سابق شوہر) کی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ احکام ملتے ہیں: ۱۔ ایک یہ کہ اگر حکم ہو تو آپؐ کا حکم وجوب کے لیے ہے، اسی وجہ سے آپؐ نے حکم اور شفاعت میں فرق فرمایا:

۲:۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضؓ کے انکار کا برا نہیں مانا، نہ آپؐ برہم ہوئے۔ جب انھوں نے آپؐ کی سفارش قبول نہیں کی۔ کیونکہ شفاعت میں مشفوع کا حق ساقط کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس کی مرضی ہے کہ چاہے اس سے دست بردار ہو جائے اور چاہے تو اسے باقی رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نہ ماننا حرام نہیں، البتہ آپؐ کا حکم نہ ماننا حرام ہے[۲۹]

مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ فرمایا:

"جس عورت کو کسی مجنون، جذامی یا مبروص کی بیوی از راہ فریب بنایا جائے تو وہ مہر کی حقدار ہے[۳۰]"

مجنون کو ایک سال کی مہلت ہے، اگر اسے افاقہ ہو جائے تو ٹھیک ورنہ اس کے اور عورت کے درمیان جدائی کر دی جائے گی[۳۱]

آزادیٔ ذات کی یہ مثالیں صرف اسلامی جمہوریہ ہی میں مل سکتی ہیں اور حکومت کے فرائض کے سلسلے میں معالج کی ذمہ داری سے متعلق اور حکومت کے فرائض کے سلسلے میں بھی اسلامی جمہوریت ایک نمایاں ترین رکھتی ہے:

"عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کسی نے اپنے آپ کو طبیب ظاہر کیا، حالانکہ طب کا علم اور فن نہیں جانتا تو اس سے تاوان لیا جا سکتا ہے[۳۲]"

جاہل طبیب پر ضمان (تاوان) ڈالنے کا سبب یہ ہے کہ جب اس نے طب کا کام شروع کر دیا۔ تو اس نے اس سے قبل علم طب پورے طور پر نہیں سیکھا تو

گویا اس نے لوگوں کی جان سے کھیلنا شروع کر دیا، وہ گویا ایسے کام کا مرتکب ہونا چاہتا ہے جس کا اسے علم نہیں، وہ مریض سے دھوکا کرتا اور اسے مبتلائے فریب کرتا ہے۔ لہٰذا اس پر ضمان لازم آئے گی۔

اس مسئلہ میں اہل علم کا اجماع ہے، خطابی فرماتے ہیں "میرا خیال ہے: "اگر معالج کی زیادتی کے باعث کوئی مریض ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم آنے کے سلسلہ میں کسی کا اختلاف نہیں"۔

البتہ اگر کوئی شخص اس فن میں کچھ علم رکھتا ہو، لیکن تجربہ اور معرفت کے لحاظ سے کوئی مرتبہ نہ رکھتا ہو، اس کے علاج سے اگر کوئی ہلاک ہو جائے تو اس پر دیت (خون بہا) لازم آئے گی، قصاص ساقط ہو جائے گا۔

ایک قسم ایسے طبیب حاذق کی ہے، جو اجازت یافتہ بھی ہے، اس فن میں درک اور مہارت بھی رکھتا ہے، لیکن ہاتھ چوک گیا۔ اور اس نے کوئی عضو صحیح ضائع یا تلف کر دیا۔ تو اس سے ضمان (تاوان) لی جائے گی، کیونکہ اس نے قابل سزا غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاوان ملزم سے لیا جائے گا یا بیت المال سے؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

ایسا طبیب جو حاذق ہے اس نے فن طب میں پورے طور پر مہارت حاصل کی ہے۔ اب اس نے کسی آدمی یا بچے یا مجنون کا پھوڑا بغیر اس کے یا ولی کے اذن کے کاٹ دیا، یا ولی کے اذن کے بغیر بچے کا ختنہ کر دیا، اور وہ مر گیا تو ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ چونکہ اس نے ایسا اذن تو تلف کیا ہے۔ اس وجہ سے اس پر ضمان لازم ہوگی، اور اگر بالغ یا بچے اور مجنون کا ولی (سرپرست) اذن دے دے تو ضمان نہ ہوگی۔

اطباء کے نزدیک بعض مرض موروثی اور متعدی ہوتے ہیں۔ جذامی اور سل کے مریض کے پاس رہنے والا بھی ان امراض کی ہوا سے مبتلائے مرض

ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر کمال شفقت و نصیحت کی بنا پر ان اسباب سے بھی منع فرمایا، جن سے ان کے اجسام و قلوب میں فساد مرض لاحق ہو۔ فی الحقیقت گوشت کا ہے بدن میں اس مرض کے قبول کرنے کی استعداد مخفی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت نقال ہونے کے باعث مجالست و مخالطت رکھنے والے امراض سے تیزی کے ساتھ منفعل و متاثر ہو جاتی ہے۔

جب ثابت ہو گیا ہے کہ بدن کی صحت اور بقا اور اس کا اعتدال ہر حرارت کے لیے طبیعت دافعہ کا ذریعہ ہے تو گویا رطوبت اس کا مادہ ہے اور حرارت اس کا نفع کرتی ہے، اور اس کے فضلات کو دور کرنے اس کی اصلاح و تلطیف کرتی ہے ورنہ بدن فاسد ہو جائے گا اور اس کا درست رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی طرح رطوبت حرارت کی غذا ہے، اگر رطوبت نہ ہو تو بدن جل اٹھے اور اسے خشک کر کے ختم کر دے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے مادہ کا کام دیتے ہیں۔ اس لیے حرارت ہمیشہ رطوبت کو تحلیل کرتی رہتی ہے اور بدل ما یتحلل کے طور پر بدن مزید رطوبت کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکے۔ یہ رطوبت کھانے پینے سے حاصل ہوتی ہے، اگر رطوبت مقدار میں بڑھ جائے تو حرارت اسے تحلیل کرنے سے عاجز رہ جاتی ہے، اس وقت یہ رطوبت فاسد مواد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ بدن مبتلا ہو کر بیمار ہو جاتا ہے اور مادہ کی نوع قبولیت اور استعداد مرض کے لحاظ سے مختلف انواع لاحق ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام احتیاطیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستفاد ہیں:

"وکلوا واشربوا ولا تسرفوا" یعنی کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بدل ما یتحلل کے طور پر کھانے پینے کا حکم دیا، تاکہ اس سے بدن کی کمیت و کیفیت میں نہ زیادہ

حد تک استفادہ حاصل ہو، لیکن جب یہ مقدار بڑھ جائے گی تو اسراف میں داخل ہوگی اس لیے دونوں باتیں صحت کے لیے مضر اور مرض کی ذمے دار ہیں یعنی خورد و نوش بند کر دینا یا اس میں اسراف سے کام لینا۔

پس اللہ تعالیٰ کے ان دو کلمات طیبہ میں حفظانِ صحت کی تمام باتیں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں، جو نبیٔ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ طیبہ کا مطالعہ کرے گا، وہ ایسے حفظ صحت کے لیے سب سے زیادہ اعلیٰ اور عمدہ پائے گا، کیونکہ صحت کی حفاظت، خورد و نوش، لباس، رہائش، ہوا، نیند، بیداری، حرکت و سکون، نکاح، استفراغ اور احتباس، ہر بات حسنِ تدبیر پر موقوف ہے، اب اگر ان باتوں سے بچنا ہی عمل اور عادت کے مطابق اعتدال، قوائد و ہدایات پر عمل کرنا ہی صحت مند یا اس کے قریب ہی رہنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور چونکہ صحت و عافیت بندے پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام اور سب سے بہترین اور اعلیٰ عطیہ اور سخاوت ہے بلکہ صحت کاملہ علی الاطلاق تمام نعمتوں سے بڑھ کر بڑی نعمت ہے۔ اس لیے جیسے اس کی حفاظت، مراعات اور دفاع کا موقع ہے، اس کے لیے اس کی حفاظت کرنا واجب ہے۔

حریتِ تعلیم: حریتِ تعلیم بھی بنیادی حقوق کے ذیل میں آتی ہے:

اسلام نے علم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور تحصیلِ علم کے لیے کسی قسم کا امتیاز نہیں روا رکھا گیا۔ جس زمانے میں اسلام نمودار ہوا، عورتوں کی تعلیم بمنزلہ گناہ کے تھی۔ عرب جاہلیت میں جب عورت کا کوئی خاص مقام ہی نہ تھا۔ نہ اس کے حقوق معین تھے، نہ وہ اس کی اہل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے لیے حقوق معین ہوں اسلام نے بڑی صفائی کے ساتھ جس طرح ہر حیات کے دوسرے حقوق میں مرد اور عورت کو ایک صف میں رکھا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی مرد اور عورت کے درمیان کوئی دیوار نہیں کھینچی۔

چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی صاف و واضح تعلیم یہ ہے کہ:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ — یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا فرض ہے؛

اسلام نے "جاننے والوں" (عالموں) اور "نہ جاننے والوں" (غیر عالموں) کا درجہ کبھی یکساں ماننے سے انکار کر دیا ہے، علم کے سلسلہ میں اسلام نے علم کے انواع متعیدہ و مختلفہ و متعددہ کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ علم جس سے دینی و دنیوی مصلحت پوری ہوتی ہو۔ بس وہی مطلوب ہے، اور حق ہے کہ اس علم کو مذکورہ انواع کے درمیان مشترک کیا جائے۔

یہ بات اصولِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے کہ اس کا دائرہ کسی "خاص" علم کے ساتھ محدود کر دیا جائے یا تعلیم کے لیے ایسے علوم کو روک دیا جائے جو مفید ہوں بلکہ تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں علوم کا مرکز بنا رکھا تھا اور اپنے علوم کی وسعت اور اپنے نظریات کی وسعت کے لیے اسلام کے طبقات علماء نے "غیر اسلامی" علوم سے بھی استفادہ کیا اور انہیں بھی وسعت دی، چنانچہ ہر اہل علم جانتا ہے کہ بن منجم وغیرہ نے فلسفہ یونان کی طرف توجہ کی اور ترجمہ کیا اور ابن رشد وغیرہ نے فلسفہ ارسطو پر شرحیں لکھیں، مامون رشید وغیرہ کے زمانہ میں یونانی علوم خوب اپنائے گئے، چنانچہ بغداد نزاکت اور سرحدت کے تاریخی دور میں علم اور تعلیم کی جو وسعت اور کثرت تھی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام نے حریت فکر اور افادت تعلیم کو کس قدر اہم مانا ہے۔

بہرحال تعجب خیز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ تعجب خیز ہوتا اسلام کی پیش بینی پر جس کا پیش کیا ہوا ایمان، برہان اور حجت اور نظریہ پر قائم ہے، اور باوجود دعوت دیتا ہے کہ:

"ملکوت السموات والارض" دلائل و براہین پر غور کرو، تعجب اور دیکھو اور نہ ہو تعجب یہ نظر انہیں پیدا ہو سکتی، جب تک علوم فلسفہ پر نظر نہ

اور بہت سے نظریات علم سامنے نہ ہوں۔

مسلمان بحث و گفتگو کی قوت میں کس طرح حریف کا مقابلہ کر سکتے تھے اگر وہ انواعِ علوم و فنون سے بے خبر رہتے، جن کی ہر زمانہ میں مختلف انداز سے ضرورت لاحق ہوتی ہے[۳۶]

قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون"

یعنی یہ رسول تمھیں قرآن و دانش کی باتیں بتاتا ہے اور ایسا علم سکھاتا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے[۳۷]

علم جہل کی ضد ہے اور اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں جملہ اقسام کے معلومات آجاتے ہیں۔

قرآن نے مطلق طور پر علم کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم بجائے خود بزرگ شرف کا حامل ہے چنانچہ رسول اکرمؐ کا ایک وصف یہ ہے کہ "تعلیم" تربیت تعلیم رسول کی ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔

۱۔ کفار کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون"

یعنی جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بلاشبہ سب گھروں سے بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے اگر انھیں علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے!

۲۔ پھر فرمایا:

"وتلک الامثال نضربھا للناس"

یعنی ہم یہ مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے

وما یعقلہا الا العالمون"۵ — لیے بیان کرتے ہیں، اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔

۳۔ پھر ارشاد ہوا:

"وما ھذہ الدنیا الا لھو ولعب وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان ط لو کانوا یعلمون"ط — یعنی یہ دنیوی زندگی بجز لہو لعب کے کچھ نہیں اور اصل زندگی دار آخرت کی زندگی ہے اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو ایسا (ہرگز) نہ کرتے۔[۳۹]

یہ ایک سورۂ مبارکہ کی تین مختلف آیات کریمہ ہیں (اور بھی بہت سی ہیں) ان سے علم کی حیثیت اور اہمیت پر کتنی روشنی پڑتی ہے۔ بسط و تفصیل اور اوراق تفسیر کھنگالنے کا یہ موقع نہیں، لیکن مختصراً ان سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے یہ ہیں:

۱۔ مشرکین اگر علم صحیح سے بہرہ اندوز ہوں تو وہ خدا کے سوا کسی اور کو کارساز نہیں مان سکتے۔

۲۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں، جو تاریخ، جغرافیہ، آثار قدیمہ، نفسیات انسانی، سنت اللہ یعنی نظام قدرت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن خود کہتا ہے کہ ان مثالوں کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، اور ان کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں، جو صاحب علم ہوں۔

۳۔ یہ چند روزہ زندگی بے حقیقت ہے، اصل زندگی تو وہ ہے جو اس کے بعد شروع ہوگی، لیکن لوگ اس حقیقت کو فراموش کیے ہوئے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ علم نہیں رکھتے، اگر رکھتے ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔

گویا کفر و اسلام کا مدار "علم" پر ٹھہرا، کفر جہل ہے، اور اسلام علم ہے۔

جب صورت واقعہ یہ ہے تو ظاہر ہے اسلام میں حریت تعلیم کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیے، چنانچہ ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ علم کی ترویج اور فروغ حکومت کی ذمہ داری ہے، یہ اس کا کام ہے کہ علم کو زیادہ سے زیادہ پھیلنے

اور عام کرے، تاکہ لوگ اسلام کو اور اس کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔

اور میری کوئی ذاتی رائے نہیں ہے، خود اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

۱۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" یعنی خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں، جو (اس کی عظمت) کا علم رکھتے ہیں![۳۹]

۲۔ ارشاد الٰہی ہے:

"وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ"[۴۰]

علماء اجلّ نے اس آیت کے ترجمے دو طرح سے کیے ہیں:

ایک تو یہ کہ آیات متشابہات کی تاویل کا علم صرف خدا اور ان لوگوں کو ہے جن کا علم راسخ ہے، وہ کہتے ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات متشابہات کا علم بجز حق تعالیٰ کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ یوں کہتے ہیں، ہم ان پر یقین رکھتے ہیں۔

دونوں ترجموں کی قدر مشترک بہر حال ایک ہی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون" یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے، کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں؟[۴۱]

ان ہر سہ آیات سے کیا معلوم ہوتا ہے؟

۱۔ خدا کی عظمت وجلالت کا صحیح طور پر اندازہ کر کے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

۲۔ آیات متشابہات کا علم ان لوگوں کو ہے جو علم میں راسخ ہیں۔

۳۔ یا وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں، اپنی معرفت الٰہی کی بنا پر کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

۴۔ سب سے آخری اور فیصلہ کن بات یہ ہے کہ عالم اور جاہل برابر

نہیں ہو سکتے ۔!

کیا اس سے بڑھ کر بھی علم کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟ علم کی فضیلت اور اہمیت کیا اب بھی کوئی مشکوک چیز رہے گی؟ جب اسلام علم کو یہ اہمیت دیتا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اسلامی جمہوریت حریت تعلیم کی داعی نہ ہو۔؟ کیا اس طرف سے غفلت کرنا اور اسلام کی طرف سے غفلت کرنا ہم معنی نہیں ہو جاتا؟

احادیث نبوی اور علم کی ترغیب: احادیث نبوی سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:۔

آنحضرتؐ نے اپنے لیئے "شہر علم" اور حضرت علیؓ کے لیے "باب شہر علم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اس سے بڑی سند علم کو اور کیا مل سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: "اگر کسی کی باندی ہو اور وہ اسے تعلیم دے، حسن سلوک کا برتاؤ کرے، پھر آزاد کر دے، پھر شادی کرے تو اس شخص کو دہرا اجر ملے گا!"

آپؐ نے فرمایا: ۱۔ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے!"

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: ۲۔ جس نے حصول علم کے لیے راستہ طے کیا، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا!"

تاوان جنگ بھی علم کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے:

امام احمدؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہ تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔"

حضرت عمرؓ اور ترویج علم: حضرت عمرؓ نے تعلیمی نظام کو بعید ترین گوشوں تک وسعت دی۔ خانہ بدوشوں کو بھی تعلیم سے مستثنیٰ نہیں رکھا، کیونکہ آپؐ کے خیال میں تعلیم و تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، مگر دشواری یہ تھی کہ یہ خانہ بدوش بدو ایک جگہ ٹکتے نہیں تھے، اور

ہر موسم میں اپنی جائے قیام بدل دیتے تھے! اس صورت میں انھیں تعلیم دینا اور ان کی تعلیمی ترقی سے مطلع ہونا کارِ دشوار تھا، پھر بھی آپؐ نے اس عقدۂ دشوار کو حل کر لیا۔

آپؐ نے گشتی نگرانوں کا سلسلہ قائم کیا جو ایک شخص ابوسفیان کی زیرِ نگرانی خانہ بدوش قبائل میں گھوم پھر کے ان کا امتحان لے کر ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ لگاتے تھے۔

حریتِ ملکیت: حریتِ ملکیت کو بھی اسلام بنیادی حقوق میں شمار کرتا ہے:

یاد رکھنا چاہیے —— چور کے لیے جو سزا مقرر کی گئی اور غاصب کی جو تعزیر مقرر کی گئی ہے، اس کی بنیاد بھی یہی حریتِ ملکیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما" — یعنی چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ کاٹ دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لا یحل لاحد ان یاخذ متاع اخیہ عبادۃ او جادا فان اخذہ فلیردہ علیہ" — یعنی کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال ہتھیا لے اور اگر ایسا کرے تو اسے چاہیے کہ واپس کر دے۔

آپؐ نے فرمایا: "جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصہ بھی غصب کرے گا، زمین کے ساتویں طبق سے اتنا حصہ نکال کر اس کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔

اس حدیث سے آزادیٔ املاک کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

زہری کی روایت: بہ روایتِ زہری: "جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسجد کا سوال پیدا ہوا، آپؐ کی تشریف آوری سے

پہلے، اسعدؓ بن زرارہ نے ایک قطعۂ زمین پر نماز کا بندوبست کر رکھا تھا آپؐ نے یہ جگہ مسجد کے لیے موزوں تصور کی۔ یہ قطعۂ ارض دو یتیم لڑکوں کا تھا۔ ان لڑکوں کے ولی اسعدؓ تھے۔ آپؐ نے زمین کی قیمت پیش کی، لیکن اسعدؓ نے اور یتیموں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ بنو نجّار نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے پاس سے قیمت ادا کر دیں۔ آپؐ نے کوئی بات بھی نہیں مانی۔ نہ زمین مفت لی، نہ بنو نجّار کو قیمت دینے دی۔ قیمت دس درہم طے پائی اور آپؐ نے یہ رقم ادا فرما دی۔[۴۶]

حکومت کی ترکیب و تشکیل میں حصّہ: حکومت کی ہیئت ترکیبی اور تعمیر و تشکیل میں حصّہ لینا، اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا ہر شخص کا بنیادی حق ہے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حق دیا ہے اور مسلمانوں نے اس حق کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد بھی کی ہے۔ اور بڑی سے بڑی قربانیاں بھی دی ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے بدنام فرقے، خوارج نے اس سلسلے میں جو سعی و کوشش کی، اور جو قربانیاں دیں وہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن چکی ہیں۔

علامہ اقبال نے جمہوریت کی جو تعریف کی ہے، خوارج اس پر بڑی حد تک پورے اترتے تھے۔ علامہ کا خیال تھا:

"اسلام نے دنیا کو جمہوریت کی روح سے روشناس کیا۔ اسی لیے اسلام نے وحی کا سلسلہ بند کر دیا تاکہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔ بنی آدمؑ کو حریت کی تعلیم دینے اور اس نعمت سے مالا مال کرنے کے لیے وحی کو ختم کرنا لازمی تھا ــــ اسلام میں امامت بھی نکاح کی طرح ایک عمرانی معاہدہ ہے۔ امیر اور قوم کے درمیان۔ اسلامی جمہوریت میں راستے دہی کے لیے کلمہ شہادت ادا کرنا کافی ہے"[۴۷]

خوارج کے نزدیک خلافت کا مستحق ہر وہ شخص ہو سکتا ہے، جو صالح

ہو۔ اور اپنے معاصرین میں بہتر اور برتر ہو۔ اور اس طرح یہ لوگ خلافت کو ایک جمہوری ادارہ سمجھتے ہیں۔

خوارج کا نظریۂ سیاست خلیفہ کے انتخاب اور عزل میں اس نظریے سے ملتا جلتا تھا۔ جو انقلاب فرانس اور انقلاب انگلستان کا محرک تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ مغرب نے انقلاب کا سبق خوارج سے سیکھا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

خوارج کا دستور: خوارج کا دستور وہی تھا، جو خلفائے اولین کا تھا۔ وہ ان دونوں کے اعمال کو حجت قرار دیتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے جوش نے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ جب وہ کسی شہر پر حملہ کرتے تھے تو اپنے آپ کو مسلمین اولین قرار دیتے تھے۔ خوارج کا لفظ انھوں نے خود ہی اپنے لیے وضع کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ائمہ جور کے خلاف خروج کرتے تھے۔

ابو حمزہ خارجی نے ایک موقعہ پر اپنے اصحاب کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"آدھی رات کو اللہ انھیں اس حالت میں دیکھتا ہے کہ یہ قرآن کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ جب کوئی ایسی آیت آتی ہے، جس میں جنت کا ذکر آتا ہے تو یہ وفورِ اشتیاق سے بے تاب ہو کر رونے لگتے ہیں، جب کوئی ایسی آیت آتی ہے جس میں جہنم کا ذکر ہوتا ہے تو یہ کانپنے اور لرزنے لگتے ہیں۔"

یہ لوگ غضب کے بہادر تھے، کسی حریف نے ان سے بڑھ کر دلیر اور جنگ جو کسی کو نہ پایا ہوگا۔ لڑنے میں نیز حملہ کرنے میں چوکس، نیزہ بازی میں طاق۔ تاریخ میں ان کی جرأت و بسالت اور قوت و ہمت کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ زیاد نے دو ہزار سپاہی دے کر اسلم بن زرعہ کو خوارج سے مقابلہ کرنے بھیجا۔ ابو بلال خارجی نے اپنے چالیس آدمیوں کی مدد سے انھیں بھگا دیا۔

یورپ کے مستشرقین نے خوارج پر کافی توجہ کی ہے۔ وان فلوٹن کا خیال ہے کہ "یہ جمہوریت پسند جماعت تھی"۔

پروفیسر نکلسن کا قول ہے "خارجی تحریک کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اگرچہ بظاہر وہ سیاسی معلوم ہوتی ہے"

خوارج کا مسلک:

"خالص عربی جمہوریت کے علمبردار،

عربی شجاعت و شہامت کا کامل نمونہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے داعی!

دفاعِ حرمات پر جان دینے کے لیے تیار!

خدا کے لیے عدل و انصاف، اخلاص اور احسان اور حسن اخلاق کی شرط لازم پر مُصر اور اس سلسلے میں بہت زیادہ سخت اور شقی"[۱۹]

خوارج کے صفات کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب حجاج نے بربر قبیلہ کو مہلب کے پاس بھیجا کہ اسے خوارج کے قتال پر برانگیختہ کرے، اور اس نے اپنی آنکھوں سے خوارج کا اندازِ جنگ دیکھا تو بے ساختہ منہ سے کہہ اٹھا:

"جس قوم سے آپ لڑ رہے ہیں۔ ایسی بہادر اور ثابت قدم قوم میں نے آج تک نہیں دیکھی"۔

پھر حجاج کے پاس وہ واپس آیا تو کہا: "میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن پر خدا ہی غلبہ دے تو فتح ہو سکتی ہے"[۲۰]!

خوارج کا ایک سردار قطری ایک جنگ میں اس طرح نمودار ہوا کہ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈنڈا تھا، اس نے جنگ کے لیے آواز دی، مقابل فوج کا ایک شخص سامنے آیا۔ قطری نے پوچھا:

"کہاں بھاگا جاتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا:

"تم جیسے شخص کے سامنے سے بھاگنا کسی آدمی کے لیے موجب ندامت نہیں ہو سکتا۔"

حوثرہ کو اس کا باپ معاویہ کی فرمائش سے بیعت طاعت دینے آیا تھا، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو اس نے کہا:

"اے بیٹے! اگر تیرا بچہ مانگا لایا ہوں تو اسے دیکھ کا تو اس کی جدائی کے خیال سے تیرا دل نہ چھلے گا۔"

حوثرہ نے جواب دیا:

"والد بزرگوار! خدا کی قسم! نیزے کا گھاؤ میرے لیے بیٹے کے دیدار سے زیادہ خوش گوار ہے۔"

حاشیہ:

[1] [illegible]

[2] سورۂ انعام، پارہ ۸، رکوع ۷، آیت ۸۵، نیز ملاحظہ ہو سورۂ یوسف، رکوع ۸، آیت ۶۸، نیز سورۂ انعام پارہ ۸، رکوع ۸، آیت ۶۳، نیز سورۂ قصص، پارہ ۲۰، رکوع ۹، آیت ۸۹۔

[3] سورۂ نحل، پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، آیت ۷۹۔

[4] السیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۹۲، ۹۳۔

[5] سورۂ نساء، پارہ ۴، رکوع ۴، آیت ۹۳

[6] بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی سب نے اس کو روایت کیا ہے۔

[7] العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) طبع مصر، ص ۹۸

۸ سورۂ ممتحنہ، پارہ ۲۸، رکوع ۲، آیت ۸ -

۹ السیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۰۷، ۱۰۹ -

۱۰ کتاب الاموال (ابوعبید) طبع مصر ص ۳۰ -

۱۱ صحیح مسلم اور صحیح بخاری دونوں کے مرویات میں شامل ہے -

۱۲ صحیح بخاری، کتاب الادب و صلۃ الرحم -

۱۳ السیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۰۱، ۱۰۳

۱۴ نطع — چمڑے کا وہ فرش جس پر مقتول کو بٹھا کر گردن مارتے تھے، کیونکہ خیال یہ تھا کہ اگر مقتول کے خون کے چھینٹے فرش زمین پر پڑیں تو بادشاہ کے لئے یہ چیز نحس ہوگی - لہٰذا خون نطع سے باہر نہیں نکل پاتا تھا -

۱۵ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۵۲، ۵۳، ۷۰، ۷۷، ۸۰، ۸۳، ۸۶، ۸۷، ۱۱۳، ۱۳۴ -

۱۶ حسن المحاضرہ (سیوطی) ج ۲، ص ۶ ؛

۱۷ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین طبع مصر ص ۱۰۴ -

۱۸ تمدن عرب (موسیو لیبان) ص ۲۸۲، ۱۹ اخبار الاندلس (مکاس) ج ۴، ص ۱۱ -

۲۰ کتاب الاخلاق (احمد امین) طبع مصر ص ۲۸۲، ۲۱ صحیح بخاری کتاب الفرائض من باب ترک

۲۲ اعلام النبوۃ، ص ۵۵، ۲۳ سورۂ بقرہ، پارہ ۲، رکوع ۳۴، آیت ۲۵۸ -

۲۴ سورۂ یونس، پارہ ۱۱، رکوع ۱۰، آیت ۳۱، ۲۵ سورۂ کافرون پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۶ -

۲۶ السیاسۃ الشرعیہ (خلاف) طبع مصر، ص ۲۹، ۱۰۱، ۱۳۱ -

۲۷ سورۂ اسرائیل، رکوع ۱۲، آیت ۱۷ -

۲۷ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۱۳۲، طبع مصر -

۲۸ السیاسۃ الشرعیہ ص ۱۳، ۱۴، ۲۳ (علامہ خلاف) طبع مصر -

۲۹ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۱۳۷، طبع مصر -

۳۰ موطا امام مالک رض عن عمر بن الخطاب رض

۳۱ زاد المعاد، ج ۴، ص ۱۳۴، (ابن قیم) طبع مصر۔

۳۲ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، عن عمرو بن شعیب رض

۳۳ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۵،

۳۴ سورۂ اعراف، رکوع ۲، آیت ۳ ۴۔

۳۵ زاد المعاد، ج ۳، ص ۳۵۴، ۳۵۵ (ابن قیم) طبع مصر۔

۳۶ السیاسۃ الشرعیہ، ص ۱۰۴، ص ۱۰۶، (علامہ خلاف) طبع مصر۔

۳۷ سورۂ بقرہ، پارہ ۲، رکوع ۱۸، آیت ۱۵۱

۳۸ سورۂ عنکبوت، پارہ ۲۱، آیات ۴۰، ۴۲، ۴۳،

۳۹ سورۂ فاطر، رکوع ۳، آیت ۲۹، پارہ ۲۲۔

۴۰ سورۂ آل عمران، پارہ ۳، رکوع ۱۲، آیت ۸

۴۱ سورۂ زمر، پارہ ۲۳، رکوع ۱، آیت ۱۰

۴۲ ابن ماجہ، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، بیہقی، نسائی،

۴۳ زاد المعاد، ج ۲، ص ۱۳۸ (ابن قیم) طبع مصر۔

۴۴ اصابہ فی احوال الصحابہ (ابن حجر دمشقی) تذکرہ قیس بن ثابت۔

۴۵ السیاسۃ الشرعیہ، ص ۹۷، (علامہ خلاف) طبع مصر۔

۴۶ زاد المعاد، ج ۱، ص ۲۰۸ (علامہ ابن قیم) طبع مصر۔

۴۷ اقبال ریویو، جون ۱۹۶۶ء۔

۴۸ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۶۰، ۱۱۲، ۱۱۸،

۴۹ وفیات الاعیان، (ابن خلکان) ج ۱، ص ۴۳۰،

۵۰ مسائل طبری، ج ۲، ص ۵۰۔

(۸)

عورت، اس کی شخصیت اور حقوق!

اسلام سے پہلے بھی دنیا تھی، اور اس کے شب و روز تھے، اور حقوق و اختیارات کے حدود تھے، حکومتیں تھیں، اور ان کے قانون کے آئین و دستور تھے، بادشاہ تھے، اور ان کے احکام و فرامین تھے، مذاہب تھے اور ان کے ارشادات و ہدایات تھے، سماج تھا، اور اس کے اصول و ضوابط تھے، سوسائٹی تھی، اور اس کے آداب و اطوار تھے، لیکن عورت کو ایک شہری کی حیثیت سے مساوی حقوق کبھی حاصل نہ ہوئے۔ حریم بیاں رہیں، اور غزل کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے حسن و جمال کے ساتھ تخت و تاج سجتے رہے۔ اس کی سنگینی اور بیانی رونق محل نثار کرنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ اس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اسے سر بازار نیلام بنا کر فروخت کیا گیا، اسے بازار حسن کی زینت بنایا گیا، غرض جہاں تک اس کی رضامندی سے بہرہ ور ہونے کا تعلق تھا اس کی قدر افزائی میں کمی نہیں کی گئی، اور اگر اس نعمت خداداد سے وہ محروم نہ آئی، تو اسے دست تظلم سے بچنے والا بھی کوئی نظر نہیں آیا۔

عورت کی حیثیت اسلام سے پہلے: عائلی اور خاندانی زندگی میں اسے وہ مقام کبھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک انسان کو حاصل ہونا چاہیے اس کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا کہ وہ اپنی رائے رکھتی ہے، نہ انفرادیت کی

حامل ہے، نہ اس کی کوئی شخصیت ہے، بیوی کی حیثیت سے وہ شوہر کی نگاہِ کرم کی محتاج رہی، بیٹی کی حیثیت سے باپ نے جب اور جہاں چاہا، شادی کر دی۔ شوہر نے اگر ظلم کیا تو سعادت مندی یہ تھی کہ خاموشی کے ساتھ ظلم سہتی رہے۔ باپ اور بھائی نے اس کی رائے نظر انداز کر کے اگر اسے کسی کو سونپ دیا، تو اسے مجالِ دم زدن نہ تھی، باپ کی جائداد اور مال میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، شوہر کے متروکہ مال و سامان میں اس کا حصہ مفروض تھا۔ وہ خود کسی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی، اس کی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا۔ شادی کے بعد اس کی ذاتی حیثیت یکسر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے نام تک سے محروم ہو جاتی تھی، اور اسے "مسز" فلاں کا مقام حاصل ہو جاتا تھا۔ شادی کے وقت اگر اسے از قبیل زر نقد و جائداد، تحائف اور عطایا ملتے تھے تو فوراً اس کے شوہر کی ملک بن جاتے تھے۔ ملک کی سیاست میں نظامِ حکومت میں انتخابات عام میں سرگرمی اور نیم سرکاری مناصب میں آئین و قانون کے دربار میں نہ اس کا کوئی حصہ تھا، نہ اس کی کوئی آواز تھی۔ اس کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ اور یہاں بھی اسے چین اور سکون حاصل نہ تھا۔ وہ گویا ماں کے پیٹ سے باندی پیدا ہوئی تھی، اور گورِ لحد تک اس کی یہ حیثیت برابر قائم اور برقرار رہتی تھی۔ اسلام سے پہلے بھی یہی صورت تھی اور اسلام کے آنے کے بعد بھی۔ جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، اسی روش پر قائم رہے۔ یہ عمومی کیفیت تھی، مستثنیات کا ذکر نہیں۔

اسلام نے عورت کو حقوقِ انسانی عطا کیے: لیکن اسلام نے نہایت صاف طور پر، نہایت وضاحت اور وضاحت کے ساتھ عورت کے حقوق متعین کیے۔ اور یہ تعیین حقوق پر مبنی تھی۔ مساوات اور حقوق

شہریت میں یکسر اور کامل مساوات پر۔ قرآن کریم میں جہاں عملِ خیر پر ثواب کی بشارت ہے اور جہاں عملِ ناروا پر عتاب کی وعید ہے، وہاں مرد اور عورت کی، مومن اور مومنہ کی، نہ صرف کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے نہ صرف دونوں کے مابین کوئی حدِّ فاصل نہیں قائم کی گئی ہے، نہ صرف دونوں کے مابین کوئی امتیازی خط نہیں کھینچا گیا ہے، بلکہ واشگاف الفاظ میں دونوں کا مساوی مرتبہ اور درجہ تسلیم کیا ہے، عورت کی انفرادیت اور شخصیت کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے، اتنا ہی جتنا مرد کا، وہ شوہر کا ضمیمہ نہیں بنے گی، بلکہ اپنے نام سے پکاری جائے گی۔ باپ کی وراثت میں اس کا حصّہ ہوگا۔ شوہر اسے مہر بھی دے گا، خطا یا سہو پر اسے سزا دے اور جب مرے گا تو اس کی املاک و جائداد کی وہ حصّے دار بھی ہوگی۔ شوہر کی زندگی میں اس کے ساتھ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی باندی بن کر نہیں، شوہر اسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے والدین کی خدمت کرے۔ حد یہ ہے کہ شوہر اسے اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ جو بچہ شوہر کے صلب اور عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہو، اسے دودھ پلائے۔ جس طرح شوہر عدم اتفاق کی صورت میں اسے طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح وہ خلع لے سکتی ہے۔ ملکی امور و مہمات میں مذہبی معاملات و مسائل میں سماجی سرگرمیوں اور مشاغل میں وہ پورا حصہ لے سکتی ہے اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ یہ اتنی مفصل بحث ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن ہم صرف ایک باب لکھ رہے ہیں، لہٰذا ہمیں اختصار سے کام لینا ہوگا۔

قرآن حکیم اور حقوقِ نسواں: عورت کے حقوق اور اس کی شخصیت سے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہمیں پیشِ نظر رکھنی ہوگی، وہ قرآن حکیم ہے۔ پھر سُنّتِ نبویؐ، اور اسلامی جمہوریت — ان چیزوں

کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جبکہ اس کی تائید میں خلفائے راشدین اور دوسرے اکابر کا عمل بھی موجود ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ولھن مثل الذی علیھن" یعنی جیسے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔

پھر آگے چل کر قرآن کریم میں وارد ہوا:

"ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" یعنی عورتیں مردوں کی اور تم مرد عورتوں کے لباس ہو۔[۹۲]

پھر ارشاد ہوا:

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" یعنی جیسے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر بھی ہیں۔[۹۳]

عورت کی انفرادیت اور شخصیت کا اسلامی جمہوریہ میں کیا مقام ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک عورت آزاد ہونے کے بعد اپنے معاملات میں کس درجہ آزاد ہے:

جناب ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ بریرہ (لونڈی کا شوہر ایک غلام مغیث تھا۔ آزادی کے بعد جدائی ہو گئی) گویا کہ وہ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے اور بریرہ اس کے پیچھے روتا پھر رہا ہے۔ جس کے آنسو اس کی داڑھی پر بہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب عباسؓ سے فرمایا: "اے عباس! کیا تم کو مغیث کی محبت اور بریرہؓ کی نفرت پر تعجب نہیں ہوتا؟"

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "بریرہؓ کاش تو اس کے پاس واپس چلی جاتی!"

بریرہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟"

فرمایا: "مشورہ"
بریرہؓ نے عرض کیا: "مجھے اس کی ضرورت نہیں"[۳]
علامہ ابن قیمؒ نے اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:
"بریرہؓ نے آپؐ کی سفارش سفیث کو دوبارہ شوہر بنا لینے کی نہیں مانی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ برہمی کا اظہار کیا، نہ عتاب فرمایا"[۴]

جنگ میں پیکار میں عورت کو سرگرم کار ہونے کا حق حاصل ہے

جنگ احد میں جب کفار کے عام حملے کے بعد آپؐ صرف چند فدائیوں کے ساتھ تنہا رہ گئے، تو ایک خاتون ام عمارہؓ آگے بڑھیں اور آپؐ کے سامنے چٹان کی طرح جم کر کھڑی ہو گئیں، کفار کی یورش کا انھوں نے تیر و شمشیر سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابن قمیہ جب آپؐ کے قریب پہنچ گیا تو ام عمارہؓ نے آگے بڑھ کر اس کا وار روکا، زخمی ہوئیں اور کندھے پر گھاؤ پڑ گیا، پھر بھی ایک زبردست وار دشمن پر کیا۔[۵]

جنگ احد میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور چند دوسری صحابیات نے خواتین انصار کے ساتھ مشک میں بھر بھر کر انھیں پانی پلایا، اور زخمیوں کی خبر گیری کی۔[۶]

دینی معاملات میں بھی عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں: حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن نکلتے تو لوگوں کے ساتھ دو رکعت نماز عید پڑھتے، پھر سلام پھیر کر اپنی سواری پر چڑھ کر لوگوں کے سامنے تشریف لاتے، لوگ بیٹھے ہوتے، ان سے آپؐ فرماتے: "صدقہ کرو"
یہ سن کر اکثر عورتیں مختلف اشیاء انگوٹھی اور بندنی کا صدقہ کرتیں۔[۷]

جنگ خندق کے موقع پر جب حضرت حسان بن ثابتؓ کی ہمت جواب دے گئی تھی، حضرت صفیہؓ نے ایک یہودی بدمعاش کو ایسا وار کیا کہ فوراً ختم ہو گیا۔[۸]

اسی طرح جنگ حنین میں حضرت ام سلیمؓ خنجر بدست کفار سے مقابلے اور مقاتلے کے لیے سرگرم نظر آتی ہیں۔[۹]

کیا ان واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت صرف گھر کی ملکہ نہیں، میدانِ جنگ کی سورما بھی ہے؟

عورت اسلام کی داعی اور مبلغ: اور صرف میدان جنگ کی سورما ہی نہیں، اسلام کی داعی اور مبلغ بھی۔ حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے کہ نبی صدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، مگر راستے میں اپنی بہن فاطمہؓ بنت خطاب کے مسلمان ہونے کا حال سنا، تو وفورِ غضب سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہاں پہنچے، بہن اور بہنوئی پر حملہ آور ہوئے، لیکن قرآن کی چند آیات سن کر عالم یہ ہوا کہ جن آنکھوں سے غضب کے شعلے برس رہے تھے، ندامت کے آنسو بہنے لگے، اس کے بعد دربارِ رسولؐ میں آ گئے، اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔[۱۰]

کیا یہ ایک عورت ہی کی کامیاب تبلیغ نہ تھی؟

ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ اسلام کا غلبہ دیکھ کر فرار ہو گئے، ان باپ بیٹوں نے اسلام کے خلاف اور داعیٔ اسلامؐ کے خلاف کیا کچھ نہ کیا تھا؟ کون سی اذیت تھی جو نہیں دی؟ کون سا دقیقہ تھا جو اٹھا رکھا تھا؟ کون سے غیر انسانی اور سفاکانہ افعال تھے جن سے اجتناب کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ عکرمہؓ کو اب اپنی خیر نہیں نظر آ رہی تھی، وہ داعیٔ اسلامؐ کے ذمہ انتقام سے خائف تھے، لیکن رحمۃ للعالمین کی رحمت و عطوفت سے ناواقف تھے، مگر ان کی رفیقۂ حیات ام حکیمؓ رحمۃ للعالمین کا نظارہ کر چکی تھیں، گئیں، شوہر کو لائیں، اور اس کا سر آستانۂ رسالت پر جھکا دیا۔[۱۱]

قریش کے مرد نئے دین کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، ان کی بزم و انجمن میں بس یہی چرچا تھا کہ اسلام کی صدا کس طرح بند کی جائے؟ اور

داخلی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز کس طرح خاموش کی جاتی؟ اسکیمیں بنتی تھیں، سازشیں ہوتی تھیں، منصوبے تیار ہوتے تھے، دجل و فریب اور جنگ و پیکار کے نقشے تیار کیے جاتے تھے۔

لیکن ایک صورت ایسی تھی جو خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی جو چپ چاپ قریش کے گھروں میں جاتی، اور ان کی عورتوں کو اسلام کی حقیقت اور فضائل سے آشنا کرتی، اور کوئی شبہ نہیں کہ خواتین قریش میں اسلام کا میلان جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی پیدا ہوا، اس میں خاموش مبلغ خاتون ام شریک رضی اللہ عنہا کا بہت بڑا حصہ تھا۔[۱۲]

تبلیغ اسلام کی راہ میں عورتوں نے محبت اور الفت کی قربانی بھی دی۔

ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے خود محبت کرنے اور ان کی محبت کی معترف ہونے کے باوجود اس وقت تک شادی نہیں کی جب تک وہ مسلمان نہیں ہو گئے۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا، کفر اور اسلام میں اجتماع نہیں ہو سکتا۔ کفر کی آلودگی اسلام کی نفاست سے میل نہیں کھاتی۔ کفر کو چھوڑ دو، اسلام کے دائرے میں آجاؤ، میں تمھاری ہوں۔

عورت دشمن کو امان دے سکتی ہے

جنگ کے سلسلے میں جو اختیارات مردوں کو حاصل ہیں، عورتوں کو بھی حاصل ہیں۔ جس طرح ایک مرد کسی کو امان دے سکتا ہے اور سالارِ لشکر اس کی دی ہوئی امان قبول کرنے پر مجبور ہے، عورت بھی اس کی مجاز ہے اور مرد کی طرح امان دے سکتی ہے اور اس کی دی ہوئی امان کو حاکم یا سپہ سالار رد بھی نہیں کر سکتا۔ اس حکم میں جہاں دشمن کے ساتھ رعایت ہے وہاں حقوق عامہ کی بھی رعایت ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابو العاص رضی اللہ عنہ کو امان دی جو رسول اللہ نے قبول کر لی۔ اور فتح مکہ کے بعد ام ہانی رضی اللہ عنہا نے ایک مشرک کو امان دی جسے آپ نے قبول فرما لیا۔[۱۳] بالکل اسی طرح جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی

حضرت ابو بکرؓ وغیرہ کی سفارش پر کئی دوسرے اسلام کے دشمنوں کو معاف کیا، اور لطف و کرم سے سرفراز فرمایا؛

ابن جریرؒ کے نزدیک عورت قاضی اور حاکم بن سکتی ہے:

بقول ماوردی ابن جریر تو عورت کی مساوات کے اس درجہ قائل ہیں کہ ان کے نزدیک ہر قسم کے احکام میں عورت، قاضی اور حاکم بن کر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے[۱۱] اور ابن جریر کی یہ رائے محض ذاتی رائے نہیں ہے، بلکہ اس کی تائید میں آثار اور اخبار بھی موجود ہیں:

صلح حدیبیہ۔ بنا بر یہ عجیب قسم کی صلح تھی، مشرکین مکہ کے تمام شرائط آپؐ نے تسلیم کر لیے تھے۔ چنانچہ مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل نہیں ہو سکے، معاہدے کے مطابق اگلے سال داخلے کی جو شرط تھی تو وہ دل شکن تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرکین میں سے کوئی مدینہ آ جائے تو اہل مکہ اسے واپس لا سکتے تھے۔ مسلمانوں میں سے کوئی مکہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس طلب نہیں کر سکتے تھے۔ اس معاہدے نے مسلمانوں پر کچھ عجیب طرح کی افسردگی اور اضمحلال کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ قرآن نے اس معاہدے کو فتح مبین سے تعبیر کیا تھا۔ اور بعد میں ثابت ہوا کہ تھا بھی ایسا ہی، لیکن فی الوقت تو ہر جہت سے شکست ہی نظر آ رہی تھی، کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جو مغموم و ملول نہ ہو، سب سے زیادہ مضطرب حضرت عمرؓ تھے۔ وہ اس معاہدے کو نہ صرف حد درجہ ناقابل قبول سمجھتے تھے، بلکہ صحابہؓ سے اس پر جدل و بحث بھی کرتے تھے، آنحضرتؐ نے معاہدے کی تکمیل کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ یہیں قربانی کر لیں اور واپس چلیں، لیکن زبان رسالتؐ سننے کے باوجود از خود رفتگی اور آشفتہ خاطری کا یہ عالم تھا کہ تعمیل ارشاد کی تعمیل کے لیے کوئی نہیں اٹھا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا[۱۲] بنا بریں یہی کیفیت قائم رہی، آپؐ کو صدمہ ہوا اور اندر تشریف لے گئے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے رائے دی

کہ اب کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ آپ باہر تشریف لے جائیں۔ اپنے جانوروں کی قربانی کریں، اور حلق (سر منڈانا) کرالیں۔ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ لوگ اب تک اس لیے متامل تھے کہ شاید معاہدہ منسوخ ہو جائے۔ مگر جب آپؐ کو قربانی کرتے اور حلق کراتے دیکھا تو سمجھ گئے فیصلہ ہو چکا۔ اور اب تو یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ سب سے پہلے وہ سر منڈوائے۔

امام الحرمین نے، حضرت ام سلمہؓ کی اس فراست، تدبر اور اصابت رائے کے متعلق بالکل بجا فرمایا ہے کہ اصابت فکر و رائے کی ایسی شان دار مثال ڈھونڈھنے سے کہیں تاریخ میں نہیں ملتی[۱۸]۔ اور امر واقعہ بھی یہی ہے۔ اگر خدانخواستہ لوگ عدم تعمیل حکم نبویؐ پر قائم رہتے تو ان کے ایمان کا حشر کیا ہوتا؟ ان کا انجام کیا ہوتا؟ اور یہ کوئی معمولی لوگ نہ تھے۔ ان میں کیسے کیسے جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔!

حضرت ام سلمہؓ کو دینی معاملات میں بھی بڑی بصیرت حاصل تھی۔ انھوں نے فتوے کم دیئے، لیکن جو فتوے دیے وہ ایسے جامع و مانع ہیں کہ کسی پہلو سے ان پر ردّ و قدح نہیں ہو سکتی، جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے بیان کیا ہے[۱۸]۔

عورت کی انفرادیت اور شخصیت کے تحفظ کا اندازہ اس حدیث سے ہو سکتا ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرے والد نے میرا نکاح کر دیا ہے، میں پسند نہیں کرتی۔

نبی صلعم نے اسے اختیار (فسخ نکاح) دے دیا[۱۹]۔

اسلام نے کنواری لڑکی تک کو یہ حق دیا ہے کہ اگر والدین اس کی شادی خلاف مرضی کر دیں تو وہ قاضی کی عدالت میں اس نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اسلام کے عورت پر بے شمار احسانات ہیں۔ انہی میں ایک یہ عظیم و جلیل احسان بھی ہے، جسے مسلمانوں نے "ناک" کے خیال سے غصب کر رکھا ہے گویا ان کی ناک اسلام سے بڑی ہے۔

عورت کے اختیارات اپنے حالات پر: عورت کو اپنی شخصی اور ذاتی زندگی سے متعلق جو اختیارات و حقوق حاصل ہیں، بہت واضح ہیں:

سنن ابوداؤد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "یتیم بچی کے متعلق اس کا اذن طلب کیا جائے، اگر وہ خاموش رہے تو یہی اس کا اذن ہے، اور اگر انکار کر دے تو پھر اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔"

یتیموں کی بے بسی اور کس مپرسی اظہر من الشمس ہے۔ اور یتیم لڑکی تو ہر معاشرہ میں ایک ایسی پونجی ہوتی ہے جس پر ہر ہر شخص کی پوری دسترس ہوتی ہے۔

لیکن اسلام نے یتیموں کا خاص خیال رکھا ہے: نہ صرف ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کی ہے، ان پر ظلم و زیادتی کو روکا ہے اور انہیں وہی حقوق و مراعات عطا کیے ہیں جو دوسروں کو حاصل ہیں اور خاص طور پر یتیم لڑکی کے بارے میں تو اس کے احکام اور زیادہ سخت ہیں، چنانچہ نکاح کے بارے میں اس پر کوئی قدغن نہیں ہو سکتی، وہ آزاد ہے، اس کا نکاح صرف اس کی مرضی اور اجازت سے ہو سکتا ہے۔

ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا، مگر مہر مقرر نہیں کیا، خلوت کی اور فوت ہو گیا۔ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت کے لیے مہر مثل ہوگا، نہ افراط ہوگی نہ تفریط۔ اس کا یہ اثر ہے کہ عدت اور اس پر چار ماہ دس دن کی مدت بھی لازم ہے۔

سنن اور مصنف میں حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ کی بصرہ بن اکثم سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت سے جو باکرہ تھی نکاح کیا، میں نے خلوت کی تو معلوم ہوا وہ حاملہ تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، چونکہ تم نے اس سے خلوت کی ہے اس لیے مہر دینا پڑے گا، پھر دونوں میں تفریق کرا دی۔

"خاندانی منصوبہ بندی" کا چرچا آج کل عام ہے۔ عرب بھی جب اولاد کے خواہاں نہیں ہوتے تھے تو اس پر عمل کرتے تھے۔ آپ نے اس کی ممانعت تو نہیں فرمائی لیکن رضامندی طرفین کو ضروری قرار دیا۔

سنن احمدؒ اور سنن ابن ماجہؒ میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد عورت (یعنی باندی نہ ہو) کی اجازت کے بغیر اس سے عزل کرنے کو منع فرمایا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین میں مجھے کوئی عیب نظر نہیں آتا، لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں (یعنی ان کے دین میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں، لیکن میرا دل ان سے نہیں ملتا۔ لہٰذا خطرہ ہے کہ اس چیز کے باعث میرا دین خطرے میں پڑ جائے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کا باغ (جو مہر میں ملا تھا) واپس کر دو گی؟

انھوں نے عرض کیا: جی ہاں کر دوں گی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثابتؓ! باغ قبول کر لو اور اسے طلاق دے دو!

عورت کے اجلال و احترام کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ شوہر اگر بغیر گواہ کے بیوی پر قسم کھا کر بدچلنی کا الزام لگائے، اور بیوی قسم کھا کر انکار کرے اور دونوں جھوٹے پر لعنت کریں، تو دونوں میں تفریق کرا دی جائے گی۔

حضرت ابن شہاب رضؓ کا قول ہے کہ لعان کرنے والوں کے مابین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفریق کرادی اور فیصلہ فرمادیا کہ اب شوہر بچہ کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ نہ عورت پر زنا کی تہمت لگا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو سزا پائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکے کو متہم کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا۔

آپؐ نے یہ بھی فیصلہ فرمادیا کہ اب شوہر کے ذمہ عورت کی سکونت اور نفقہ واجب نہیں رہا، کیونکہ دونوں میں افتراق بغیر طلاق کے واقع ہوا ہے۔

سہل رضؓ کا قول ہے کہ عورت کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا، وہ اپنی ماں سے منسوب ہوگا، اس کی جائداد کا وارث بھی ہوگا وہ بھی بیٹے کی وارث بننے کا حق رکھے گی۔

لعان کے نتیجہ میں تفریق کے بعد یہ دونوں مرد۔ عورت پھر کبھی بھی میاں بیوی نہیں بن سکتے۔

بچے پر باپ سے زیادہ ماں کا حق ہے: ابوداؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ رضؓ بن عمرو کی حدیث درج کی ہے کہ ایک عورت آپؐ کے پاس آئی اور عرض گذار ہوئی:

"یا رسول اللہ! یہ میرا لڑکا ہے۔ میرا پیٹ اس کا برتن ہے، میرے پستان اس کا مشکیزہ ہیں۔ میری گود اس کے لیے جائے امان ہے، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور اب وہ مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا:

"اس لڑکے کی پرورش کرنے کی تو زیادہ حقدار رہتی، جب تک دوسرا نکاح نہ کرلے۔"

شوہر اگر بیوی کے مصارف برداشت نہیں کرسکتا تو قاضی کو حق ہے کہ تفریق کرادے۔

دارقطنی میں سعید رضؓ بن المسیب کی روایت ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا

نفقہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس صورت میں ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت کردہ ایک حدیث بھی اسی مفہوم و معنی پر دلالت کرتی ہے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں کہا ہے کہ ہم سے سفیان نے، انھوں نے ابوزناد سے روایت کی کہ انھوں نے ایک مرتبہ سعید بن مسیب سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا جو اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ آیا ان دونوں میاں بیوی میں تفریق کرا دی جائے گی؟

انھوں نے کہا: "ہاں"[۲۱]

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بھی فقہ و فضل، فہم و فراست، دقت نظر اور اجتہاد میں اپنی مثال آپ تھیں، اگر ام المؤمنین رضؓ نہ ہوتیں تو تفسیر، حدیث، فقہ اور اجتہاد کے بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے[۲۲]

اس کے علاوہ بھی زندگی کے دوسرے سودمند اور مفید مشاغل میں مسلمان خواتین مصروف و منہمک رہتی تھیں۔ تجارت اور کاروبار کرتی تھیں[۲۳] اور طبابت کرتی تھیں۔ بلکہ زمینداری اور نشتر زنی بھی کرتی تھیں۔ ادب اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں[۲۴]

عہدِ ابوبکر صدیق رضؓ میں جب مسیلمہ سے جنگ ہوئی تو حضرت ام عمارہ رضؓ صحابیہ نے بھی اس میں شرکت کی، کئی زخم کھائے اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھیں[۲۵] قبرص پر جب مسلمانوں نے ۲۸ھ میں حملہ کیا۔ تو حضرت ام حرام رضؓ اس میں شریک تھیں[۲۶]

حضرت عمر رضؓ کے عہد خلافت میں حضرت عیاض بن وہب رضؓ نے جنگ کے ایک موقع پر مسلمان خواتین میں ہتھیار تقسیم کیے اور انھیں تاکید کی کہ خبردار، دشمن کا کوئی سپاہی ادھر آئے تو زندہ نہ جانے پائے[۲۷]

غزوۂ خندق میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے کی اطلاع حضرت فاطمہؓ کو ملی تو انھوں نے میدان جنگ کا رُخ کیا، زخم دھویا، جب خون کسی طرح بند نہ ہوا تو کھجور کی خاکستر زخم پر رکھی تب جریان خون کا سلسلہ رکا۔[۲۹]

عورتوں کا جنازہ اس طرح لحد کی طرف سے جایا جاتا تھا جس طرح مردوں کا۔ حضرت فاطمہؓ کو اس میں بے حد تنگی کا پہلو نظر آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسماء بنت عمیس سے ذکر کیا۔ تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ کھجور کی شاخیں تابوت پر لگائی جائیں اور ان پر کپڑا ڈال دیا جائے۔ حضرت فاطمہؓ نے جیسا کہ استیعاب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ تجویز بہت پسند فرمائی۔ جب سے عورت اور مرد کے جنازے میں امتیاز رکھا جانے لگا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جنگ یرموک پیش آئی، اس میں بھی خواتین نے شرکت کی، جن میں متعدد جلیل القدر صحابیات بھی شامل تھیں، ایک انصاری خاتون اسماء بنت یزید نے تو صرف چوب خیمہ سے کئی رومیوں کو ہلاک کر ڈالا۔[۳۰]

حضرت عمرؓ کا بیان: "عہد جاہلیت میں ہم عورتوں کو زندہ درگور کرتے تھے، قرآن میں متعلق آیت نازل ہوئی تو ہم عورتوں کی قیمت کا اندازہ ہوا۔"[۳۱]

اور پھر اس کے بعد فاروق اعظمؓ کا طرز عمل یکسر بدل گیا، چنانچہ شاید وہ خلفائے راشدینؓ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک صحابیہ حضرت شفاء بنت عبداللہ سے کئی بار مہمات امور میں مشورہ لیا، اور کئی مرتبہ انھیں ہزار کی تنخواہ کا کام بھی سونپا۔[۳۲]

فقہ کی کتابوں میں بھی عورت کے حقوق پر کافی بحث کی گئی ہے، اور ان کی تعیین کی گئی ہے، اور انھیں اسلام کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے قبول کیا گیا ہے۔

ابن قیمؒ اور ابو حنیفہؒ کا مسلک: علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

جب مرد اپنی بیوی سے بوقتِ نکاح وعدہ کرلے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے گا۔ تو اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے۔ اور اگر شادی کرلی تو پہلی بیوی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہے[۳۳]

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا رجحان یک زوجگی کی طرف تھا، وہ اسی کو مناسب سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ خلیفہ مہدی سے کہا:

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جابرؓ بن عبداللہ سے روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا سرور میں رہتا ہے اور دو بیویوں والا شرور کا شکار بنتا ہے۔ یہ روایت سُن کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے ساتھ جیسے اتفاق نہ ہو تجربہ کرکے دیکھ لے، پھر جابرؓ ہی کا قول نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ابراہیم کو شاید تجربے کا موقع نہ ملا۔ اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا، کوئی وہ برتاؤ اگر نہ کرسکے تو ظالموں میں شمار ہوگا۔ پھر وہ حدیث سنائی جس میں ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے والا قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہوگا، امام صاحبؒ نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت چاہیئے اور اپنے لیے میں نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے، اور فرمایا بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں ہے، پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلعم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ پس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا۔ راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے۔ لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا۔

امام صاحبؒ کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی تو تعدد ازدواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے آجاتا اور

پہلی صدی تک کے مسلمانوں کے خیالات کی وہ ایک تاریخی شہادت ہوتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں، ان کا بہترین جواب امام صاحبؒ کا یہ بیان ہو سکتا ہے:

یک زوجگی کی تائید ائمہ فقہ کی طرف سے: حضرت امام ابو حنیفہؒ نے خلیفہ منصور اور اس کی بیوی کے درمیان تنازعہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا:

"امیر المؤمنین سنیے! ایک بیوی سے زیادہ عورتوں کی اجازت شریعت نے ایک شرط کے ساتھ دی ہے، یعنی ان ہی لوگوں کے لیے اجازت ہے جو عدل اور انصاف سے کام لے سکتے ہوں۔" اور اس کے بعد فرمایا:

قال اللہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔

لیکن جو انصاف سے کام نہ لے یا جسے اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر پائے گا تو اس کو چاہیے کہ ایک عورت سے آگے نہ بڑھے۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے: "کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح پر قناعت کرو!"

یہ ارشاد فرمانے کے بعد امامؒ حضور سے کہنے لگے: "ہمیں چاہیے کہ اللہ کے بنائے ہوئے آداب کو اختیار کریں، اس کی نصیحتوں پر عمل کریں۔"[۳۴]

ائمہ اربعہؒ میں سے ایک اور امام حضرت احمد بن حنبلؒ کا مسلک بھی امام صاحبؒ کے مسلک کے مطابق ہے، ان کے نزدیک بھی صرف ایک عورت سے شادی کرنا افضل ہے۔[۳۵]

حنابلہ کے نزدیک صرف ایک ہی عورت سے شادی کرنا "مستحب (مسنون)" ہے۔ ازدواج زیادہ نہ ہوں۔ کیونکہ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں عدل نہ ہونے کا خدشہ ہے۔ جس سے شوہر حرام میں پڑ جانے کا ہے۔[۳۶]

خارجی خواتین کی سیاسی قربانیاں: خارجی فرقہ فکری گمراہی میں خواہ کتنا ہی مبتلا رہا ہو۔ لیکن اس فرقے کے لوگ اپنے عقیدے کے لیے ہر قربانی

دینے کے لیے بڑی جرأت کے ساتھ ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ یہی حال خارجی خواتین کا تھا۔

"خوارج بڑے بہادر تھے۔ جرأت اور ہمت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ خارجی عورتوں نے بھی مختلف جنگوں اور لڑائیوں میں ہر طرح کے شدائد و مصائب کا بے تکلفی سے مقابلہ کیا۔ خارجی عورتوں کی جرأت و بہادری دیکھ کر زیاد ناخوش بھڑک اٹھتا تھا، اسے اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ مشرک عورتوں کے قتل کرنے سے منع کیا ہے تو مسلمان عورتوں کو کس طرح قتل کیا جائے؟

لیکن اس کی نظر میں خارجی عورتیں مشرک عورتوں سے کہیں بڑھ کر ایک بڑا اور اہم خطرہ تھیں۔ یہ اپنے وجود سے خوارج کا حوصلہ بلند رکھتیں اور ان میں جرأت پیدا کرتیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک خارجی دس آدمیوں پر بھاری ہوتا۔ اور چونکہ اس فتنۂ عظیم کی سرکوبی لازمی تھی، لہٰذا عقوبت کے وہ تمام طریقے زیاد نے اختیار کیے جن سے لوگ قبل ازیں ناواقف تھے۔ ابن زیاد نے قسم کھائی تھی کہ اگر کوئی خارجی عورت اس کے ہاتھ آگئی تو اسے ایسی سزا دے گا کہ خوارج کے دفتر میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ یہ اضطراب موت کی دہشت پر مبنی نہیں تھا کیونکہ جس راستے پر وہ چل رہے تھے وہ موت ہی کا راستہ تھا، لیکن اس پر وہ تیار نہیں تھے کہ ان کی ایک ہم عقیدہ خاتون کی بے حرمتی زیاد اس طرح کرے کہ اسے قتل کر کے اور پھر ننگا کر کے سڑک پر ڈال دے۔ یہ بڑے عار کی بات تھی۔

ابو بلال بلجار کے گھر گئے، اور اسے نصیحت کی کہ اب اسے پوشیدگی کے ساتھ کہیں دور چلے جانا چاہیے تاکہ زیاد کے لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے لیکن بلجار پر یہ بات کوئی دہشت طاری نہیں ہوئی۔ اس نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ کہا: "اگر وہ ایسا کرے گا تو بدبخت ہوگا۔ اگر میں اس کے ہاتھ آجاؤں تو اسے حق حاصل ہے کہ جو سلوک چاہے کرے۔"

اور آخر کار بلجار زیاد کے ہاتھ آگئی۔ اس نے وہی کیا، جو کہا تھا۔ قتل کرایا، ہاتھ پاؤں کٹوائے، پھر کپڑے اتار کر لاش سڑک پر پھینکوا دی۔

کہا جاتا ہے کہ اس خاتون نے آخر وقت تک کسی طرح کی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ثابت قدم رہی اور اپنے ایمان کے ساتھ جان دے دی۔

ماخذ:

۱۔ سورۃ البقرہ، رکوع ۱۰، آیت ۲۰۵۔
۲۔ سورۃ البقرہ، رکوع ۲۴، آیت ۲۲۸۔
۳۔ سورۃ البقرہ، رکوع ۲۰، آیت ۲۳۲۔
۴۔ صحیح بخاری، کتاب طلاق، عن ابن عباس
۵۔ زاد المعاد مطبوعہ مصر (علامہ ابن قیم رح) ج ۱، ص ۳۰۔
۶۔ ابن ہشام، ص ۱۷۔
۷۔ صحیح بخاری، ابوداؤد، ج ۱، ص ۱۵۲۔
۸۔ زاد المعاد مطبوعہ مصر (علامہ ابن قیم رح) ج ۱، ص ۳۰۔
۹۔ سیر الصحابہ ج ۵، ص ۵۶۳۔
۱۰۔ صحیح مسلم، پارہ ۲، ص ۱۰۳
۱۱۔ اسد الغابہ ج ۵، ص ۶۰۔
۱۲۔ مسند ابن حنبل رح، ص ۱۰۲
۱۳۔ الاصابہ فی احوال الصحابہ ج ۵، ص ۱۰۱۔
۱۴۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق
۱۵۔ سنن ابوداؤد، ج ۱، ص ۲۷۴۔
۱۶۔ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۰۹
۱۷۔ زاد المعاد (علامہ ابن قیم رح) طبع مصر، ج ۲، ص ۲۲۲
۱۸۔ المنتقی (شرح الموطا امام مالک) ج ۴، ص ۲۷۱۔

۱۸ اعلام الموقعین (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۱۔
۱۹ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۱
۲۰ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۱، ۱۰۱۔
۲۱ صحیح بخاری کتاب الطلاق، عن ابن عباس۔
۲۲ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۲۷۵، ۲۸۷، ۳۰۶۔
۲۳ اعلام الموقعین (علامہ ابن قیمؒ) ص ۱۳۔
۲۴ اسد الغابہ، ج ۵، ص ۴۳۲۔
۲۵ طبقات ابن سعد، ج ۸ ص [illegible]
۲۶ ایضاً، ص ۳۰۴
۲۷ صحیح بخاری، پارہ [illegible]، ص ۴۲۹۔
۲۸ ابن کثیر، ج ۵، ص ۸،
۲۹ صحیح مسلم، ذکر غزوۂ احد۔
۳۰ اصابہ فی احوال الصحابہ، ج ۸، ص ۱۳۔
۳۱ فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج ۸، ص ۵۰۴،
۳۲ اسد الغابہ، ج ۵، ص ۲۸۷،
۳۳ زاد المعاد، مطبوعہ مصر، ج [illegible]
۳۴ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی (مرزا محمد نظر احسن گیلانی)، ص [illegible]
۳۵ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۱۰۔
۳۶ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، مطبوعہ مصر، ج [illegible]، ص [illegible]۔
۳۷ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر)، مطبوعہ بیروت، ص ۱۰۳، ۱۰۵۔

(۹)

تنقید اور آزادیٔ گفتار

احتساب، اختلاف، حزبِ اختلاف

انسان معصوم نہیں ہے۔ اس سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، لیکن اگر وہ حاکم ہے، یا فرماں روا ہے، یا سربراہِ مملکت ہے تو اس سے سنگین تر غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ یہ غلطیاں ملک و ملت کے لیے پیامِ ہلاکت بھی بن سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حاکم اور فرماں روا اپنے مشیر رکھتا ہے جو اسے مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ مگر عام طور پر ان کے مشوروں میں زور نہیں ہوتا، اس لیے کہ ماتحت ہوتے ہیں اور ان کے مشورے کچھ بہت زیادہ مکمل بھی نہیں ہوتے، وضع احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ خوشنودیٔ مزاج کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے مستقبل اور عافیت کی بھی فکر ہوتی ہے، یہ کبھی بھی صورتِ حال کا صحیح نقشہ پیش کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے، اس لیے کہ حاکم یا فرماں روا اگر با جبروت ہو، اور ہمہ گیر اقتدار و اختیار کا حامل ہو تو اس کے سامنے لب کشائی ہے بھی مشکل۔ مزید یہ کہ ایسے لوگ خود بھی شریکِ اقتدار ہوتے ہیں اور اقتدار کا تحفظ کون نہیں چاہتا؟

لیکن ملک و ملت کی فلاح اور سود و بہبود کا تقاضا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہوں، جو اتنی اخلاقی جرأت رکھتے ہوں کہ اندیشۂ سود و زیاں، بلکہ جان و تن سے بے نیاز ہو کر حاکم یا فرماں روا کی غلطیوں پر اسے ٹوک سکیں، اس

پر بے محابا تنقید کر سکیں۔ اس کے افکار و خیالات اور اقدام و عمل سے اختلاف کر سکیں۔ ایک جماعت بنا کر اس کی غلط پالیسی اور غلط روش کی اصلاح کے لیے مفید اور تعمیری تجاویز پیش کر سکیں۔ حکومت کے استحکام اور پائیداری میں اختلاف اور تنقید کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ جدید کی "جمہوریت" کا ایک لازمی عنصر پریس کی آزادی، حریتِ گفتار، آزادیٔ اختلاف اور حزبِ اختلاف کا قیام ہے۔ "تعمیر" کا دوسرا رُخ تو ہمیں نظر آ سکتا ہے چنانچہ موجودہ دور میں جو جمہوریتیں مختلف ممالک میں قائم ہیں وہ فخر و تعلّی کے ساتھ اعلان کرتی رہتی ہیں کہ ہمارے ہاں پریس آزاد ہے، نکتہ چینی کے حق پر کوئی پابندی نہیں۔ حزبِ اختلاف کا ہم احترام کرتے ہیں۔ اس کی تجویزوں اور مشوروں کی قدر کرتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ غلط بھی نہیں، واقعی ایسا ہوتا ہے، اور جہاں کہیں بھی یہ جنس گراں بہا موجود ہے، اس پر فخر کرنے کا حق یقیناً اس حکومت کو حاصل ہے ——— یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے۔

لیکن مڑ کر جب ہم ماضی کی طرف نظر ڈالتے ہیں، تو وہ دور مختلف نظر آتا ہے۔ جہاں حکومت کو غیر مشروط اور غیر مسئول طور پر ہر قسم کے انتظامی اور تعزیری اختیارات حاصل تھے۔ اور کسی کو مجال دم زدن نہیں تھی، بدقسمتی سے عام طور پر ہمارے اسلام اور عہدِ اسلام اور مسلمان سلطنتوں کے بارے میں یہی تصور قائم کر دیا گیا ہے۔ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام حریتِ گفتار و افکار کو اہمیت نہیں دیتا، حکومت کے اقدام و عمل پر نکتہ چینی کو مستحسن قرار دیتا ہے، اور امیر یا خلیفہ یا امام، یا حاکم کے خلاف تو وہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔

لیکن امرِ واقعہ یہ نہیں ہے۔

حریتِ افکار و گفتار: اسلام نے جتنی زیادہ حریتِ افکار و گفتار دی ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان فرماں روائوں کو عام اس سے کہ وہ اپنے وقت کے کیسے ہی متقی،

سفاک، درندہ خو، فرعون رفتار بنے ہوں، نتائج سے بے پرواہ ہو کر معمولی آدمیوں نے ٹوکا ہے، سرزنش کی ہے، ہدفِ تنقید بنایا ہے، اور اختلاف کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی، بلکہ اپنے صالحین تک کو ٹوکنے اور ہدفِ تنقید بنانے میں مسلمانوں نے تامل نہیں کیا، حد یہ ہے کہ اپنے نبیؐ (فداہ ابی و امی و نفسی) اور اپنے خلفائے راشدینؓ تک کو ٹوکا، اختلاف کیا، اور احتساب کیا ہے اور یہ نتیجہ تھا قرآن کی تعلیمات اور اسوۂ نبیؐ کا۔

منکر کی مزاحمت: قرآن نے نہایت صفائی کے ساتھ ترغیب دی ہے کہ منکر کی مزاحمت کی جائے، غلطی پر ٹوکا جائے، جہاں خدا کا گناہ ہوتا ہو، وہاں مخلوق کی (خواہ وہ کتنی ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہو) پرواہ نہ کی جائے۔

خدا کا گناہ صرف یہی نہیں ہے کہ اگر حاکم نماز سے روکے تو اس کی اطاعت سے انحراف کیا جائے، یا حج کے دروازے پر تالا لگا دے تو اس کی مزاحمت کی جائے۔ خدا کی معصیت یہ بھی ہے کہ اگر عدل نظر انداز کیا جا رہا ہو تو آواز حق بلند کی جائے، اس لئے کہ خدا نے عدل کا حکم دیا ہے۔ اگر شوریٰ کو نظر انداز کیا جا رہا ہو تو اسے قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ اس لیے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے۔ اگر عفت کی گرم بازاری ہو تو خاموش نہ رہا جائے، اس لیے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے۔ حق اگر نظر انداز کیا جا رہا ہو تو اس پر سکوت اختیار کرنا خاموشی سے اسے گوارا کر لینا معصیت ہے، کیونکہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں۔

البتہ اس سلسلے میں دو امور خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

۱۔ تنقید و اختلاف فتنہ و فساد کا منجر نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قتل سے بھی زیادہ سنگین تر بتایا ہے۔ "الفتنۃ اشد من القتل"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختلاف و احتساب تعمیری ہونا چاہیے، نہ کہ منفی اور تخریبی یا فساد انگیز۔

۲۔ اختلاف و احتساب کے معنی بغاوت کے نہیں ہیں!

حاکم یا حکومت کی رائے اور پالیسی سے اختلاف کرنا، دوسری چیز ہے۔ اور اس کے خلاف مورچہ سنبھال لینا بالکل جدا چیز ہے اور ان دونوں میں کسی طرح کی مطابقت نہیں ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے، جب حاکم یا حکومت کے خلاف بغاوت و خروج وقت کا فریضہ بن جاتا ہے۔ اس میں شریعت نے یہ اصول مرعی رکھا ہے کہ:

اصلاح احوال کی ساری تدبیریں ناکام ہو چکی ہوں۔

اتمام حجت ہو چکا ہو۔

سوال مسلمانوں میں کفر و اسلام کا پیدا ہو گیا ہو۔

اس صورت میں بھی خروج و بغاوت کے کچھ قیود و شروط ہیں جن کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

کلام اللہ سے استشہاد: ہم سب سے پہلے کلام اللہ کو لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم	یعنی مومن مردوں اور عورتوں کی کیفیت یہ ہے
اولیاء بعض یأمرون بالمعروف و	کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا رفیق ہے
ینهون عن المنکر ویقیمون الصلوٰة	یہ لوگ "معروف" (بھلائی) کا حکم کرتے اور
ویؤتون الزکوٰة ویطیعون الله	"منکر" (برائی) سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے
ورسوله اولئک سیرحمهم الله	ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے
ان الله عزیز حکیم"	رسول کے اطاعت گذار ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو
	بہت جلد اللہ کی رحمت میں آئیں گے
	بلاشبہ خدا غالب و حکمت والا ہے[1]۔

لیکن یہ امر بالمعروف کیا ہے؟ نہی عن المنکر سے کیا مقصود ہے؟

ظاہر ہے اس سے مقصد نعوذ باللہ فتنہ انگیزی تو نہیں ہو سکتا کہ جو راہ چلتا نظر آیا اسے "معروف" کا حکم دینا شروع کر دیا۔ اور جو بھی غلط راستہ پر چلتا نظر آیا اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے

بایں ہمہ اگر کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنے حدود و شرائط کے ساتھ اچھی چیز ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز ہے جو ویسے بھی لوگ کرتے ہی رہتے ہیں۔ بھلائی کی ترغیب دیتے ہیں۔ برائی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں اس زور اور شدت کے ساتھ اس کا جو بیان ہوا ہے اس میں اصل مقصد یہ ہے جس سے عام طور پر لوگ گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں۔ اور وہ مقصد ہے حکومت اور ارباب حکومت کو اچھے اور صحیح کاموں کو بروئے کار لانے پر آمادہ کرنا اور اس کی سعی و کوشش کو غلط اور ضرر رساں کاموں سے روکنا اور ان پر ٹوکنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنا کہ سماج کی فلاح، قوم کی بہبود، ملک کی ترقی ملت کے فروغ کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ "حکومت" اچھی ہو۔ حکومت اگر اچھی ہو گی تو بہت سے مفاسد کا از خود قلع قمع ہو جائے گا۔ یہ صورت دگرگوں ان سے اچھی شکل نہیں لینے پر قادر نہ ہو گی اور حکومت کے اچھے ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ اس کے سامنے ہوں، صرف ایک رخ دیکھ کر وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ دوسرا رخ صرف وہی لوگ سامنے رکھ سکتے ہیں جو حکومت میں نہ ہوں، جو اقتدار و اختیار کے حامل نہ ہوں، جو سچائی اور دیانت داری کے ساتھ حکومت کو ٹوکتے اور روکتے رہیں، اور اپنی تعمیری تنقید سے اس کی رہنمائی کرتے رہیں۔

چند اہم نکتے متعلق بہ آیت کریمہ: اس آیۃ کریمہ میں تلاوت کے وقت کئی نکتے میرے ذہن میں آئے جنھیں بغرض فکر و غور پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں

۱: اس آیت میں اللہ و رسولؐ کے ساتھ "اولی الامر" کی اطاعت کا ذکر نہیں ہے کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسی چیز نہیں ہے جسے حکمران

قوت سنجوشی قبول کرلے وہ اس پر ناخوش ہوسکتی ہے اور اپنی ناخوشی کا طرح طرح سے مظاہرہ کرسکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیئے اس لیے کہ اس کا انجام دینا، اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرنا ہے۔

۲: اس آیۂ کریمہ میں فرمایا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بہت جلد اللہ تعالیٰ کے سایۂ رحمت میں آجائیں گے۔ یعنی ممکن ہے دنیا انہیں کچھ نہ دے لیکن آخرت میں ان کے لیے رحمتِ الٰہی کشادہ آغوش نظر آئے گی کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا فریضہ ادا کیا۔ نہ لومۃ لائم کی پرواہ کی، نہ اقتدار و اختیار کی، نہ تعزیر و عقوبت سے خوف زدہ ہوئے۔

۳: تیسرا بہت ہی لطیف نکتہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے "اللہ غالب ہے" اس موقع پر اللہ نے اپنے لیے "عزیز" (غالب) کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے وہ حد درجہ معنی خیز ہے۔ یعنی اس فریضے کو انجام دینے میں ہزار دشواریاں ہوں، دشواریاں ہوں، قوت، دولت، شوکت اور دوسرے وسائل و ذرائع قدرت ہمالیہ کی طرح بلند اور بوجھل کیوں نہ ہو لیکن جو لوگ یہ فریضہ بجا لاتے ہیں انہیں ہراساں اور سہمگیں ہونے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ سب سے زیادہ قوت و شوکت والا اور سب پر غالب تو خود اللہ عزوجل ہے۔ اگر اس کی خوشنودی مطلوب ہے اور اس کی اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت مقصود ہے تو یک فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے تمہیں یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ لوگوں کی چین پر شکن نہ دیکھو، آسمان کی طرف دیکھو اور قاہر السموات والارض کی قوت اور غلبے کا اندازہ لگاؤ۔ پھر تم بے فکری کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکو گے۔ لیکن یہ کام نیت، اغراض اور جلب منفعت اور بالواسطہ حسنِ طلب یعنی تمنائے جاہ و اقتدار سے پاک ہونا چاہیئے۔

۴: پھر فرمایا "اللہ حکیم" یعنی حکمت والا بھی ہے، اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اگر تم سچائی اور دیانت کے ساتھ کام کر رہے ہو اور فلاحی ریاست

قائم کرنا چاہتے ہو، اور اپنے آرام، اپنے نفس، اپنی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کر کے اس مقصدِ عظیم کے حصول میں لگے ہوئے ہو تو، یاد رکھو، اللہ حکمت والا ہے، وہ ایسے حالات پیدا کر سکتا ہے کہ مایوسی کی تاریکی امید کی روشنی سے جگمگا اٹھے اور تمہارا مقصدِ عظیم پورا ہو جائے۔

میں نے زیادہ تفصیل سے اس آیۂ مبارکہ پر گفتگو کی ہے، جب بھی میں نے اس کی تلاوت کی ہے مجھ پر یہی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ اس مفہوم و معنی کی دوسری آیات بھی ہیں، جن میں سے چند کا حوالہ میں نے ماخذ میں دے دیا ہے۔

احادیث نبویؐ سے استشہاد: قرآن کریم کے بعد اب ہمیں یک نظر احادیث نبویؐ پر بھی ڈال لینی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشاد کیا ہے؟

"عن ابی سعید الخدری افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر"

یعنی ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب سے افضل جہاد جور پیشہ حکمران کے سامنے کلمۂ عدل کہنا ہے۔"[۴۲]

نیز فرمایا:

"ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وضع رجلہ فی الغرز ای الجہاد افضل؟ قال کلمۃ الحق عند سلطان جائر"

یعنی ایک شخص نے کہ اس کا پاؤں رکاب میں تھا پوچھا: "سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "حکمران جور پیشہ کے سامنے سچی بات کہنا ہے۔"[۴۳]

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان الدین نصیحۃ ان الدین نصیحۃ ان الدین نصیحۃ"

یعنی دین نصیحت ہے، دین نصیحت ہے، دین نصیحت ہے۔"

"قیل لمن یا رسول اللہ؟ قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم!"

عرض کیا گیا: "کس کے لیے یا رسول اللہ؟" فرمایا: "اللہ کے لیے، اس کی کتاب (قرآن) کے لیے، اس کے رسول ؐ کے لیے، مسلمان حکمرانوں کے لیے، اور عامۃ المسلمین کے لیے۔"

اختلاف اشیاء سے نصیحت بھی مختلف صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پس نصیحت برائے یزداں کا مطلب یہ ہے، اس کی ظاہری و باطنی طاعت، اس کے غضب سے بچنا، نیکوکاروں سے محبت، بدکاروں سے نفرت!

نصیحت برائے کتاب (قرآن) کا مطلب یہ ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے، اچھی طرح تلاوت کی جائے؛

نصیحت برائے رسول ؐ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ؐ کی حاضر و غائب دل و جان سے طاعت کی جائے، اور جادۂ سنت سے انحراف نہ کیا جائے۔

اور نصیحت برائے ائمہ (فرماں روا) سے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے فرائض بجا طور پر انجام نہ دیں تو انھیں تنبیہ کی جائے، غلط راستے پر چلیں تو ٹوکا جائے، جس بات کو نہ جانتے ہوں، وہ بتائی جائے، اگر برائی کا ارادہ کریں تو روکا جائے، ان کے مقرر کردہ عمال و حکام کی سیرت و کردار سے انھیں آشنا کیا جائے، عوام کے حالات و شکایات ان تک پہنچائے جائیں۔

نصیحت برائے عامۂ مسلمین کا مطلب یہ ہے کہ بڑوں سے توقیر اور چھوٹوں سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے، ان کی مصیبت دور کی جائے، ان کے ضروریات و حوائج پورے کیے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک

یعنی تم میں سے اگر کوئی شخص کوئی امر منکر کسی سے سرزد ہوتے دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزورِ قوت دور کر دے۔ اگر اس کا سر دھڑ

وذلک اضعف الایمان" — نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی بس سے باہر ہو تو پھر دل سے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

اس حدیث میں بزور قوت منکر کو دور کرنے کا ارشاد جس کی طرف ہے — وہ حکمران وقت ہے۔ زبان سے کام لینے کا جنھیں حکم دیتے ہیں وہ حکومت کے بے لوث اور مخلص نکتہ چین ہیں۔ اور اگر یہ بھی بس سے باہر ہو تو اسے ایمان کا ضعیف ترین درجہ قرار دیا ہے۔

عزیمت و رخصت: اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کے ظرف سے زیادہ اس کا امتحان نہیں لیتا، اسی لیے ہمارے ہاں عزیمت و رخصت کی اصطلاحیں وجود میں آئی ہیں۔ عزیمت یہ ہے کہ — بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — اور رخصت یہ ہے کہ اگر کسی میں یہ حوصلہ نہیں تو برے کو برا سمجھتا رہے، یعنی اس کا معاون اور آلۂ کار نہ بنے، آدمی تنقید و اختلاف کا فریضہ انجام نہ دے تو بھی برے کو برا سمجھنا آخر کار نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، کبھی نہ کبھی اسی نہ کسی وقت — خون ابراہیم آ جاتا ہے آخر جوش میں!

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد ہوا:—

"لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" — جس بات میں خدا کی نافرمانی ہو، اس میں کسی بندے کی اطاعت نہ کرو۔

ظاہر ہے جب امر معصیت میں مخلوق کی طاعت جائز نہیں تو اس سے اختلاف کا اظہار اشد ضروری ہے۔ اور معصیت کی وسعت حدود پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اسوۂ خلفائے راشدین: اب خلفائے راشدین پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا:

"میں تو معمولی انسان ہوں، پس اگر میں راہ راست پر چلتا رہوں تو میری مدد کرو، اور راہ پاؤ تو سیدھا کر دو۔"

یہ دنیا میں بالکل پہلی مثال ہے کہ ایک فرماں روا اپنی رعایا کو ترغیب دے رہا ہے کہ اس کا احتساب کرتی رہے، اس پر کڑی نظر رکھے، اسے راہِ راست پر گامزن پائے تو اطاعت کرے، کج رو پائے تو سیدھا کر دے۔

"سیدھا کر دو" کی بابت قابلِ غور ہے۔ اس میں احتساب سے لے کر عزل تک کیا نہیں آجاتا؟

حضرت عمرؓ کا قول ہے: "خدا اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیوب سے مجھے مطلع کرتا ہے"۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتا ہوا (جب وہ تقریر کر رہے تھے) ایک شخص اٹھا اور گویا ہوا

"اے عمرؓ! خدا سے ڈر!"

بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار گذری، انھوں نے اس شخص کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔

آپؓ نے فرمایا: "اسے بولنے دو، اگر یہ لوگ ہمیں نہ ٹوکیں تو پھر ان کا فائدہ؟ اور ہم ان کی نہ سنیں تو ہماری ضرورت؟"

اسی طرح ارضِ سواد کی تقسیم و عدم تقسیم کے موقع پر حضرت عمرؓ کو سخت شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض لوگوں نے تو درشت اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے، لیکن آپؓ نے صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آخر کار تو یہ کہہ:

"تمہاری طرح میں بھی ایک فرد امت ہوں، تم سے جو کچھ چاہتا ہوں اس میں یہ ہے کہ میرے بارِ امانت میں میرا ساتھ دو"۔

احتساب و اختلاف کے احترام کی یہ مثال کتنی شاندار ہے؟

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں فتنوں کا یہ عالم تھا کہ زمین سے ابلتے تھے اور آسمان سے برستے تھے۔ مروان وغیرہ نے امیر المومنین کو

صحیح حالات سے بے خبر رکھ کر خود فائدہ اٹھایا، اور اسلام اور امت اسلامیہ کو شدید نقصان پہنچایا۔

حضرت عثمانؓ کے بارے میں شکایات سے کر ایک جمع حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ آپ حضرت عثمانؓ سے گفتگو کر کے انھیں سمجھائیں، چنانچہ آپ حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور وہاں جا کر فرمایا:

"لوگ میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں، انھوں نے مجھے اپنے اور آپ کے مابین سفیر بنایا ہے۔ لیکن خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا کہوں؟ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ ناواقف ہوں، نہ میں کسی ایسے امر کی طرف آپ کی رہنمائی کر سکتا ہوں جسے آپ نہ جانتے ہوں، جو آپ جانتے ہیں وہی ہم جانتے ہیں، کسی بات میں ہم آپ پر سبقت نہیں رکھتے کہ اس سے آپ کو باخبر کریں، نہ کسی بات میں ہم آپ سے جدا ہوئے کہ اب آپ کو وہ بتا دیں جس طرح ہم نے دیکھا اسی طرح آپ نے دیکھا، جس طرح ہم نے سنا اسی طرح آپ نے سنا، جس طرح ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے مشرف ہوئے، اسی طرح آپ بھی ہوئے، ابوبکرؓ و عمرؓ بھی عمل ان پر عمل کرنے میں آپ سے زیادہ سزاوار نہیں تھے۔ کیونکہ یہ عہدہ و فضیلت آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کے مقابلہ میں قریب تر ہے۔ بلاشبہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کا شرف مرتبہ حاصل کیا ہے جو انھیں نہیں ملا ہے۔ پس اپنے بارے میں خدا سے ڈریئے، کیونکہ خدا کی قسم آپ ایسے نہیں ہیں کہ گمراہی سے آپ کو بچنے کی جائے اور جہالت سے آپ کو دانا بنایا جائے۔ بلاشبہ خدا کا راستہ آشکار، اور نشان دین قرآن، حضرت رسول جلوہ افروز ہے۔ پس اگر آپ غفلت کے شکار ہیں تو جان لیجیے، خدا کے نزدیک بدترین بندہ وہ پیشوائے ضال ہے جو خود ہدایت یاب ہو اور مردوں کی صحیح راہنمائی کرے اور سنت رسول پر عمل پیرا ہو، اور بدعت نادرست و باطل کو کچل ڈالے اور بلاشبہ

سنت رسول اکرم روشن اور ہویدا ہے اور اس کا نشان قائم ہے، اسی طرح بدعتیں نمایاں ہیں اور ان کی علامتیں بھی موجود ہیں اور خدا کے نزدیک بدترین مردم وہ پیشوائے ستمگار ہے کہ گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ سنت رسول کو مردہ کرے، اور بدعت نادرست و باطل کو زندہ کرے۔

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے:

"قیامت کے دن پیشوائے ستمگار اس حالت میں لایا جائے گا کہ کوئی اس کی یاری کرنے والا نہ ہوگا۔ نہ اس کی عذر خواہی قبول کی جائے گی۔ پس وہ آتش دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور چکی میں اس طرح چکر کھائے گا جس طرح آسیا گردش کرتا ہے پھر اس کی تہہ میں تہلکہ کر دیا جائے گا!"

اور میں آپؓ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپؓ اس امت کے امام مقتول نہ بنیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"اس امت میں جو امام قتل کیا جائے گا۔ اس کے اثر قتل سے خون ریزی اور خانہ جنگی کی راہ قیامت تک کھل جائے گی۔ امور مشتبہ ہو جائیں گے اور فتنے کا دخل پھیل جائے گی۔ حق اور باطل کا امتیاز اٹھ جائے گا۔ اس تباہ کاری کے دور میں یہ فتنوں کو ایک دوسرے پر ڈالیں گے اور اس میں گتھ کر رہ جائیں گے۔ پس آپؓ اس کہن سالی اور سال خوردگی کے عالم میں مروان کے لیے یہ کھلونا نہ بن جائیے کہ جدھر چاہے اٹھائے پھرے۔"

حضرت عثمانؓ نے یہ باتیں سن کر جواب ارشاد فرمایا:

"آپؓ لوگوں سے گفتگو کیجیے کہ مجھے مہلت دیں تاکہ ان پر جو ستم رانیاں اور زیادتیاں ہو چکی ہیں، ان کا تدارک کر دوں!"

اشتر نے حضرت عثمانؓ کو جو مکتوب لکھا تھا اور جس میں ان پر سخت تنقید اور نکتہ چینی کی گئی، وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں، انھوں نے لکھا تھا:

"آپؓ کے والیوں کو جور و ستم کی روش ترک کر دینی چاہیے۔ آپؓ کو چاہیے کہ

اکابر اور نیکوکاروں کو جلاوطن نہ کریں۔ ہمیں آپ کی اطاعت سے انکار نہیں، لیکن ہمارے اکابر کو بدنام ستم بنانے، ہمیں اور ہمارے نیک سرشت لوگوں کو جلاوطن کرنے اور ہمارے تجربہ کار نوجوانوں کو مسلط کرنے کی روش ترک کر دیجئے۔ ہمارے شہر کا حاکم عبداللہ بن قیس، ابوموسیٰ اشعریؓ اور حذیفہؓ کو بنا دیجئے، اور ہمیں اپنے اور اپنے گھر کے اور مرضی کے حاکموں سے بخشئے!

لیکن اس قدر نرم، تلخ بدگمانی خانہ تحریر کا جواب خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے کیا دیا:

"اے خدا میری توبہ قبول کر، پھر ابوموسیٰ اشعریؓ اور ابوحذیفہؓ کو تحریر فرمایا، اگر تم نصیحت کرتے ہیں، ہمارے بھی تم معتمد ہو، لہٰذا وہاں کے اور اپنے ہاتھ میں لوگوں کے ساتھ حکومت کرو، اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے!"

مروان گریبان نہ ہوتا تو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری چھ سال بھی پہلے کے چھ برس کی طرح ہر اعتبار سے نمونہ ہوتے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جنہوں نے حضرت عثمانؓ سے خلافت کی بیعت لی تھی، انہی مروان کی ریشہ دوانیوں اور حضرت عثمانؓ کی بے بسی کی وجہ سے بہت درجہ ملول و دل گرفتہ تھے، چونکہ حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی پیش پیش تھے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ عہد ہر اعتبار سے مثالی ہو، لیکن جب مروان وغیرہ کی وجہ سے حالات بدلے تو فرمانے لگے:

"حضرت اب زیادہ شدید کر دیا اور آخر کار ایک دن وہ ان کے مخالفوں کی صف میں نظر آنے لگے اور ان مخالفت نے یہ رنگ پکڑا کہ حضرت عثمانؓ سے یکسر قطع تعلق کر لیا، ملاقات نہ باقی چھوڑی۔"[۱۲]

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی حضرت عثمانؓ پر نکتہ چینی برسرِ عام کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے مابین جو تلخی پیدا ہوئی اس میں بھی بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین یہی مروان وغیرہ کارفرما تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عباسؓ نے اُسامہ سے دونوں کو نصیحت کی اور گذشتہ تلخیوں کی گرد جھاڑ دینی چاہی۔ تمام اختلافات اور ہر اختلاف کے باوجود حضرت علیؓ نے جو بات کہی وہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ اظہار اختلاف کے معنی غداری اور بغاوت کے نہیں ہیں۔ آنکہ معاملہ کفر و اسلام کا نہ ہو تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"عثمانؓ اگر مجھے حکم دیں تو میں بے تامل جلاوطنی اختیار کر لوں گا۔"

ابوذر غفاریؓ کا مسلک: حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے اللہ رسول تھے۔ ان کی بے نفسی، دنیا اور عیش و نعمت سے بیزاری ایک معروف و معلوم حقیقت ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اسلامی سوشلزم کا تصور سب سے پہلے انہی نے پیش کیا۔ سقیفہ میں اپنے موقع پر ــــ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ابو معاویہؓ اور دوسرے لوگوں نے جو طرز زندگی اختیار کیا تھا وہ اس سے جدا تھا۔ حضرت عثمانؓ بنی امیہ اور نرم خوئی کی وجہ سے ایسی روش اختیار نہیں کر سکے جو اس صورت حال کا مداوا کر سکتی۔ حضرت ابوذرؓ انتہائی درشت اور سخت لہجہ میں عثمانؓ اور عمال عثمانؓ پر نکتہ چینی کرتے تھے لیکن ان کی نکتہ چینی بغاوت کی مترادف نہ تھی حدود طاعت کے اندر رہتے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بالکل ہی فرمایا ہے:

"حضرت ابوذر غفاریؓ کو جب مدینہ چھوڑ کر شام روانہ ہو جانے کا حکم ملا تو وہ فوراً چلے گئے اور جب ربذہ کی جلاوطنی کا فرمان صادر ہوا تو بھی انہوں نے مزاحمت نہیں کی، فرمایا تو یہ کہ مجھے تو میرے رسول کی طرف سے اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ خود میرا حاکم نگراں بھی ہو اگر عثمانؓ مجھے پھانسی دے دیں تو بھی میں بغاوت نہیں کروں گا۔"

اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ اپنا حق خیال کرتے تھے کہ حدود طاعت کے اندر رہتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کریں۔

حضرت ابوذرؓ کا یہ نقطۂ نظر بالکل بجا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:

"کوئی شخص خود کتنا ہی مستحق کیوں نہ ہو، اس کا سزاوار نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کر کے اس کی اطاعت کی جائے"[۱۷]!

ذاتی معاملات تک میں احتساب اور بازپرس کا حق خلافت راشدہ میں عام طور پر عمل تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ دراز قد ہونے کے باعث انھوں نے ایک کے بجائے دو چادریں استعمال کر لیں۔ حالانکہ مالِ غنیمت میں فی کس ایک چادر ملی تھی۔ بازپرس کسی عامی نے نہیں، ایک نہایت عالی رتبت شخصیت حضرت سلمانؓ فارسی نے کی۔ اس بازپرس سے وہ ذرا بھی نہیں تلملائے انھوں نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ کی طرف اشارہ کیا کہ جواب دیں انھوں نے فرمایا:

"اپنے حصے کی چادر میں نے اپنے والد کو دے دی ہے"[۱۸]!

انہی حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ان سے ایک بزرگ بشر بن سعدؓ نے برسرِ عام کہہ دیا تھا "اگر تم سیدھے رستے نہ چلے تو ہم تمھیں تلوار کی طرح سیدھا کر دیں گے"

یہ سن کر حضرت عمرؓ خوش ہوئے اور انھوں نے فرمایا:

"پھر تو تم جیسے کام کے آدمی ہو"[۱۹]!

بیعت سے اختلاف بغاوت سے گریز: بیعت، خلافت کے قیام و بقا کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سے کنارہ کش ہوتا ہے، مگر بغاوت نہیں کرتا، تو اس سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت، سعدؓ بن عبادہ نے نہیں کی — جو ان کے مقابلے میں میدانِ خلافت تھے — مگر بیعت سے انکار کیا بلکہ روش یہ رکھی کہ سعدؓ بن عبادہ نہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے، نہ ان کے ساتھ شامل ہو کر ارکانِ حج بجا لاتے تھے، مگر اس کے باوجود ان سے تعرض نہیں کیا گیا[۲۰]!

اسی طرح حضرت علیؓ کی بیعت سے عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ نے انکار کر دیا۔ مگر آپؓ نے ان سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا، بلکہ اس بات کے ضامن بننے پر تیار ہو گئے کہ یہ کسی طرح کی گڑبڑ نہیں کریں گے۔

غرض اختلاف و احتساب، تنقید اور نکتہ چینی اور بیعت سے گریز کا جہاں تک تعلق ہے، اس کی مثالیں، عہدِ خلافت راشدہ میں ملتی ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کتنی عالی ظرفی کے ساتھ یہ باتیں برداشت کر لی گئیں۔ بلاشبہ ان شاندار مثالوں نے اسلام کا نام روشن اور تاباں کر دیا۔

حزبِ اختلاف اسلامی نقطۂ نظر سے: ایک دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیا اسلامی جمہوریہ میں حزبِ اختلاف کا قیام جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ انفرادی طور پر تو حکمران پر تنقید کی جا سکتی ہے، اور اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اجتماعی طور پر ایسا نہیں کیا جا سکتا

مگر اس خیال کی اساس و بنیاد کیا ہے، اس پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی جو بات انفرادی طور پر روا اور درست ہے وہ جماعتی طور پر کیوں نادرست ہو گی انفرادی طور پر اس کام کے سرانجام دینے میں کچھ قباحتیں بھی ہیں جنہیں وقتِ جذبات میں آدمی نظر انداز کر سکتا ہے، لیکن جماعتی طور پر یہ کام کرنے میں قباحتوں کے بجائے مصالح زیادہ نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے، جماعت فرد کے مقابلے میں زیادہ متوازن، زیادہ صلح سنج اور زیادہ محتاط ہوتی ہے۔

بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے صورتِ مسئلہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

"ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون ۝"

"یعنی تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو دعوتِ خیر ہو، "معروف" کا حکم دے اور "منکر" سے منع کرے ایسے ہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔"[۲۲]

یہی نہیں سمجھتا کہ اس جماعت کو اگر یہ ایوانِ حکومت میں ہو تو "حزبِ اختلاف" کے سوا اور کس نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

اختلاف کے حدود و شرائط یہی رونما ڈال چکے ہوں یعنی اختلاف دائرۂ طاعت سے باہر نہیں ہونا چاہیئے ہو مگر اس دائرے میں رہ کر کچھ لوگ "حزبِ اختلاف" بن کر حکومت کے سامنے تعمیری تجویزیں پیش کر کے امر بالمعروف اور اس کی غلط روی پر اسے ٹوک کر "ناہی عن المنکر" بنتے ہیں تو کس کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ —— اور اگر ہو سکتا ہے تو کس بنیاد پر؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جو حق کی علمبردار ہوگی اور اس سے اختلاف کرنے والے اسے کوئی زیان نہ پہنچا سکیں گے"!

مذکورہ آیت اور حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحابِ اقتدار کو اگر وہ غلطی کے مرتکب ہوں ٹوکنا اور ان کے سامنے تعمیری تجویزیں پیش کرنا ایک مستحسن فعل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ معروف کا اعلان تلوار سے کر نہ کیا جائے اور منکر کے خلاف مزاحمت ایسی نہ ہو جو فساد کی حد تک پہنچ جائے [illegible] ہو تو وہ [illegible] ہے کہ اس کی طرف [illegible] کے متعلق [illegible] بلکہ اس صورت کے [illegible] رسول کی طرف اور اسلام کا پیغام [illegible] دوسری صورت [illegible] پر ایک جداگانہ باب میں گفتگو کی جائے گی۔

اسلامی مملکت میں ایسی حزبِ اختلاف کی گنجائش ہے جو ذاتی اغراض سے پاک ہو۔

کیا یہ سوال اب جائز ہے کہ آیا اسلام کے عہدِ زریں میں بالخصوص خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حزبِ اختلاف کی کوئی مثال ملتی ہے؟ جو سب [illegible] کے پیرو اس کا پیش کیے بغیر رہتے ہیں۔

"مدینہ منورہ میں یہ حضرات ہی حزب اختلاف کے نمایاں اور ممتاز افراد تھے اور یہ تمام حضرات جلیل القدر صحابی رضؓ اور مہاجر ہیں!"

اور پھر "حزب اختلاف" کے اکابر کے نام گنوائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف، ۲- سعدؓ بن ابی وقاص، ۳- زبیرؓ بن العوام، ۴- طلحہ رضؓ بن عبیداللہ، ۵- علیؓ ابن ابی طالب، ۶- عباسؓ ابن عبدالمطلب، ۷- عبداللہؓ بن مسعود، ۸- ابوذر رضؓ غفاری، ۹- عمار بن یاسر رضؓ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: لیکن اس حزب اختلاف کے تمام اصحاب دائرۂ طاعت سے باہر نہ تھے، بلکہ خلیفہ کے حکم سے جلاوطن ہوئے اور پھانسی پر لٹکنے کو بھی تیار تھے۔

اصل بات یہ ہے، اور یہی بنیادی چیز ہے کہ اسلامی مقننہ میں اسی حزب اختلاف کی گنجائش ہے جو ذاتی اغراض اور مفاد سے یکسر بے نیاز و بے پروا ہو، دولت، منصب، جاہ و حشم کوئی چیز بھی اس کے پیش نظر نہ ہو، صرف اللہ کے لیے، صرف فلاح امت کے لیے، صرف "فلاح یافتہ" اولٰئک ھم المفلحون بن کر لتاکم منکم امۃ یدعون الی الخیر کا فریضہ انجام دے، لیکن اگر منصب کو حصول اور دولت و ثروت پر قبضہ اور اقتدار و اختیار پر تسلط ہے تو ظاہر ہے عہد جدید کے سیاسی افکار کے مطابق وہ کامیاب حزب اختلاف کہلائی جا سکے، لیکن اسلامی جمہوریت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریت میں تو وہی حزب اختلاف پنپ سکتی ہے جس کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوۂ حسنہ ہو کہ جب آپ کے پاس مشرکین قریش آئے تھے کہا تھا:

"اگر مقصد یہ ہے کہ مال و دولت جمع کرلو تو ہم تیار ہیں کہ تمہارے لیے مال جمع کر دیں، اور اگر شرف و شرف کے طالب ہو تو آؤ ہم تمہیں اپنا سردار بنا دیتے ہیں اور اگر سلطنت مقصود ہے تو ہمیں کوئی عذر نہیں کہ تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیں۔

جواب میں آپؐ نے فرمایا:

"میری تعلیم نہ طالب مال کے لیے ہے نہ حصولِ مجد و شرف یا حصولِ اقتدار کے لیے[۱] ..... [۲]

اس طرح کی حزبِ اختلاف جس ملک میں بھی ابھرے گی وہ رحمت اور نعمت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ اور اسلامی جمہوریہ میں اس طرح کی حزبِ اختلاف کی گنجائش ہے۔

ماخذ:

[۱] سورۂ توبہ، پارہ ۱۰، رکوع ۳، آیت ۲۲؛ نیز ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران $\frac{11}{25}$؛ $\frac{12}{111}$۔ نیز سورۂ حدید $\frac{3}{9}$؛ نیز سورۂ اعراف پارہ ۸، رکوع ۱۹، آیت ۱۵۸۔

[۲] ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۳۲۹، حدیث ۴۰۱۱، کتاب الفتن، باب "الامر بالمعروف و نہی عن المنکر"، طبع مصر؛ نیز، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب "الامر والنہی"، ص ۵۹۷۔

[۳] جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، ج ۳، ص ۲۱۰، ابواب الفتن، باب "فضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر"

[۴] نسائی، ج ۲، ص ۱۷۵، ابواب الفتن، باب "فضل من تکلم بالحق عند امام جائر"

[۵] سراج الملوک (طرطوشی)، طبع مصر، ص ۱۴۹

[۶] صحیح مسلم، عن عائشہ صدیقہ رضؓ

[۷] یہ متفق علیہ روایت ہے، یعنی صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلم دونوں میں آئی ہے۔ دوسری کتب حدیث میں بھی مروی ہے۔

۸ مسند امام احمد بن حنبلؒ، ج ۱، ص ۲ -

۹ سراج الملوک (طرطوشی) ص ۱۵۰، (طبع مصر)

۱۰ حضرت عثمانؓ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی -

۱۱ حضرت عثمانؓ کا میر منشی تمام فتنوں کی جڑ -

۱۲ نہج البلاغۃ، تہذیب و تحشیہ، علامہ محمد عبدہٗ طبع مصر، ص ۱۰۹۸ — ۱۱۰۰)

۱۳ انساب الاشراف (بلاذری) ص ۴۶، ۴۷ -

۱۴ الفتنۃ الکبریٰ —— عہد عثمانؓ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۱۴۵ -

۱۵ انساب الاشراف (بلاذری) ص ۱۴ -

۱۶ الفتنۃ الکبریٰ —— علی و بنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر -

۱۷ کتاب الخراج (امام ابو یوسفؒ) ص ۱۱۷

۱۸ سیرت عمرؓ (ابن جوزی) ص ۱۲۷ ۱۹ کنز العمال ج ۵ ؛

۲۰ ابو بکرؓ (محمد حسین ہیکل) طبع مصر، ۸۷ -

۲۱ الفتنۃ الکبریٰ —— علی و بنوہ، ڈاکٹر طٰہٰ حسین ؛ طبع مصر -

۲۲ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۴ -

۲۳ الفتنۃ الکبریٰ -- علی و بنوہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین، طبع مصر -

۲۴ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۰۱ -

(۱۰)

عدل و انصاف

مشرق الاذکار خیر آبادی اور کیسرشت حکومت میں عدل و انصاف کے تذکرے بلا بال کیے جا سکتے ہیں۔ ابھی حال کی بات ہے، افریقہ کے ایک نو آزاد ملک کو نائیجیریا آمر نکرومہ نے بیک جنبشِ قلم ایک عدالتی فیصلے سے برہم ہو کر عدالت عالیہ کے تمام ججوں کو برطرف کر دیا تھا۔ ایسی حکومت میں تعزیر و عقوبت بھی کسی اصول کی پابند نہیں ہوتی۔ بیک اشارۂ چشم محلوں میں رہنے والے سیرِ زنداں کر دیے جاتے ہیں۔ بے گناہ اور معتوب بغیر کسی عدالتی کارروائی کے، یا نمائشی عدالتی کارروائی کے بعد نہ صرف املاک و جائداد سے بلکہ زندگی تک سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ جس کا مشاہدہ گذشتہ چند سالوں میں مشرق اوسط کے بعض ملکوں میں بار بار ہو چکا ہے یہی صورت عفو و رحم کی بھی ہے۔ جو دشمن قرار پایا وہ صفِ اندام میں شامل نظر آیا جس نے مخالفت کی جرأت کی، اسے ظلم سہنے اور عفو و رحم سے محروم رہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

رائج الوقت جمہوریت کے کرشمے: دنیا کے جن ممالک میں جمہوریت رائج ہے اور جو اپنے جمہوری روایات کی ایک مسلسل تاریخ رکھتے ہیں ان پر بھی اگر تعمق کی نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ عدل و انصاف، تعزیر و عقوبت اور عفو و رحم سے متعلق ان کے بنائے ہوئے قوانین میں تغیر اور تبدل کا غیر منقطع سلسلہ جاری ہے۔ اور ان سب پر مستزاد "ایمرجنسی" کی سپر ہر جگہ موجود نظر آئے گی، جس کی آڑ میں عدالتی کارروائی سے مستغنی ہو کر انتظامیہ محض اپنی

صوابدید پر ایک محدود لیکن توسیع پذیر مدت تک شخصی آزادی چھین سکتی ہے تعزیر و عقوبت کے اختیارات بھی کام میں لا سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام بھی قرار دے سکتی ہے۔ جیسا کہ بعض مغربی ممالک میں زنا کوئی جرم نہیں اور مخالف جنس طرفین کی رضامندی سے اختلاط تک جائز ہے۔ بے حجابانہ اختلاط مرد و زن، ٹائپ سوٹ، لباس، منی اسکیٹ، اور دوسرے فواحش چونکہ اکثریت کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہیں، اس لیے عدل کا تقاضا یہ ہے، کہ اس سلسلہ میں کوئی باز پرس نہ کی جائے۔ اس باب میں اور اگلے چند ابواب میں انہیں موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔

اسلام کا اصولِ عدل و انصاف: اسلامی جمہوریت میں اگرچہ انسان قانون بنانے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اکثریت غالب اکثریت، یا تین چوتھائی سے زیادہ اکثریت کی صورت میں بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو اسلام نے مقرر کر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عدل و انصاف بے لاگ اور بے لچک ہے۔ اس کی تعزیر و عقوبت خواہ وہ حدود شرعی کے ذیل میں آتی ہو یا امیر و قاضی کی شخصی صواب دید سے متعلق ہو، ایک خاص ضابطے کی پابند ہے اور اس میں حالات و مصالح کے ماتحت عفو و رحم کی بھی پوری گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل پر ظلم کا دھوکا نہیں ہوتا۔ اس کی تعزیر و عقوبت میں سفاکی، درندگی، بہیمیت اور خون آشامی کی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ اس کی عفو و رحم پر رحمتِ خسروانہ کے ذیل میں نہیں آتا، بلکہ عطیۂ الٰہی نظر آتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا عدل ہو یا تعزیر یا رحم۔ دوسری قوموں اور جمہوریتوں کے برعکس نسل و رنگ، ملک و قوم اور عقیدہ و مذہب سے ماورا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل" — یعنی جب لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو تو عدل کے ساتھ کیا کرو۔

اس آیت میں یہ پہلو خاص طور پر غور طلب ہے کہ عدل کا حکم صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں پر حاوی ہے، خواہ ان کا عقیدہ، دین نسل، رنگ کچھ بھی ہو۔ یعنی ایک مسلمان حاکم بعض "سیکولر" جمہوریتوں کی طرح غیر مذاہب کی اقلیتوں کے انسانی اور بنیادی حقوق پامال کرتے ہوئے انھیں صرف جور و ستم نہیں بنا سکتا۔ ان کے ساتھ وہی منصفانہ برتاؤ کرنے پر مجبور ہے جو اپنے ہم قوموں اور ہم مذہبوں کے ساتھ کرتا ہے۔ علامہ رشید رضا نے بہت بجا فرمایا ہے کہ اس آیت میں "اللہ تعالیٰ نے مطلق طور پر عدل کا حکم دیا ہے"[۱۲]

اس میں کسی کی تخصیص یا امتیاز کی گنجائش نہیں ہے۔ جصاص نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے انس بن مالک کی روایت درج کی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت اس وقت تک بخیر رہے گی جب تک بات چیت میں راست گوئی، فیصلہ کرنے میں عدل اور سزا دہی میں رحم، شفقت و کرم کا برتاؤ کرتے رہیں گے"[۱۳]

علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے: "اس آیۂ کریمہ میں خطاب والیوں اور حاکموں سے ہے"[۱۴]!

"یعنی امت مسلمہ کے والیوں اور حاکموں پر واجب ہے کہ فیصلہ کرتے وقت عدل کو ملحوظ رکھیں، اور بے عدل ہر طرح کی تخصیص اور امتیاز نسل، رنگ و مذہب سے ماورا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ:

"عدل کی اصل مساوات پر مبنی ہے"[۱۵]!

چنانچہ حسب روایت ابو سعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "قیامت کے دن خدا کی جناب میں سب سے زیادہ محبوب، مقرب بارگاہ، سب سے عادل ہوگا، اور سب سے زیادہ مغضوب اور سزا و عذاب شدید حاکم کو پیش ہوگا"[۱۶]

اس آیت کے مخاطب حاکم اور والی ہیں، تفسیر میں یہی بات درج ہوئی ہے۔ چنانچہ، محمد بن کعب بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت حکام کے لیے نازل ہوئی

ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "جب تک حاکم عادل بہ جور نہ ہو، خدا اس کے ساتھ ہے"[۲۷]

عدل کے لیے مساواتِ عامہ کو اسلامی حکومت میں کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے۔ جب ایک ناقابلِ معافی مجرم کی آپؐ سے سفارش کی گئی، اور آپؐ نے فرمایا:

"خبردار! اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی یہ جرم سرزد ہوتا تو میں اُس پر بھی حد جاری کر دیتا"[۲۸]

عدل اسلامی اور مساواتِ عامہ: اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر سے بھی حد ساقط نہیں ہو سکتی تو عام حکمرانوں، فرماں رواؤں، والیوں، حاکموں اور ارباب اقتدار و اختیار کی اولاد اور خویش و اقربا بھی ارتکاب جرم کے بعد اس کے لازمی نتائج یعنی تعزیر و عقوبت سے نہیں بچ سکتے۔

حضرت عمرؓ جب کسی عامل کو مقرر کرتے تو تاکید فرماتے:

"ہمیشہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنا"[۲۹]

خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ گو مزاج کے لحاظ سے نسبتاً سخت تھے لیکن عدل و انصاف کے معاملے میں فولاد آہن تھے کسی رو رعایت کے ساتھ نہ تھے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کوئی رعایت پسند نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور دوسرے قضاۃ کو دستور العمل متعلق آپؓ نے جو فرمان بھیجا تھا وہ خاص طور پر قابلِ غور ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: از عبداللہ عمر امیر المومنین بنام عبداللہ بن قیس، سلام علیک! اما بعد: عدالت فرض محکمہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو اس کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ کسی حق و صداقت کا بیان جس کا نفاذ کسی معتبر ذریعہ کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ ہو سکے، بے معنی ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں اپنی

مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو، تاکہ جو اعلیٰ ہو، وہ تمھاری رعایت کا امیدوار، اور جو ادنیٰ ہو، وہ تمھارے عدل سے ناامید نہ ہو جائے، جو شخص دعویٰ کرتا ہے، اس پر ثبوت ہے، اور جو شخص منکر ہو، اس پر قسم، مسلمانوں میں مصالحت جائز ہے، لیکن ایسی کہ جس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے، جو فیصلہ تم نے کل کیا ہے، اگر آج غور کرنے سے حق کے خلاف نظر آئے، تو اس سے جو غرض ہو کہ حق و صداقت ہی اصل چیز ہے، باطل میں پڑے رہنے سے حق کی طرف لوٹ آنا بہتر ہے، اور اس کو مثالوں اور نظیروں کو سمجھو، اور پھر انھیں نظائر پر قیاس کرو، جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک میعاد مقرر کر دو، اگر وہ ثبوت لائے تو اس کا حق دلا دو، ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کر دو، یہ وہ طریقہ ہے جس کی صحت و صداقت اظہر من الشمس نظر آ سکتی ہے، اور جس کے اختیار کرنے کے بعد کسی کو کسی قسم کے عذر کا موقع باقی نہیں رہ جاتا، تمام مسلمان ایک دوسرے پر شہادت کے لیے قابلِ اعتبار ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جنھوں نے حدِ شرعی میں درے کھائے ہوں، یا جھوٹی شہادت میں ان کا تجربہ ہو چکا ہو، یا اولاد اور وراثت کے بارے میں ان پر شبہ ہو، پوشیدہ امور کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہے، تمھارا کام ثبوت و شواہد کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا ہے، اظہارِ حق کے مواقع پر عی صحیح کی باتوں سے ہیجان میں نہ آجاؤ، غصہ کو راہ نہ دو دل گیر نہ ہو، اور نہ ان کی جانب سے اپنے اندر نفرت کے جذبات پیدا ہونے دو کہ (سادہ طریقہ پر) حق پہنچا دینا ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا اجر رکھتا ہے اور بڑی نیکی کا باعث ہوتا ہے۔ پس خواہ خود اپنے نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جو شخص اللہ اور اپنے درمیان اپنی نیت کو خالص رکھتا ہے، خدا تعالیٰ اس کو لوگوں کے شر سے بچا لیتا ہے، لیکن جو شخص اللہ کی نگاہ میں جو چیز حق ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے، خداوند تعالیٰ اسے تباہ و برباد

کر دیتا ہے۔[۱۰]

محکمۂ مظالم: محکمۂ مظالم ہمارے زمانے کی عدالتِ عالیہ کے برابر تھا۔ جب قوم کے اعلیٰ طبقہ کے کسی فرد کے قضیہ میں قاضی اپنے حکم کی تنفیذ سے عاجز ہوتا یا جب کوئی خواہش کا خیال ہوتا کہ قاضی فریقین کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے تو اس قسم کے تمام قضایا فیصلہ کے لیے اس عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ اس عدالت کی تخلیق کا منشا اساسی ذی جاہ و ذی حسب نژاد کے ظلم و تعدی کو روکنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان المظالم کی ریاست ایک جلیل القدر اور نہایت ہی متقی شخص کو دی جاتی تھی جو قاضی المظالم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

خلفائے راشدین میں سوائے حضرت علیؓ کے کسی اور خلیفہ نے مقدمات مظالم کی سماعت کے لیے کوئی اجلاس نہیں کیا۔ پھر آپ نے بھی ان کی سماعت کے لیے کوئی خاص علیحدہ دن یا علیحدہ گھڑی مقرر نہیں کی تھی۔ بلکہ جس وقت ناانصافیوں کے شاکی اپنی شکایت لے کر آتے تو فوراً ہی اس کی سماعت کرتے اور انصاف کے تقاضے کے مطابق حکم صادر فرما دیتے۔

قاضی المظالم کے اختیارات میں حسب ذیل چیزیں داخل تھیں:

۱۔ امراء کے خلاف جب کوئی شخص کسی طرح کا ظلم و زیادتی کریں اور جب کوئی شخص جب کہ وہ اہل اسلام کی اذیت کا باعث ہوں۔ بلکہ کسی کی ہتک کریں۔ نیز جو شخص بادشاہ کے اقربا یا طاقت ور ہوں۔ ان کا مقدمہ کرنا ہے۔

۲۔ اہل لشکر کی شکایات سننا جب کہ ان کا سامان خورد و نوش کم ہو یا وقت مقررہ میں تاخیر کر دی جائے۔

۳۔ قاضی و محتسب جن احکام کی تعمیل سے عاجز آ جائیں ان کا فیصلہ۔ اس تفصیل سے اس عہدہ کی اہمیت اور اس عہدہ دار کے اختیارات

ہو سکتا ہے۔ نیز ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عدل، دقتِ نظر، نکتہ سنجی اور کمال و اتقان کے کس درجہ پر پہنچ چکا تھا[۱۱]!

عبید اللہ بن عمرؓ کے خلاف فیصلہ! حضرت عمرؓ کو ایک ذمی نے قتل کر دیا۔ آپ کے صاحبزادے عبید اللہ نے جوشِ غم اور جوشِ انتقام سے ازخود نوٹس لے لیا۔ انھوں نے شبہے کی بنا پر ہرمزان اور جفینہ اور بدوی کی لڑکی کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی مسندنشینی کے فوراً بعد سب سے پہلا مقدمہ یہی پیش ہوا۔ حضرت علیؓ نے صاف اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ:

"عبید اللہ کو قتل کی سزا دی جائے!"

قانون کو ہاتھ میں لینا، دو ذمیوں اور ایک مسلمان کو شبہے میں قتل کر دینا، ایسا جرم نہیں تھا جو معاف کر دیا جاتا۔ اگرچہ جرم کا ارتکاب خلیفۂ راشد عمرؓ کے بیٹے ہی سے کیوں نہ ہوا ہو۔

لیکن دوسروں نے کہا کہ کل عمرؓ قتل ہوئے ہیں، آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے گا۔ یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔ المیہ اپنی جگہ پر، لیکن اسلامی جمہوریت کی بنیاد ہی قربانی کی تمنا حضرت عمرؓ نے کی تھی، حضرت عثمانؓ نے بھی اس کو اختیار کیا۔ اللہ کو سزا انھیں دی۔ اپنے پاس سے مقتولین کی دیت ادا کی۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"یہ واقعہ ان میں اسلامی خصوصیت کی دلیل نہیں تھا، اسلامی خصوصیت تو یہ تھی جو بیسیوں سے بالاتر تھی، بلکہ خود اختیارات خصوصی سے کام لینے ہوئے خلیفہ کو عفو و درگزر کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ حق مشروط ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر دین کے حدود میں سے کوئی حد معطل نہیں کی جا سکتی۔"[۱۲]

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں، مزید فرمایا ہے:

"بہرحال عبیداللہ کو کسی طرح کی سزا نہیں ملی: حضرت عثمانؓ نے اپنی جیب سے دیت ادا کرکے خود اپنے آپ کو وہ آزادی جو عبیداللہ کو ملنی چاہیئے تھی۔ اگر دیت کی رقم عبیداللہ پر حضرت عثمانؓ عائد کر دیتے، پھر ان کو جان بخشی کرتے تو کسی کو مجال دم زدن نہ ہوتی، اور اگر خطابؓ کے خاندان سے حسن سلوک کو مرعی رکھتے ہوئے دیت اپنی جیب سے ادا کر دی تھی تو بھی عبیداللہ کو اسیرِ زندان کر دینا تھا کہ وہ خدا سے توبہ کرتے جو خونِ ناحق انھوں نے کیا تھا، اس پر نادم ہوتے، اور اگر عثمانؓ ایسا کرتے تو عبیداللہ کو اندیشہ ہو جاتا کہ مسلمان اور ذمی کا خون خدا کے نزدیک اتنا محترم ہے کہ اسے ناجائز طور پر بہایا نہیں جا سکتا، اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل بلا عذر بخش آسودگی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے آزادانہ چھوڑ دیا جائے؟"

پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ: اس طرح کا مقدمہ اگر حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا جاتا تو وہ بے تامل و بے جھجک حدود کے اجرا میں لومۃ لائم کی پروا نہ کرتے: حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ نے انھیں ان حضرت عمرؓ سے متفاوت کر دیا ہے!"

عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کو مظلومیت کا احساس نہ ہو، وہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس پر زیادتی ہوئی ہے۔

حاکم کے اختیارات خصوصی: ایک بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ مخصوص حالات میں عارضی طور پر حاکم وقت کسی کی آزادی سلب کر سکتا ہے یا نہیں؟

امیر کو اختیار ہے کہ متہم کو تفتیش اور استبراء کے لیے محبوس کر دے لیکن اس کی مدت میں اختلاف ہے۔ عبداللہ زبیری شافعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک ماہ سے زیادہ حوالات کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور دوسرے

علماء کہتے ہیں کہ مدت متعین نہیں، امام کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے۔ یہی رائے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن قاضی بلا حق واجب کسی کو قید کرنے کا مجاز نہیں[۵۱۳]"

"حق واجب" کی تحدید اس حقیقت کی غماز ہے کہ کسی شخص کی آزادی اس وقت تک ـــــ سلب نہیں کی جا سکتی، جب تک جائز اور معقول وجوہ موجود نہ ہوں۔

لیکن حضرت عمرؓ کا مسلک اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کے بغیر کسی کے قید و حبس کو روا نہیں سمجھتے، چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

"خدا کی قسم اسلامی مملکت میں کوئی شخص اس وقت تک محبوس نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس کے خلاف عادل گواہوں کی شہادت موجود نہ ہو[۵۱۴]"

قابل دست اندازی اور ناقابل دست اندازی معاملات:

بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں، جو قابلِ دست اندازی ہوتے ہیں۔ اور بعض قابلِ دست اندازی نہیں ہوتے۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ان پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ چنانچہ:

"تہمت زنا کی حد اسی تازیانے ہیں، یہ مخصوص اور جمع نایہ ہے۔ اس میں کمی اور بیشی نہیں ہو سکتی یہ حق العباد ہے۔ لہٰذا بلا مطالبہ واجب نہیں ہوتی معاف کرنے سے ساقط ہو جاتی ہے جس کو زنا سے متہم کیا جائے، اگر اس میں پانچ شرائط جمع ہوں۔ اور متہم کرنے والے میں تین شرائط جمع ہوں تو حد واجب ہے۔

متہم بالزنا کی پانچ شرطیں یہ ہیں:

۱۔ بالغ ہو، ۲۔ عاقل ہو، ۳۔ مسلمان ہو، ۴۔ حر ہو۔

۵۔ عفیف ہو۔

لہٰذا بچے، مجنوں، باغلام یا کافر کو متہم کرنے والے پر حد جاری نہ ہوگی۔

ہاں تکلیف دہی اور بدزبانی کی وجہ سے سزا دی جائے گی۔

اور متہم کرنے والے کی تین شرطیں یہ ہیں:

۱۔ عاقل ہو، ۲۔ بالغ ہو، ۳۔ حر ہو۔

ناقابلِ قبول شہادت: اگر کوئی پاگل ہو تو حد قذف نہیں ہے۔ کافر کو مسلمان کی طرف عورت کو مرد کی طرف جو کچھ بات متہم کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے اس کی شہادت ناقابلِ قبول ہے۔

اس میں دو چیزیں خاص طور پر غور طلب ہیں:

ایک تو یہ کہ زنا کی تہمت اتنا بڑا جرم ہے کہ اس میں کافر و مسلم کی سزا دینے والے کی، کافر کو مسلمان پر فضیلت کا حق نہیں دے گا۔

دوسرے یہ کہ حسب نص قرآنی، ایسے شخص کی شہادت آئندہ ہمیشہ کے لیے ناقابلِ قبول ہوگی اور اس کا شمار فاسقین میں ہوگا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے پاک دامن خواتین کا احترام کس درجہ ملحوظ رکھا ہے، یہ بات بھی دنیا کی کسی مہذب و متمدن حکومت میں نہیں ملے گی۔

اب تین چیزیں اور قابل غور طلب ہیں:

۱۔ دیت، ۲۔ مخدرات، ۳۔ فیصلہ قاضی میں حکم۔

یہودی اور نصرانی کی دیت میں اختلاف ہے۔ احناف مسلمان کی دیت کے برابر کہتے ہیں۔

مخدرات (بدانتظامیاں) جب تک ظاہر نہ ہوں، محتسب ان کا تجسس اور پردہ دری نہ کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو کچھ کسی کو کوئی برائی سرزد ہو تو وہ اللہ کے بندے سے پوشیدہ رکھے۔ کیونکہ جو شخص اپنے کرتوت ہمارے سامنے ظاہر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی انتقامی حد اس کے لیے موجود ہوتی ہے۔ اگر آثار و قرائن سے کسی کی چیلنج یا فعل کی

تیاری کرنا معلوم ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں :

ایک یہ کہ اس سے ایسی حرمت کے ضائع ہونے کا خیال ہو کہ اس کی تلافی نہ ہو سکے، مثلاً ایک سچے اور معتبر شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک آدمی ایک عورت کے پاس خلوت میں ہے اور زنا کیا چاہتا ہے، یا کسی کو قتل کیا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں محتسب کو تفتیش و تحقیق کرنا جائز ہے، تاکہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب نہ ہو، اور ناموس دری نہ ہونے پائے۔ منقول ہے کہ ایسے معاملات کی جان بین اور رک تھام کرتے تھے۔

مغیرہ بن شعبہ کے متعلق بعض لوگوں کا بیان ہے کہ بصرہ میں بنو ہلال کی ایک عورت ام جمیل بنت عجلہ آیا کرتی تھی، اس کا شوہر قبیلہ ثقیف کا ایک شخص معبد بن عبید تھا۔ اس کی اطلاع ابو بکرہ بن مسروح سہیل بن معبد، نافع ابن حارث اور زیاد بن عبید کو ہوئی تو وہ گھات میں لگے رہے۔ ایک روز جب وہ مغیرہ کے پاس آئی تو وہ اندر گئے اور پھر انہوں نے جو شہادت حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی وہ مشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو ایسا کرنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ شہادت کو رد کرنے کی وجہ سے حد قذف جاری کی۔

حضرت عمرؓ کی مثال : ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک مجلس میں داخل ہوئے، لوگوں کو دیکھا کہ شراب نوشی کر رہے تھے، اور چھوٹے پیالوں میں آگ روشن کر رکھی تھی۔

آپؓ نے فرمایا : میں نے تمہیں شراب پینے سے روکا تھا، تم باز نہ آئے اور پھر یہ آگ روشن کرنے کی ممانعت کی تھی تم نے پھر روشن کی۔

لوگوں نے کہا۔ اے امیر المومنینؓ! اللہ نے آپ کو تجسس سے روکا ہے آپ تجسس کرتے ہیں۔ بلا اجازت مکان میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

اور آپؐ بلا اجازت داخل ہوئے۔

آپؐ نے فرمایا: اچھا وہ دونوں قصور ان دونوں کے خود ہی سمجھو، اور واپس چلے گئے۔

اگر مکان سے کسی جماعت کی نامناسب آوازیں اور شور سننے میں آئے تو ان کو باہر سے منع کرے۔ اندر داخل نہ ہو کہ اندر کا باہر سے اس کے خداوند انہ وفی حالات سے تعرض کرنا اس کے لیے نہیں۔

مظالم میں دخل دینے کے یہ معنی ہیں کہ جب اس کے متعلق عدالت کے احکام نافذ ہو گئے ہوں اور قاضی اور دوسرے حکام عدالت نے فیصلہ نافذ کر دیا ہو تو اب امیر کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ دیکھے کہ اس فیصلہ پر عمل ہوا یا نہیں کیونکہ اس شکل میں اس کے دخل دینے کے معنی ہیں کہ وہ ایک حق دار کو اس کا حق دلانے میں اس کے منکر کے مقابلہ میں مدد کر رہا ہے۔ یا حق دار کے لیے ایک ٹالنے ملنے سے اس کا حق لے رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ظلم اور بے جا قبضہ سے روکنا اس کے فرائض میں شامل ہے اور وہ مقرر ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ مہربانی اور انصاف کے ساتھ ان معاملات کا تصفیہ کر دے۔

مظالم میں امیر کے حدود اختیارات: اگر مظالم (معاملات) کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں پہلے عدالت کا حکم دینا ضروری ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی اس کی ابتدا کر لے تو ایسے معاملات میں امیر کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں، اس کے حیطۂ اقتدار سے خارج ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ ان معاملات کو فوراً اپنے شہر کے حاکم عدالت کے پاس تصفیہ کے لیے بھیج دے۔ اگر مخاصمین میں سے کسی ایک کے حق میں حاکم نے فیصلہ کر دیا اور وہ اس پر عمل کرنے سے قاصر رہا تو اس صورت میں امیر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے اقتدار سے اس فیصلہ کو عمل پذیر بنا سکے تیسرے

عدل کے سلسلے میں جو احتیاطیں ضروری ہیں اور جو مجبوریاں لاحق ہوتی ہیں انھیں کبھی اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔

حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "غصے کی حالت میں حاکم کو فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد تھا: "میں ظاہر امور کے اعتبار سے فیصلہ کرنے پر مامور ہوں۔ اسرار کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فریقین میں سے کسی کی جانبداری نہ فرماتے۔ آپؐ سے منقول ہے: "جب تمھارے پاس دو آدمی جھگڑا لے کر آئیں۔ تو جس طرح تم نے ایک کی بات سنی ہے اسی طرح جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو فیصلہ نہ کرو کہ یہی طریقہ اس بات کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ فیصلے کے راستے تمھارے سامنے کھول دیئے۔"

مسلم کی روایت ہے: "جب حاکم اجتہاد کرتا ہے اور ٹھیک کرتا ہے۔ تو اسے دو اجر ملتے ہیں، اور اگر اس سے غلطی ہو جاتی ہے تو ایک اجر پاتا ہے۔"[۱۸]

حاکم وقت بھی اگر کسی جرم کا مرتکب ہو تو سزا سے نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ولید بن عقبہ کو شراب نوشی کے جرم میں سزا ملی[۱۹]!

جانبدار حاکم: اور اگر کسی حاکم نے قیامِ عدل میں جانبداری، یا غفلت سے کام لیا، تو بالآخر مجبور ہو کر اسے اپنی غلطی کی تلافی کرنا پڑی جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:

"زیاد بن ابیہ کوفے کا گورنر تھا، اس کے حضرت حجر بن عدی رضؓ صحابیٔ رسول علیہ السلام سے مراسم تھے، لیکن ایک بات پر ٹھن گئی۔ ہوا یہ کہ ایک عرب مسلمان نے ایک ذمی (پناہ گزین غیر مسلم) کو قتل کر دیا۔ زیاد کو یہ بات گراں گزری ——— یاد رہے یہ امیر معاویہؓ کا زمانہ ہے ——— کہ ایک عرب قاتل کی گردن ایک ذمی

کے لیے اٹھا دی جائے۔ چنانچہ ان کے فیصلہ کیا دیتے اور اگر وہ بارے میں
ذمی کے قرابت دار دیت پر راضی نہ ہوتے تو وہ انتقام چاہتے تھے۔ ان کا
کہنا تھا کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام میں مساوات کا دعویٰ ہے اور عرب و عجم
عرب کے امتیاز کا قائل نہیں۔

حضرت جریر زیاد کے اس فیصلے سے بہت ناراض ہوئے اور اس فیصلے کو
نہ ہونے دینے کے لیے مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ دوسرے لوگوں نے بھی ان کا
ساتھ دیا۔ آخر زیاد نے مجبور ہو کر عرب اقوام کو خوش کرنے کے لیے یہ فیصلہ
لکھ بھیجا۔ انھوں نے جواب دیا:

"تم تک میں لگے رہو! جیسے ہی موقع پاؤ اس شخص کو قتل کر دو۔"

زیاد تک میں لگا رہا اور آخر کار اس نے ابن القدر کو بلا بھیجا اور
گرفتار کروا دیا۔ یہاں یہ صورت کتنی مبارک تھی کہ ایک بے گناہ شخص
کے دفاع میں قربان ہو گئی۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا: "بلاذری کا بیان ہے کہ
موت کی صدا نے بازگشت خود سنی اور ان کے خاندان کے لوگوں نے
ایک روز نماز پڑھتے ہوئے سنا۔

"امیر المومنین! آپ کی بھلائی ہے کہ آپ نماز کا اعلان کرنے والے
کے ذریعے کو قتل نہ کرایا ہوتا!"

ابن جریر کا قتل ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ کوفہ کے کسی
کسی کو بھی اس میں شک نہیں تھا کہ یہ واقعہ دیوانہ پن کا ایک نمونہ
حقیقت رکھتا تھا۔ راویوں اور مورخوں کی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ
کہتے تھے:

"جریر کی شہادت کے بعد میرا برا حال ہوا۔ ان کے ساتھ میرا دل بھی
دراز ہو گیا۔"

جس نے جہاد کر کے عدل و انصاف کا پرچم بلند کیا، اور حق و صداقت کا بول بالا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عدل کا فریضہ انجام دینا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب عدل اور خواہشات آمنے سامنے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

"اعدلوا هو اقرب للتقوى"

یعنی کسی جماعت کی دشمنی کے باعث ایسا نہ ہو کہ عدل سے منہ موڑ لو۔ ہر حال میں عدل کرو، کہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

حواشی:

۱۔ سورۂ نساء، پارہ ۵، آیت ۵۸۔

۲۔ تفسیر القرآن الحکیم، تیسیر الشیخ، ج ۵، ص ۱۰۱، مطبوعہ مصر۔

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible]

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible]

۸۔ [illegible]

۹۔ [illegible]

۱۰۔ [illegible]

۱۱۔ [illegible]

۱۲۔ [illegible]

۱۳۔ [illegible]

۱۴۔ [illegible]

۱۵ الاحکام السلطانیہ ص ۳۰۳ -

۱۶ الاحکام السلطانیہ ص ۳۰۷ - نیز ۳۲۸، نیز ص ۶۴ -

۱۷ صحیح بخاری کتاب الفتن -

۱۸ ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۴ - ۹۵ -

۱۹ الکامل (ابن اثیر) ج ۵، ص ۴۱ -

۲۰ علی وبنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) مطبوعہ مصر -

۲۱ سورۂ مائدہ، رکوع ۲ آیت ۸ -

(۱۱)

عدلیہ

دنیا نے یہ بات آج مانی اور سمجھی ہے کہ عدلیہ کو یکسر آزاد ہونا چاہیے۔ نہ اس کے احکام و فیصلوں میں مداخلت کی جا سکتی ہے، نہ ان کے نفاذ و اجرا میں رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے نہ اس پر کسی طرح کا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے، نہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ ہر طرح کی مداخلت سے بالا ہے اور اس کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ سربراہِ مملکت ہی کیوں نہ ہو۔

عدلیہ کی بالادستی اور برتری: دنیا نے اس بات کو اس طرح مانا اور سمجھا ہے جیسے یہ کوئی انکشاف ہے، جیسے یہ کوئی مطلبہ ہے، جو سب سے پہلے عہدِ جدید میں اہلِ دنیا کو بخشا گیا ہے۔

حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح دوسری جمہوری قدروں اور اصولوں سے دنیا کو سب سے پہلے اسلام نے روشناس کرایا اسی طرح عدلیہ کی آزادی اور برتری اور بالادستی کا تصور بھی سب سے پہلے اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔ اسے اسلامی جمہوریہ کی روح کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ سربراہِ مملکت (امیر یا خلیفہ) کسی کو قاضی مقرر کرتا ہے اور اس پر شرط عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے صادر کرنے میں مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی یا کسی اور مخصوص مکتبِ فکر کا پابند رہے گا۔ اور اس سے تجاوز نہیں کرے گا تو اس شرط کو فقہ کے جملہ مکاتبِ فکر فاسد قرار دیتے ہیں، اختلاف اس میں ہے کہ آیا اس شرطِ فاسد کے ساتھ قاضی (جج) کا تقرر جائز ہوگا؟

[illegible] باطل ہو گا [illegible] کے مطابق شرط فاسد ہو گی۔ اقرار جائز ہو گا یعنی قاضی کسی [illegible] فقہی مذہب کا پابند نہیں ہو گا۔

کیا اس سے [illegible] باندی [illegible] کی [illegible] ہو سکتی ہے؟

بدایہ اور سراج الوہاج: [illegible] کسی چیز کے اندر [illegible] یا سراج الوہاج کو دلائل کی حیثیت سے [illegible] کرنا [illegible] مقدمہ [illegible] ہے۔

حضرت نوح [illegible] کو [illegible] کہا [illegible] اسے [illegible] کر سکتی ہے۔

حضرت نوح [illegible] کو [illegible] دلائل کی حیثیت سے [illegible] قاضی شریح [illegible]

[illegible] کرتے ہوئے امیر المؤمنین سے خطاب کرتے ہیں:

"[illegible] آپ [illegible] تو [illegible]

[illegible]

[illegible] ممکن آور نہیں ہوتا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"ہاں بے شک یہ بے فیصلہ ہے"

[illegible]

[illegible]

علی کے خلاف [illegible] قیصر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دعوے کا ثبوت پیش کیجیے۔"

[illegible]

قاضی صاحب نے [illegible] کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

[illegible] اس فیصلے سے [illegible] خلیفہ جب

اپنے قاضی کے سامنے پیش [illegible] اپنے

[illegible] کہ خدا ایک ہے۔ اور [illegible] کے بندے اور رسول ہیں!"

پھر اس نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا: "بے شک یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ جب آپ صفین کی طرف جا رہے تھے تو میں بھی لشکر کے پیچھے ہو لیا تھا اسی موقعہ پر یہ زرہ آپ کے بھورے اونٹ سے گری تھی جو حاضر خدمت ہے!"

حضرت علیؓ نے فرمایا: "اب یہ تمھاری ہے!"[۳]

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اشعث بن قیسؓ باہمہ وجاہت و مرتبت قاضی شریح کے ایوانِ عدالت میں آئے، وہ قرار واقعی طور پر ان کا احترام بجا لائے، اسی اثنا میں ایک فریادی۔ اشعث کے خلاف چارہ جوئی کے لیے حاضر ہوا، قاضی صاحب نے اشعث سے کہا:

آپ مدعی کے پاس کھڑے ہو جائیے! لیکن اشعث نے تعمیلِ ارشاد میں تامل کیا۔

قاضی صاحب نے فرمایا: "اگر آپ مدعی کے پہلو میں کھڑے نہ ہوئے تو میں حکم دوں گا کہ آپ کو بجبر اس کے پاس کھڑا کر دیا جائے!"

آخر اشعث کو حکم بجا لانا پڑا۔[۴]

حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے: ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بہ حیثیت مدعا علیہ زید حارث کی عدالت میں تشریف لائے۔ زید جلالِ خلافت سے مرعوب ہو گئے، اور مسند پر اپنے پاس حضرت عمرؓ کو بٹھانا چاہا مگر وہ مدعی کے پہلو میں کھڑے رہے۔ مسند پر نہیں بیٹھے اور ارشاد فرمایا:-

"اس مقدمے میں آپ نے یہ پہلی بے انصافی کی ہے۔[۵]!"

اسی طرح کا ایک واقعہ بیہقی نے حضرت علیؓ کے متعلق بھی لکھا ہے:-

خلافتِ راشدہ کے بعد جو دور آیا، وہ بجا طور پر عہدِ سلاطین کہا جاتا ہے کہ خلافت کے ان خصوصیات اور اقدار کے آثار و نقوش رفتہ رفتہ اوجھل ہونے لگے تھے جنھوں نے اس عہدِ حکومت کو صحیح معنی میں حکومتِ الٰہیہ بنا دیا تھا اور جس طرح دوسری بہت سی قدریں اور خصوصیتیں مفقود و مجروح ہونے لگی تھیں۔ اسی طرح

عدلیہ کو بھی مستقل اور زیر دست رکھنے کی مساعی کا آغاز ہو گیا تھا لیکن امت مسلمہ کو اس بات پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس کی عدلیہ ہر دور میں خواہ وہ مستبد بادشاہ کا دور ہو یا آمرانہ فوجی اور مطلق العنان حکمرانوں کا یا آمریت اور اشتراکیت کا قضاۃ کی ہمیشہ بحیثیت مجموعی اپنے فرض منصبی کو بلا کسی رعایت کے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے اور بے خوف و خطر حکومت اور حکمرانوں کے خلاف فیصلے صادر کرنے میں بڑے سے بڑے خطرات کا سامنا کرنے کی اپنی شان اور آن قائم رکھی اور اس جادہ صواب سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

محکمہ قضا اپنے دور کی سیاسی مستقل مزاجی اور قضاۃ کے فیصلے صادر کرنے میں آزاد تھے۔ وہ کسی کی پالیسی سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی قید و بند نہ تھی۔ ان کے فیصلے دارالخلافہ کے ہر باشندے کے لیے واجب الاطاعت ہوتے تھے۔

عہدۂ قضا کے لازمی شرائط: عہد عباسیہ میں عہدۂ قضا کے لازمی شرائط میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ شریف خاندان سے ہو، عام اور مجتہد ہو، عیوب سے پاک ہو اور اللہ کے معاملہ میں لومۃ لائم کا خوف نہ کرتا ہو۔

استاذ امین بول لکھتا ہے کہ عہد اموی و عہد دولت عباسیہ کے قاضیان عدل و انصاف کے مطابق اپنے انہماک کی وجہ سے بڑی قابلیت و تجربہ کے حامل ہوا کرتے تھے۔ اور وہ لوگوں میں اپنی سلامت روی اور بلند اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ ان کے منصب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور ان کی ذات بڑے اثر و نفوذ کی مالک ہوتی تھی اس لیے ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہ ہوتا جو دوسرے عمال کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا چنانچہ قاضی عموماً مقدمات کے زمانہ میں اپنے عہدے پر فائز رہتے تھے ـــــ اگر ان کے احکام میں کوئی بالادست اقتدار دخل دیتا تو قاضی سب سے پہلے فوراً اپنا استعفیٰ پیش کر دیتے۔ قاضیوں کے ساتھ جمہور کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر

ولاۃ کے دل میں انھیں معزول کرنے کا کبھی کوئی خیال پیدا ہوتا تو جمہور رعایا کے ڈر سے وہ اپنی خواہش دل میں دبائے رہتے۔ پھر بھی یہ بات نہ صرف یہ کہ قاضیوں کو معزول کرنے کا اختیار والی کو حاصل نہ تھا، بلکہ عموماً ان کا تقرر بھی خلیفہ کے ذریعہ کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ اور ان کی خورد و نوش اور دیگر اخراجات کا انتظام خلیفہ کی ذات سے تھا۔

مقدسی کا بیان کردہ ایک واقعہ: مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم میں مذکور ہے کہ قاضی کا معزول کرنے سے متعلق اس کا اختیار خیال کیا جاتا تھا۔ موفق بالله کے عہد کے ایک قاضی نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ اس نے اس کو معزول کر دیا۔ اس نے اپنا مقدمہ خلیفہ کے سامنے پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کے حق میں فیصلہ کیا اور اس کو بحال کر دیا۔ اس کے بعد احمد بن طولون نے ان کو ان سے معزول کرنے کا ارادہ کیا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ ابن طولون نے انکار کیا۔ قاضی نے اس پر اصرار کیا۔ ابن طولون برہم ہوا۔ اس سے ابن طولون غضب ناک ہو گیا۔ پھر وہ ان کی تعظیم کرتا تھا۔ ان کو نذر بھیجتا تھا اور ہر سال ان کی خدمت میں ایک ہزار دینار بھیجتا تھا۔ جب اس کا غصہ فرو ہوا تو اس نے کہلا بھیجا۔

"میرے مقدمہ کا کیا ہوا؟"

قاضی نے جواب میں کہا: "جوں کے توں لکھا ہے۔"

ابن طولون نے کہا: "اپنے گھر میں جا کر مقدمہ کو دیکھو۔" جب قاضی نے گھر جا کر دیکھا تو اس نے اپنے اختیار کو کھو دیا۔

یہ ہے عدالت کی اہمیت کہ اس کو دباؤ سے آزادی اور خود مختاری حاصل تھی۔

جب عدالت کو قاضی کے ذریعہ سے حاصل ہوا تو ایک کو اس کی اہمیت اور اختیار کے نکلنے تھے۔

آپ کو مامون نہیں سمجھتا پھر جب تم غیض و غضب کے عالم میں آؤ، تو میں کیونکر مامون رہ سکتا ہوں؟"

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دور کے ایک قاضی عمر بن عبدالرحمٰن کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کشیدگی کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود ابن عبدالرحمٰن کے فیصلوں پر تنقید کی تھی۔ ابن عبدالرحمٰن نے منصور سے شکایت کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منصور نے امام ابو حنیفہ کو فتویٰ دینے سے منع کر دیا۔ اس عہد میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہے کہ خلفائے عباسیہ نے اپنے مخالف علماء اور ان کے ہمدرد اور دوسرے لوگوں سے پہلے تو امن و امان کا وعدہ کیا، پھر اس کے بعد قاضیوں کے فتویٰ کی آڑ لے کر اپنے دشمنوں کی سزا کی تجویز کی، چنانچہ سفیان نے ابن عیینہ، منصور نے محمد بن عبداللہ معروف بہ نفس زکیہ اور ہارون رشید نے یحییٰ بن عبداللہ کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر شاہد پیش کیا جا سکتا ہے۔

امام ابو یوسف اور ہارون رشید: عباسیوں کے قاضی بے بدل امام ابو یوسف کے سامنے خلیفہ ہادی کے خلاف ایک مقدمہ دائر ہوا۔ دعویٰ یہ تھا کہ اس نے ایک دوسرے شخص کے باغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ امام صاحب نے مدعی کے بیان سے اندازہ لگایا کہ سچا ہے لیکن گواہوں کی فوج مدعا علیہ کے پاس تھی جن کے قبضۂ اقتدار میں سب کچھ تھا۔ امام صاحب کے دماغ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی ایک نئی ترکیب آئی۔ انھوں نے دوسرے گواہوں سے قطع نظر کر کے فرمایا:

"مدعی کا کہنا ہے کہ ہادی حلف اٹھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں۔"

"حلف ـــــ ہادی سے؟" وہ برہم ہو گیا لیکن قاضی بھی کوئی معمولی نہ تھا۔ مجال دم زدن نہ تھی اس کے سامنے اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور باغ مدعی کو مل گیا

ایک مرتبہ کچھ ایسی ہی صورت خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ پیش آئی۔
امام صاحب نے قسم کھانے کا مطالبہ کیا۔
فضل بن ربیع گواہ کی حیثیت سے حاضر تھا لیکن امام صاحب نے فضل کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
خلیفہ ہارون رشید نے تیوری چڑھاتے ہوئے دریافت کیا: "فضل کی شہادت کس لیے رد کی گئی۔؟"
امام صاحب نے جواب دیا: "میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے دیکھ رہا تھا۔ میں آپ کا بندۂ ناچیز ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو عام کی گواہی قبول نہیں کی جاتی، اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو ایک دروغ گو کی شہادت کیسے قبول کر لوں؟"
مہر عباسیہ کا ایک اور واقعہ بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ واقعہ ذہین مامون سے متعلق ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی قاضی کے ادب و جلال کا کیا عالم تھا۔ اور ایک حق پسند خلیفہ کا انداز فکر و نظر کیا تھا۔؟
مامون کے پاس ایک فریادی عورت حاضر ہوئی اور:
مامون نے پوچھا: "تیرا مدعا کون ہے؟"
عورت نے کہا: "امیر المومنین کا بیٹا عباس جو حضور کے پاس کھڑا ہے۔"
امام ابو یوسف، قاضی ایاس بن معاویہ اور بعض کہتے ہیں۔ اپنے داماد احمد بن ابی خالد کو حکم دیا کہ عباس کو عورت کے ساتھ بٹھا کر دونوں کے بیانات لو۔
دونوں کو بٹھا کر بیانات لینے شروع کیے گئے تو عورت زیادہ بلند آواز سے بولنے لگی۔
ایک سپاہی نے اسے دھمکایا تو مامون نے کہا:
"اسے کچھ نہ کہو، اسے حق بول رہا ہے۔ اور عباس کے باطل نے گونگا کر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قاضی عزیز الدین اور ملک صالح: قاضی عزیز الدین بھی بڑے دبدبے اور طنطنے کے بزرگ تھے، یہ عہد ایوبیہ کا واقعہ ہے۔ وہ ملک صالح فرمانروائے دمشق سے اس بات پر خفا ہوئے کہ اس نے عیسائیوں کے حوالے کر دیے تھے۔ قاضی صاحب کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ خطبے میں انھوں نے صالح کا نام لینا بھی بند کر دیا اور اپنے منصب سے مستعفی ہو کر مصر چلے گئے۔

آخر سلطان صالح نے اپنا ایک قاصد ان کی خدمت میں بھیجا اور اسے تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو انھیں راضی کرے اور واپس لے آئے۔ قاصد مصر آیا اور قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا:

"آپ کے مصر آجانے سے سلطان بہت رنجور ہیں۔ وہ تو آپ کے قدر شناس اور مداح ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ آپ واپس آجائیں اور سب سابق اپنا منصب قضا سنبھال لیں۔ وہ ٹھہرے فراخ دل، آپ ان کے پاس چلیے، ان کے ہاتھوں کو چومیے اور انھیں خوش کر لیجیے۔"

قاضی عزیز الدین نے جواب دیا: "بہت خوب میں اسے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ سلطان صرف یہ بات ہاتھوں کو بوسہ دے۔ نہ کہ میں اس کے ہاتھ چوموں!"[1]

غرض اسلامی جمہوریت میں عدلیہ کی آزادی اور قضاۃ کی بے باکی سے متعلق اتنا مواد موجود ہے کہ اگر اس کا استقصاء کیا جائے تو ایک پورا ضخیم دفتر تیار کیا جا سکتا ہے لیکن جو مثالیں اوپر پیش کی گئیں وہ بھی ناکافی نہیں ہیں۔

ماخذ:

[1] الاحکام السلطانیہ: ص ۱۱۳۔

۲۔ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) طبع مصر، ص ۲۵۵۔

۳۔ 〃 〃 〃

۴۔ تاریخ القضاء فی الاسلام (محمد بن محمد بن عرفوس) مطبوعۃ مصر، ص ۱۳۵۔

۵۔ کنز العمال، ج ۳، ص ۱۷۴۔

۶۔ نظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسین ابراہیم حسن) طبع مصر، ۳۶۰۔

۷۔ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) [illegible] in the [illegible] of Egypt in the [illegible] Hijra

۸۔ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر۔

۹۔ 〃 〃 〃

۱۰۔ ابوحنیفہ (عبدالحلیم الجندی) مطبوعۃ مصر، بکیانہ مدافعہ اجتماعیہ (استاذ سید قطب شہید)

۱۱۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۳۴

۱۲۔ سورہ حشر، پارہ ۲۸، آیت ۳۸ رکوع ۵۔

۱۳۔ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۵۵

۱۴۔ تاریخ القضاۃ فی الاسلام (محمد بن عرفوس) طبع مصر، ص ۱۳۵۔

۱۵۔ 〃 〃 〃

(۱۲)

تعزیر و عقوبت اور اس کے متعلقات

بقول حضرت عمرؓ ہر شخص ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے۔ آزادی اس کا حق ہے اور اس حق کو ہرگز چھینا نہیں جا سکتا، لیکن ہر چیز خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو، اپنے کچھ حدود و شرائط رکھتی ہے اور ان حدود و شرائط کی پاسبانی اور نگہداشت اس حکومت کا فرض ہے جو عوام کی مرضی سے بنائی گئی ہو، جس کی تعمیر و تخریب اور تشکیل و تنسیخ میں عوام کی مرضی فیصلہ کن ہو، جو اپنے قیام و بقا میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کی رہین منت ہو، یہ ایسا جمہوری اصول ہے جو تقریباً متفق علیہ ہے کسی کو بھی اس سے یا رائے اختلاف نہیں، اسلامی جمہوریت نے بھی ان اصولوں کو پورے طور پر مرعی رکھا ہے۔ اور ان اصولوں پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے اقدام و عمل میں کتاب و سنت کی پابند بھی ہے، اس لیے اس کی وضع و ہیئت عام جمہوریتوں کے مقابلہ میں زیادہ نمائندہ حیثیت کی حامل ہے۔ لہٰذا انفرادی آزادی کے حدود و شرائط کی پاسبانی اور نگہداشت جتنی بہتر اور جتنی بے لوث وہ کر سکتی ہے کسی اور سے ممکن نہیں۔

انفرادی آزادی کے حدود: بلاشبہ انفرادی آزادی ایک غیر اختلافی اور غیر نزاعی مسئلہ ہے، لیکن اس آزادی کو فتنہ نہیں بننا چاہیئے۔ فساد انگیز نہیں ہونا چاہیے۔ امن شکن نہ ہونا اس کے لیے ضروری ہے، دوسروں کی عافیت اور حکومت کے نظم و استحکام میں خلل ڈالنے کا حق اسے نہیں دیا جا سکتا، اور اگر ایسا ہو تو حکومت اپنے اختیارات سے مسلح ہو کر سامنے آئے گی۔

اور فتنہ و فساد کو کچل دے گی، وہ قتل کو معاف نہیں کر سکتی۔ چور سے صرف نظر نہیں کر سکتی، سماج دشمن عناصر کو نظر انداز نہیں کر سکتی، متاع عصمت و ناموس لوٹنے والوں کے لیے اس کے ہاں رعایت کا دروازہ بند ہے۔

ایک غور طلب مسئلہ: اس موقع پر ایک خاص پہلو توجہ طلب ہے: عام جمہوریتیں، جو صرف انسانی فکر و رائے کی تخلیق ہوتی ہیں، اپنی مقننہ میں کثرت رائے کے بل پر جس قسم کے اختیارات چاہیں حاصل کر سکتی ہیں، اور ان کو بے محابا استعمال بھی کر سکتی ہیں، بڑی سے بڑی برائی اگر "قانون" بن جائے تو وہ جائز ہے۔ زیادہ سے زیادہ ناجائز، ناروا اور نامناسب اختیارات اگر "بل" کی صورت میں پیش ہو کر "ایکٹ" بن جائیں تو ان کا حد درجہ بے رحمانہ اور غیر انسانی استعمال عین جمہوریت ہے۔ بھارت میں، قبرص میں، اسرائیل میں جمہوریت کی سفاکی سے اقلیتیں جس طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ بلکہ جس طرح ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے، اس سے کون ناواقف ہے؟ انسانی جمہوریت، دوسروں پر پابندی لگا سکتی ہے لیکن وہ خود کسی پابندی کو قبول کرنے کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ اکثریت کا فیصلہ ناطق ہے اور حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقلیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سر تسلیم خم کر دے۔ ورنہ بہ جبر بغاوت تعزیر و عقوبت کے شکنجے میں کچلنے اور پسنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت نے جہاں فرد کی آزادی کو چند حدود و شرائط کا پابند کیا ہے، وہاں حکومت کے لیے بھی چند حدود و شرائط مقرر کر دیے ہیں جن سے وہ سر مو تجاوز نہیں کر سکتی۔ یعنی جس طرح فرد اپنی آزادی کا بے محابا استعمال نہیں کر سکتا، وہاں اسلامی جمہوریت بھی آنکھیں بند کر کے اور کان بہرے کر کے اور موثرات و پس منظر کو نظر انداز کر کے اندھا دھند تعزیر و عقوبت کے اختیارات استعمال نہیں کر سکتی، وہ "موثر بہ ماضی" قانون نہیں بنا سکتی اگر ایسا ہوتا تو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے والی ابوسفیانؓ کی بیوی کو پرانے عفو

عطا نہ ہوتا۔ اور نہ اس مجرم کو معافی عطا کی جاتی جو حضرت عثمانؓ کی رفیقۂ حیات اور آنحضرت صلعم کی صاحبزادی کی وفات کا سبب اپنی سفاکی کے باعث بنی تھا۔ اور نہ مکہ مکرمہ کی اس بوڑھی باندی کو معاف کیا جاتا جس نے اوائل اسلام میں اسلام کے نام لیواؤں کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ اور ان کے املاک و جائداد، مکان اور کھیت، ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور نہ اسے جبر و جور سے غصب کردہ املاک و جائداد پر قابض رہنے دیا جاتا۔ اور نہ مرتدین و مخالفین سے زمام اقتدار و اختیار ہاتھ میں آنے کے بعد درگزر کا معاملہ کیا جاتا۔

تعزیر و عقوبت کے حدود: اسلامی جمہوریت اپنے حدود میں رہ کر تعزیر و عقوبت کا اجراء اور نفاذ کر سکتی ہے۔ لیکن جرم سے بڑھ کر سزا نہیں دے سکتی۔

قرآن کریم نے اس سلسلے میں جو حدود مقرر کر دیے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان[۱] — یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

۲۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا[۲] — یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

۳۔ الفتنۃ اشد من القتل[۳] — یعنی فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ شدید ہے۔

۴۔ وانزلنا معہم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس[۴] — یعنی ہم نے انبیاء کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا تاکہ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا پیدا کیا۔ جو شدید طور پر خطرناک بھی ہے اور زبردست اشیاء منفعت بخش بھی۔!

ان آیات کریمہ سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے، یہ ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ سزا کا حکم دیتا ہے، ساتھ ہی ساتھ احسان کا بھی یعنی اگر با کل ناگزیر ہو تو سزا دی جائے، ورنہ عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔

۲- سزا دی جائے تو وہ جرم سے زیادہ سنگین نہ ہو، زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے، اسے بس جرم کے مساوی ہی ہونا چاہیے۔

۳- فتنہ و فساد کو ہر قیمت پر دبانا اور کچلنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بجائے خود قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے، اسے اگر پھلنے پھولنے دیا جائے تو یہ کثرت و خون کے ختم نہ ہونے والے سلسلے کا موجب ہو سکتا ہے جو آخر کار پوری قوم اور ملک کے لیے تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوگا۔

۴- انبیاء کو "کتاب" دی گئی، تاکہ حدود الٰہی کسی وقت بھی نظر انداز نہ ہونے پائیں۔ انھیں میزان (ترازو) عطا کیا گیا، تاکہ وہ مساوات کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ انھیں لوہا دیا گیا، تاکہ فتنہ و فساد کی صورت میں وہ اسی سے کام لیں اور امن و عافیت کے دور میں بھی لوہا تلوار اور سنگین کے بجائے منفعت بخش کاموں میں استعمال کیا جائے۔

ایک اہم نکتہ: اس جگہ یہ نکتہ خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انبیاء کے ساتھ "نزول آہن" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نبی حکومت کی زندگی پر نہ قانع ہو سکتا ہے، نہ اس پر فخر کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ حکومت کی حیثیت ہیں، نہ "کتاب" اس کے کسی کام آ سکتی ہے، نہ "میزان" سے کام لے سکتا ہے، نہ حدید (لوہا) کا استعمال کر کے فتنہ و فساد کا قلع قمع کر سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت ہی اکیلا مقصد نہیں، بلکہ غیر ثابت ہے اور دستور زندگی بھی ہے۔ لہٰذا وہ خیر کا داعی بھی ہے اور شر کا استیصال کرنے والا بھی۔

"اسلام کے قانون جنائی یعنی تعزیرات میں مجرمین کی پانچ جماعتوں کے علاوہ کسی مجرم گروہ کے لیے عقوبات متعین، و مقرر نہیں کی گئی ہیں۔

ایک تو وہ لوگ جو خدا اور رسول سے برسرِ جنگ ہوتے ہیں اور خدا کی اس زمین کو فساد و فتنہ کی جولان گاہ بنا دیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جو پاک دامن اور عفت مآب خواتین پر اتہام لگاتے ہیں۔

تیسرے وہ لوگ جو قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

چوتھے وہ لوگ جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پانچویں وہ لوگ جو چوری کرتے ہیں۔

مذکورہ جرائم کے علاوہ جتنے جرم ہوتے ہیں، ان کے لیے اسلام نے کوئی عقوبت اور تعزیر مقرر نہیں کی، بلکہ اسے حاکموں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ امن و امان، دفع شر، ازالۂ فساد اور استیصال فتنہ کے پیش نظر جو عقوبت اور تعزیر مناسب سمجھیں جاری کریں۔ اس لیے کہ بقیہ جرائم امتوں اور قوموں کے حالات، ماحول، زمانہ اور عصر کے ساتھ اپنی نوعیتیں بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا ہر امت کے ارباب اقتدار و اختیار اور ارباب حل و عقد کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا کہ وہ خود عقوبات و تعزیرات کا مناسب نظام مقرر کریں اور عقوبت کا جو اصل مقصد ہے اسے پیش نظر رکھیں۔

علامہ ابن قیم کا ارشاد: چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

سنن دار قطنی میں جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جارح سے اس وقت تک تاوان لینے سے منع فرمایا ہے جب تک مجروح کا زخم مندمل نہ ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زخم جب تک مندمل نہ ہو جائے یا سرایت مستنقذ کی صورت نہ اختیار کر لے، قصاص لینا درست نہ ہوگا۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ ضرب کا قصاص ہے، خواہ وہ ضرب کوڑے

لگائی گئی ہو، یا کسی اور چیز سے۔

نیز اگر مضروب قصاص کی جلدی کرے، پھر اس کے بعد اس کا زخم سرایت اختیار کرے۔ یعنی ایک عضو سے دوسرے عضو تک پہنچ جائے۔ تو پھر قصاص لے چکنے کے بعد اس سرایت کی الگ سے کوئی سزا نہیں ملے گی، قصاص کافی سمجھا جائے گا۔ اب امام کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ مجرم کو قید کرے یا کوئی اور سزا دے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان نے اگر معاہد کو عمداً قتل کیا ہے تو اس کی دیت اتنی ہی ہوگی جتنی ایک مسلمان کی ہوتی ہے، اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو ایک قول کے مطابق مسلمان سے نصف اور دوسرے قول کے مطابق ایک تہائی دیت دینا ہوگی۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ قتل خواہ غلطی سے ہو، یا جان بوجھ کر ایک تہائی دیت واجب ہوگی۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب قصاص کا اصول دونوں میں (یعنی مسلم اور غیر مسلم میں) حاوی ہے تو دیت بھی مساوی ہوگی۔[۶]

زنا کی سزا اور اس کے مستثنیات: زنا کی سزا سزائے تازیانہ ہے۔ یا رجم (سنگساری)؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

شیخ محمد خضری بک نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زانی کی حد (سزا) بغیر کسی تفصیل کے بیان کر دی ہے۔ جس کو آگے چل کر سورۂ نور میں صراحت سے موجود ہے۔ یعنی سنت کی رو سے شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو سزائے تازیانہ ملے گی۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ ابو اسحٰق شیبانی نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے سوال کیا:

"کیا رسول اللہ صلعم نے کسی کو سزائے سنگساری دی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں دی ہے۔"

اس کے بعد ابو اسحٰق نے پھر سوال کیا:

"آنحضرت صلعم نے سنگساری کی سزا سورۂ نور نازل ہونے سے پہلے دی تھی یا بعد میں؟"

عبداللہ نے جواب دیا: "میں نہیں جانتا۔"[۸]

لیکن علامہ ابن قیمؒ اس کتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو سنگساری کا قائل ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اگر کوئی آزاد شادی شدہ شخص کسی باندی سے زنا کرے تو بھی سنگسار کیا جائے گا۔

شادی شدہ شخص کی سزا سنگساری ہے۔

زانی جب تک چار مرتبہ اقرار جرم نہ کرے، سزا نہیں پائے گا۔ وہ باتیں مرتبہ کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ کیونکہ نصاب اقرار کی تکمیل نہیں ہوئی۔ امام کو چاہیے کہ اس سے اعراض کرے اور عدم تکمیل اقرار کے باعث اس کو ماخوذ نہ کرے۔

پاگل یا نشہ میں مست شخص کا اقرار لغو ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح اس کی طلاق، عتاق، ہبہ اور وصیت بھی غیر معتبر ہے۔

امام کے لیے مناسب یہ ہے کہ اقرار زنا کرنے والے کو عدم اقرار پر مائل کرے۔

جو شخص تکریہ زنا سے لاعلم ہے اس پر حد جاری نہیں ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے زنا سے جھوٹ بولنے والے کے رجم میں توقف فرمایا اور فرمایا کہا تھا میں نے اس باندی کے ساتھ وہ فعل حرام کیا ہے کہ اگر شوہر بیوی کے ساتھ کرے تو حلال ہوتا ہے۔

حاملہ عورت پر حد جاری نہیں ہوتی، جب تک وہ بچہ نہ جن لے۔ اسے پوری مدت تک دودھ نہ پلا لے۔

اس معافی پر تائب ہونے کے بعد سب و شتم ناجائز ہے۔

: حد زنا میں جو شخص قتل ہوا اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

: زنا کا اقرار کرنے والا اگر اثنائے حد میں بھاگ جائے تو چھوڑ دیا جائے پھر اس پر حد پوری نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ یہ فرار یا تو اقرار زنا سے رجوع ہے، یا تکمیل حد سے توبہ ہے۔ اب اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ کا مسلک یہی ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ زانی کے لیے سزائے سنگساری کے جو اسباب و اکابر ذکر ہیں وہ بھی اس سلسلے میں اتنے دو شرائط عائد کرتے ہیں کہ سنگساری تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔

ثبوت زنا کی دو ہی صورتیں ہیں:۔

۱۔ اقرار۔ ۲۔ شہادت۔

پہلی صورت میں امام خود اسے مائل کرتا ہے کہ اقرار سے باز آ جائے، نہ باز آئے تو اثنائے حد میں بھاگ کھڑا ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اقرار سے رجوع کر لیا۔

دوسری صورت میں شہادت کے شرائط اتنے کڑے ہیں کہ ان کا مکمل تقریباً ناممکن ہے کہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعداد میں چار ہوں، ذات میں ہوں، بیانات میں تضاد نہ ہو اور ان کی شہادت کا مجلس ہونا ضروری ہے آسان نہیں۔ مطلب یہ کہ اصول سے تغیر پر بھی حد ساقط ہو جائے گی۔

: نو مسلم زنا کی حد سے ناواقف ہو تو حد ساقط ہے۔

شیخ الخضری کہتے ہیں کہ زنا کی حد کے متعلق جو اصول شرعی ہیں وہ یہ ہیں:

قرآن کریم نے حدود کے متعلق جو اصول شرعی رکھے ہیں یہ ہیں:

۱۔ مصلحت امت، ۲۔ نوع مجرم، ۳۔ نفسیات مجرم کے پیش نظر

عقوبات جسمانی کا نفاذ ہے۔

بلاشبہ یہ اصول بجا اور درست ہیں، لیکن جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے۔ عقوبات کے نفاذ میں زیادہ سے زیادہ مستثنیات رکھے گئے ہیں۔ تاکہ ایک طرف سزا کی دہشت قائم رہے، دوسری طرف اگر ذرا بھی گنجائش نکلتی ہو تو سزا کا نفاذ نہ کیا جائے۔

جسمانی عقوبات کی شدتِ تاثیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عربیہ میں جہاں سزائے رجم و قطع ید جاری ہے۔ برس ہا برس میں شاذ و نادر ہی کوئی اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

چوری کی سزا اور اس کے مستثنیات: چوری کی سزا قتل سے بھی بعض حد درجہ سخت ہے۔ اس لیے اس میں مستثنیات زیادہ سے زیادہ رکھے گئے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس مال کی اصل مباح ہو اس میں قطع ید نہ کیا جائے۔ جیسے شکار، گھاس۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ سارقِ مصحف کو (قرآن) قطع ید کی سزا نہیں ملے گی۔

اگر صغیر سن غلام جو ناسمجھ ہو یا بھی چرا لے تو قطع ید نہ کیا جائے۔

چوری کی تعریف ہے کہ کوئی چیز بحفاظت رکھی ہو اور اڑا لی جائے بصورت دیگر وہ چوری نہیں۔ لہٰذا اس کی سزا بھی قطع ید نہیں ہے۔

"حفاظت (حرز) کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے۔ داؤد ظاہری۔ وہ حفاظت کا کوئی اعتبار نہیں کرتے۔ ہر سارق کو خواہ حفاظت سے سرقہ کرے یا بے حفاظت میں قطع ید کا حکم دیتے ہیں۔ اور جمہور وجوب قطع میں حفاظت کا اعتبار کرتے ہیں۔ غیر حفاظت سے سرقہ کرنے والے کو قطع ید کی سزا نہیں دیتے۔

نبی کریم صلعم سے مروی ہے کہ گھوڑے کی سرقہ میں جب تک چوراہ مشغول نہ آئے قطع ید نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر مستعار لے کر انکار کر دے قطع ید نہیں۔

جو علماء حفاظت کو شرط کہتے ہیں۔ وہ اس کی کیفیت میں مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ ہر شئے قیمتی اور غیر قیمتی کی حفاظت یکساں قرار دیتے ہیں۔

بچے کو قطع نہ کیا جائے۔ مدہوش بحالت مدہوشی چوری کرے تو قطع ید نہ کیا جائے۔

غلام اپنے آقا کے مال کی چوری کرے یا باپ بیٹے کے مال کی چوری کرے تو قطع ید نہ کیے جائیں[۱۲]۔

ان مستثنیات کی رو سے صرف قطع ید کی حد ساقط ہوگی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ چور کو سرے سے سزا ہی نہیں ملے گی، حاکم وقت شرعی طور پر اس امر کا مجاز ہے کہ تادیباً سزا دے، خواہ جرمانے، خواہ کچھ عرصے کے لیے حبس و قید کی، یا حالات کے لحاظ سے جو سزا بھی عدل و قسط کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب سمجھے دے سکتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ نافذ ہوگی بلکہ جائز بھی ہوگی۔

اوپر کی سطروں میں بتایا گیا ہے کہ چوری وہیں مانی جائے گی جہاں مال حفاظت سے رکھا ہو۔ ایسی صورت میں قطع ید لازمی ہے۔ برعکس صورت میں کوئی دوسری سزا دی جائے گی۔ قطع ید سے احتراز کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں چند اور مستثنیات کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جو فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ سے ماخوذ ہیں، چونکہ ان کی قانونی حیثیت ہے اس لیے یہ تفصیل ضروری ہے:

۱۔ دار الاسلام میں جو چیز عام اور کم قیمت ہو۔ مثلاً خشک لکڑی، بانس، پھل، پرند، شکار، نمک، مٹی اور پانی۔ ان چیزوں کی چوری پر چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۲۔ ایسی چیزیں جو جلد خراب ہو جاتی ہوں، مثلاً دودھ، گوشت اور تازہ میوے۔ ان کی چوری پر قطع ید نہیں۔

۳۔ درختوں پر لٹکے ہوئے پھل اور وہ کھیتی جو کاٹی نہ گئی ہو۔ ان کی چوری

پر قطع ید نہیں۔

۴۔ سرور انگیز اور مست کر دینے والی چیزوں پر بھی قطع ید نہیں۔

۵۔ طنبورا یعنی آلات موسیقی کی چوری پر بھی قطع ید نہیں۔

۶۔ قرآن چاہے اس پر سنہری کام کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اس کی چوری پر قطع ید نہ ہوگا۔

۷۔ دفاتر یعنی رجسٹر کاغذات وغیرہ، اگر اس میں قرآن مجید کی تفاسیر حدیث اور فقہ کی کتابیں ہی کیوں نہ ہوں ان کی چوری پر قطع ید نہیں۔

۸۔ کتے اور ریستے کے چور کا ہاتھ نہیں کٹے گا۔

۹۔ خیانت کرنے والے مرد یا عورت پر حد نہیں۔

۱۰۔ لوٹ لینے اور چھین لینے والے کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۱۱۔ کفن چور پر بھی قطع ید نہیں۔

۱۲۔ بیت المال یا سرکاری خزانہ سے چوری پر ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ عوام کی مشترکہ ملکیت ہے۔

۱۳۔ اگر کسی مال میں چور کی شرکت ہے تو ایسے مال کی چوری پر بھی حد نہیں۔

۱۴۔ قرض دار نے اگر بقدر قرض چوری کر لی ہے تو اس پر حد نہیں۔

۱۵۔ جس نے والدین، بیٹے یا قریبی رشتہ دار کی چوری کی اس پر بھی حد نہیں۔

۱۶۔ اگر کسی نے قریبی رشتہ دار کے گھر سے کسی غیر آدمی کا مال چرا لیا۔ تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹنے چاہئیں۔

۱۷۔ مالِ غنیمت کے چور کے ہاتھ نہیں کٹیں گے۔

۱۸۔ جس نے عام یا ایسی جگہ سے جہاں آنے جانے کی لوگوں کو عام اجازت ہے۔ مثلاً ہوٹل تجارتی دکانیں وغیرہ، کوئی چیز چوری کر لی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

۱۹۔ مہمان اگر میزبان کی چوری کر لے تو اس کے ہاتھ نہیں کٹیں گے۔

۲۰۔ جس نے گھر سے چوری کی لیکن موقع پر پکڑ لیا گیا۔ تو اس پر بھی حد واجب

نہ ہوگی۔

۲۱۔ اگر چور نقب لگا کر گھر میں داخل ہوا، اور مال لیا، جسے دوسرے چور نے گھر سے باہر اس سے لے لیا تو ان دونوں پر قطع ید نہیں۔

۲۲۔ چور نے گھر کے اگر گھر سے پر مال لا دیا، اور اس کو گھر سے ہانک کر باہر لے آیا تو اس پر بھی حد عائد نہ ہوگی۔

۲۳۔ نقب لگا کر اگر کوئی چیز ہاتھ سے نکال لی تو قطع ید نہیں۔

۲۴۔ اگر کوئی آستین سے نکلی ہوئی تھیلی کاٹ لے تو اس پر بھی حد جاری نہ ہوگی۔

۲۵۔ اگر اونٹوں کی قطار سے ایک اونٹ یا اس کا بوجھ چرا لیا جائے تو بھی قطع ید نہ ہوگا۔

۲۶۔ چور اگر معاملہ کے عدالت میں جانے سے پہلے مال واپس کر دے تو اس پر قطع ید نہیں۔

۲۷۔ اگر عدالت کے فیصلہ کے بعد مالک نے چور کو مال بخش دیا تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۲۸۔ اگر چور بلا دلیل کے یہ دعویٰ کر دے کہ مال مسروقہ میرا ہے تو اس پر کوئی حد نہیں۔

۲۹۔ اگر دو آدمیوں نے چوری کا اقرار کر لیا، بعد میں ایک شخص نے کہا کہ یہ مال میرا ہے تو ان دونوں کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔[۱۳]

علامہ ابن قیم کے بیان کردہ مستثنیات: علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس سلسلے میں کچھ مستثنیات ذکر کئے ہیں:

"کھجور کے چور سے آپؐ نے قطع ید کی سزا ساقط فرما دی اور فیصلہ کیا کہ اگر اس کے منہ میں کچھ پائی جائے تو محتاج ہے، اس پر کوئی سزا نہیں ہے۔

اور جس نے ڈال سے توڑا، اس سے دوگنا تاوان لیا جائے گا، اور سزا

دی جائے گی۔

اور جس نے کھلیان سے چوری کی اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، بشرطیکہ مالیت نصاب ایک ترکش کی مالیت کے برابر ہو۔

آگے چل کر علامہ ابن قیمؒ نے اس سلسلے میں ایک بہت اہم فقہی مسئلہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

"قطع ید کے بعد چور کا علاج حکم کے ذمے ہے"

آپؐ کا یہ ارشاد کہ قطع ید کے بعد اس کا علاج کرو، بھیجو میرے پاس لاؤ، اس بات کی دلیل ہے کہ مصارفِ علاج سارق کے ذمہ نہیں، حکومت کے ذمہ ہوں گے۔

مذکورہ مستثنیات میں تین چیزیں واضح نظر آتی ہیں:

۱۔ عدم حفاظت (حرز) ۲۔ مالک کی عدم تخصیص۔

۳۔ مال عام۔

ایسی صورت میں ایک قابلِ تعزیر سماجی جرم تو ہوا ہے، لیکن اتنا نہیں کہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ خضری کا بیان ہے:

"عقوبات کے اجراء و نفاذ میں از روئے سنت احتیاط لابدی ہے جیسا کہ ترمذی میں ام المؤمنین عائشہؓ سے مروی ہے"

"جہاں تک ممکن ہو نفاذِ حد کو ٹال دو۔ امام اگر عفو میں غلطی کرتا ہے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ عقوبت میں غلطی کا مرتکب ہو[۳]"

ماخذ:

[۱] سورۂ نحل، پارہ ۱۴، آیت ۱۹۳، رکوع ۱۲۔

[۲] سورۂ شوریٰ، پارہ ۲۴، آیت ۴۱، رکوع ۴،

[۳] سورۂ بقر، پارہ ۲، آیت ۱۹۲، رکوع ۲۴۔

۴ سورۂ حدید۔ پارہ ۲۷، آیت ۲۶، رکوع ۴؛

۵ السیاسۃ الشرعیہ (علامہ عبدالوہاب خلاف) مطبوعہ مصر، ص ۷۳؛

۶ زاد المعاد سوم علامہ ابن قیم رح طبع مصر) ص ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۷۔

۷ سورۂ نور۔ پارہ ۱۸، رکوع ۱، آیت ۳۔

۸ تاریخ التشریع الاسلامی (الشیخ محمد الخضری بک) مطبوعہ مصر، ص ۹۹، ۱۰۰۔

۹ زاد المعاد سوم۔ (علامہ ابن قیم رح) طبع مصر ص ۴۹۲، ۴۹۳۔

۱۰ الاحکام السلطانیہ، ص ۲۹۸

۱۱ تاریخ التشریع الاسلامی (الشیخ محمد الخضری بک) طبع مصر، ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

۱۲ الاحکام السلطانیہ ص ۳۰۰، ۳۰۲؛

۱۳ ہدایہ اولین کتاب السرقہ، باب ما یقطع فیہ وما لا یقطع فیہ، ص ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۶۔ (ثقافت لاہور ۱۹۷۴ء)

۱۴ تاریخ تشریع اسلامی، طبع مصر ص ۱۰۲۔

(۱۳)

مثالی اسلامی حکومت

عہدِ خلافت راشدہ اور بعد از عہدِ خلافت راشدہ کے امثال و آثار

اسلامی جمہوریت میں اور دوسری جمہوریتوں میں ایک بے حد اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ان کی قانون سازی تمام تر عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ایوان بکثرتِ آرا جس بل کو پاس کر دے گا، وہ ایکٹ بن جائے گا اور کتاب الآئین میں شامل کر لیا جائے گا۔ مثلاً اگر برطانوی پارلیمنٹ یہ فیصلہ کرے کہ آئندہ سے اس کا نظام اشتراکی ہوگا تو ہر چھوٹی بڑی تبدیلی کو اس پر چھ صد ہی ثبت کر دیا ہوگی۔ امریکی جمہوریت اگر یہ فیصلہ کر دے کہ اس ولایت میں تمام قومیا لی جائیں گی تو یہ فیصلہ عمل پذیر ہو کر رہے گا۔ شورائیہ روس اگر فیصلہ کر دے کہ اس نے اشتراکیت کو خیرباد کہہ دیا اور سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت رائج کرے گی تو اس فیصلے سے کون روک سکتا ہے؟ غرض جمہوریت جمہور کی نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جو فیصلہ بھی کر دیں نافذ ہو کر رہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ برطانیہ میں رضاکارانہ اور رضامندانہ اطاعت بھی اب برہم ہو رہی ہے حالانکہ اس سے پہلے یہ اخلاقی جرم وہاں اتنا سنگین تھا کہ ایک مرتبہ ایک شہزادے پر بعض شہزادیوں سے مراسم ہونے اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں برس ہا برس اس کو اس حالت میں رہنا ہوا کہ یہ مرد ہو چکے تھے اور اس کا جرم ناقابلِ اشاعت کے باعث ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔

چند بنیادی اصول: لیکن اسلامی جمہوریت جہاں کثرتِ آراء کا احترام کرتی ہے، جمہوری نمائندوں کے افکار و خیالات کو پورا پورا وزن دیتی ہے، رائے عامہ کی وقعت میں کوتاہی نہیں کرتی، وہاں چند بنیادی اصول ایسے ہیں جو خدا کی طرف سے نافذ ہو چکے ہیں۔ اور ان اصولوں میں کسی طرح کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں جوں کا توں ماننا اور نافذ کرنا پڑے گا۔ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ ہر طرح سے آزاد اور خود مختار ہے۔ اور جو چاہے کر سکتی ہے۔ اس کا ہر فیصلہ واجب التعمیل اور قابل نفاذ ہوگا۔ اگر ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ممکن ہے وہ جمہوریت رہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت کہلانے کی سزاوار نہیں ہوگی۔

اور یہ بنیادی اصول جن کی پابندی لازمی اور ناگزیر ہے۔ نہ خلاف عقل ہیں، نہ قابل عمل، اس لیے کہ جو دین خود اپنے آپ کو آسان دین "الدین یسر" کہتا ہو، نہ کبھی خلاف عقل بات کا حکم دے سکتا ہے، نہ کوئی ایسا فرمان صادر کر سکتا ہے، جو ناقابل عمل ہو۔

کن اصولوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا؟: سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں، جن سے انحراف نہیں کیا جا سکتا؟

مختصر جواب یہ ہے کہ ہر اچھی بات کا خیر و قبول، اور ہر قسم کے منکرات و فحشاء سے احتراز و اجتناب!

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایک خالص دنیاوی جمہوریت رضاکارانہ اور رضامندانہ لوازمات کو قانونی حیثیت دے سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک دنیاوی جمہوریت اختلاط مرد و زن میں زیادہ سے زیادہ آزادی روی کا ثبوت دے سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ ایسا نہیں کر سکتی وہ عورت کا اس درجہ احترام ملحوظ رکھتی ہے کہ اسے اتنی نیچی سطح پر کبھی اور کسی حالت میں نہیں لا سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت منکرات اور فواحش کو قانون

بنا کر جائز کر سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی مجاز نہیں۔ ایک دنیاوی جمہوریت جنگ کی حالت میں تمام زرین اصولوں کو پامال کر سکتی ہے، اور جملہ انسانیت کش تدابیر فتح حاصل کرنے کے لیے عمل میں لا سکتی ہے۔ لیکن ایک اسلامی جمہوریت ایسا کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت معاہدے اور میثاق کو جب چاہے بغیر کسی معقول سبب کے محض اپنے مصالح اور مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے وقت طاق نسیان کر کے پامال کر سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عہد شکنی نہیں کر سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت جب چاہے سراسر اور صریح طور پر قوانین منظور اور نافذ کر سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جو کتاب و سنت سے متصادم ہوتا ہو، یا جس سے منکرات و فواحش کے جواز کا پہلو نکلتا ہو، یا جو اخلاق عامہ اور مصلحت عامہ کے منافی ہو۔ ایک دنیاوی جمہوریت عوام کو لوٹ بھی سکتی ہے، اور انھیں لوٹنے کی اجازت بھی دے سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ راہِ عدل سے سرِمو منحرف نہیں ہو سکتی، وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتی۔

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کی اسلامی جمہوریت پابند ہے اور ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جو خلافِ عقل ہو، یا جسے ناقابلِ عمل قرار دیا جا سکتا ہو۔

اسلامی جمہوریت کی خصوصیت: دنیاوی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے اس فرق کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اسلامی جمہوریت ہی دنیا کے دکھ کا مداوا، اور مرض کا علاج ہے۔

یہ جو آج ترقی یافتہ، متمدن، اور دولت مند ملکوں میں بے اطمینانی، اضطراب اور افتراق کی کارفرمائی نظر آ رہی ہے۔ صرف اس لیے ہے کہ انسان اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے لگا ہے، اور جس نے اسے عقل کی نعمت عطا کی ہے اسے یکسر فراموش کر چکا ہے۔

یہ جو آج دنیا میں جنگ و پیکار کا دور دورہ ہے، ہر ملک دوسرے سے خائف، سراسیمہ اور دہشت زدہ نظر آرہا ہے، اور دفورِ دہشت میں فلاح عوام سے قطع نظر کر کے سارے مادی وسائل آئندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کر رہا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسلامی جمہوریت کو، یا کم از کم اس کے اصولوں کو، اس نے قبول نہیں کیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی ہو جائے تو ساری مشکلیں چشم زدن میں آسان ہو سکتی ہیں، اور جس جنت نعیم کا وعدہ خدا نے اپنے نیک بندوں سے کر رکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ خاکدان میں بن سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کے حدود اور راہِ عمل: آئندہ سطور میں ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اسلامی جمہوریت میں جو حکومت تشکیل پذیر ہوتی ہے اس کے حدود کیا ہوتے ہیں؟ اور راہِ عمل کیا ہوتی ہے؟ بغیر اس کے ہم اپنے مقصد کو واضح نہیں کر سکیں گے۔

اسلامی حکومت کے بارے میں حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

"اسلامی حکومت میں پرہیزگاروں کا بول بالا ہوتا ہے اور فاجر حکومت میں زبان کار مزے اڑاتے ہیں، یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے۔ اور موت کا پیام بر آجاتا ہے[1]"

علیؓ مرتضیٰ کے یہ چند بول کیا اسلامی جمہوریت کے بارے میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتے؟ درحقیقت یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی جمہوریت کی عمارت قائم ہے۔

حکومت میں سب سے اہم چیز عدلیہ ہے۔ اگر کسی حکومت میں عدلیہ آزاد ہے تو اسے زوال نہیں آسکتا۔ اس کی بہت سی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کی تلافی ایوانِ عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اسلام نے اس بات پر بے حد زور دیا ہے کہ قاضی کو اپنے فیصلے میں دُور اندیش

محتاط اور آزاد ہونا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "قاضی تین طرح کے ہوں گے دو جہنم میں جائیں گے، ایک جنت میں۔ جس نے بغیر علم کے فیصلہ کیا وہ جہنمی ہے جس نے علم کے باوجود از راہِ جور غلط فیصلہ کیا، وہ دوزخی ہے۔ جس نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا، وہ جنتی ہے[۲]!"

اسی لیے قاضی کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں۔ اور بہت سے معاملات اس کی صواب دید پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

صحیح روایت میں حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے زوجین کے درمیان حکم بننے والوں سے فرمایا: "اگر تفریق مناسب سمجھو تو تفریق کرا دو، اور اگر زوجین کو اکٹھا رکھنا مناسب سمجھو تو انھیں جمع کر دو[۳]۔"

ملزموں اور مجرموں سے سلوک: ملزموں اور مجرموں کے ساتھ جو قسط رعایت کی پوری گنجائش موجود ہے۔

"حضرت علی رضؓ کے زمانۂ خلافت میں عام قیدیوں کو بیت المال سے کھانا دیا جاتا تھا ——— البتہ جو لوگ اپنے فسق و فجور کے باعث قید کیے جاتے تھے مالدار ہونے کی صورت میں ان کے مال سے ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا تھا، بہ صورتِ دیگر بیت المال سے روزینہ مقرر کر دیا جاتا تھا[۴]۔"

رفاہِ عام کے امور: اسلامی جمہوریہ، رفاہِ عام کے امور سرانجام دینے پر مجبور ہے:

امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں لکھا ہے کہ پلوں کی تعمیر، نہروں کی صفائی اور دوسرے رفاہِ عام کے کام سرکاری بیت المال کی رقم سے بخوبی کیے جاتے تھے[۵]۔

حضرت عمر رضؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں جو کارنامے انجام دیے وہ تاریخ کا ناقابلِ فراموش صفحہ بن چکے ہیں۔ انھوں نے رفاہِ عام سے متعلق بھی بہت سے

کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ آپؓ کے زمانۂ خلافت میں نہریں بھی کھودی گئیں۔

اسی ذیل میں نہر ابو موسیٰ آتی ہے۔ یہ نہر ابو موسیٰ اشعریؓ حاکم بصرہ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھدوائی تھی، اس لیے ان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نہر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عہدِ فاروقی میں عراق کے مرکزی مقام پر بصرہ کا شہر تعمیر کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کی بڑی زبردست چھاؤنی بن گیا تھا۔ اسی مقام سے اسلامی فوجیں تیار ہو کر ایران و خراسان کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوتی تھیں۔ جب اس شہر کی آبادی روز بروز بڑھتی گئی تو اس کی آبادی کے لیے پانی کی قلت ہو گئی۔ اس وقت شہر سے چھ میل کی مسافت سے پانی شہر میں لایا جاتا تھا۔ جو نہایت دقت طلب کام تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کے حکم سے ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہ نہر کھدوائی۔ یوں اہلِ بصرہ کے لیے آب رسانی کی دقت رفع ہو گئی اور گھر گھر پانی کی افراط ہو گئی۔[۵۶]

اسلامی جمہوریہ اسے بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ داد و دہش کا غلط مظاہرہ کیا جائے حضرت خالدؓ کی اسی طرح کی سخاوت کا جب حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو انھوں نے سالارِ اعلیٰ ابو عبیدہؓ کو تحریر فرمایا:

"خالد نے یہ انعام اپنی جیب سے دیا تو فضول خرچی کی، اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔"[۵۷]

اجتہاد: اسلامی جمہوریت کی خصوصیت: اسلامی جمہوریت کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب اپنے پیروؤں اور ماننے والوں سے سب سے پہلے جو چیز چھینتے ہیں وہ ہے تدبر فکر و نظر۔ ہے نصرانیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت ہندو دھرم، ان سب کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح روشن ہو جائے گی کہ ان مذاہب میں تحقیق اور اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قدم قدم پر تفکر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ جو بار بار اپنے ماننے والوں یعنی مسلمانوں اور کافروں کو اس پر ابھارتا ہے کہ جو راستہ اختیار کریں سوچ

سمجھ کر اختیار کریں، جس عقیدہ کو اپنائیں اسے اچھی طرح چھان پھٹک لیں، جس نظامِ دین کی پیروی اختیار کریں۔ اسے پورے طور پر جان لیں وہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر پہرہ نہیں لگاتا۔ انھیں موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے کام لیں اپنے دماغ کی راہ نمائی میں رد و کد کریں۔

اجتہاد — اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا فرمایا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایسی قوم بنا دیا جس نے مختصر ترین عرصہ میں دنیا پر اپنی سلطانی کا سکہ جما لیا، اور یہی وہ چیز ہے جسے چھوڑنے کے بعد ادبار و انحطاط کے گڑھے میں گر گئے، جب تک ان کی قوتِ اجتہاد قائم رہی وہ "خیر الامم" رہے۔ جس دن اس قوت سے محروم ہو گئے، کچھ بھی نہ رہے۔

تاریخ ادیان کا اہم واقعہ: اجتہاد کو جس منظم طریقے پر مسلمانوں نے اپنایا وہ تاریخ ادیان کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اجتہاد ہی کی ایک صورت مصلحت مرسلہ ہے۔

مصلحت مرسلہ کی تعریف کیا ہے؟

عام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مصلحتِ مرسلہ سے مراد یہ ہے کہ وہ مصلحت جو شارع علیہ السلام کے زمانہ میں نہ درپیش آئی ہو اور جس کے منفی یا مثبت پہلو سے متعلق کوئی واضح حکم پہلے سے نہ موجود ہو۔

ایسے مواقع پر خود صحابہ کرام نے بھی حالات کے مطابق نئے نئے احکام وضع کیے: مثلاً قرآن شریف کا ضبطِ تحریر میں لانا، یا حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی خلافت کے لیے ان کا نام پیش کرنا، یا دفاتر کا قائم کرنا، یا سکہ کا ڈھالنا یا جیل خانوں کا بنانا، یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو نئے حالات میں نئے احکامات کے تحت عمل میں آئیں جن کی نظیر عہدِ شارع میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ سب چیزیں مصلحتِ مطلقہ کے ماتحت عالمِ وجود میں آئیں۔

اصولِ شہادت: شرع نے اصولِ شہادت میں بڑی سختی ملحوظ رکھی ہے۔ روایت کے اصول میں بھی اتنی سختی نہیں ہے۔ شہادت کے اہم شروط میں سے یہ بھی ہے کہ شہادت

دینے والے آزاد ہوں - ان کی تعداد بھی معین کر دی گئی ہے - مثلاً زنا کی شہادت چار آدمیوں سے کم کی مقبول نہیں ہے - اور قتل کی گواہی کے لیے دو آدمی کافی ہیں -

اگرچہ خون کا معاملہ بے حد اہم ہے لیکن زنا کے بارے میں گواہوں کی تعداد جو زیادہ رکھی گئی ہے وہ اس لیے کہ مقصود جرم کا افشا نہیں بلکہ عیب پوشی ہے[۸]!

اجتہاد کی چند مثالیں :

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے ثابت ہے کہ انھوں نے ایک شرابی پر جس نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی حد جاری کی اور طلاق تسلیم نہیں کی[۹]

اسی طرح : حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص نے ماہ صیام میں شراب پی لی - اسے اسی تازیانوں کے بجائے سو تازیانوں کی سزا دی - کیونکہ اس نے شراب بھی پی اور رمضان کی بے حرمتی بھی کی[۱۰]

رائے عامہ کا احترام : اسلامی جمہوریت میں رائے عامہ کا احترام کس درجہ ملحوظ رہتا ہے ؟ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوگا :

حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن ابی سرح سے وعدہ کیا تھا کہ فتح افریقہ کے بعد مال غنیمت کا پانچواں حصہ انھیں بطور انعام دیا جائے گا - چنانچہ بعد فتح عبداللہ نے پانچواں حصہ لے لیا - مگر عام مسلمانوں کو یہ بات پسند نہ آئی - انھوں نے احتجاج کیا - حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن ابی سرح سے یہ رقم بیت المال میں واپس کرا دی - اور فرمایا : "اگر میں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن مسلمان نہیں مانتے تھے"

اسلام کے اصولوں میں جمود نہیں ہے - مقتضیات زمانہ کے مطابق انھیں روبہ عمل کیا جا سکتا ہے - درحقیقت یہ چیز بھی اجتہاد ہی کے ذیل میں آتی ہے - اس لیے کہ نئی چیزیں اسی صورت میں قبول کی جا سکتی اور رکھی جا سکتی ہیں کہ وہ اسلام کی روح اور اصولوں سے متصادم نہ ہوں -

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے کوئی نمونہ ہے یا نہیں ؟

عابد بن یحییٰ حارث بن فضل سے روایت کرتے ہیں کہ عمرؓ نے مسلمانوں سے دفاتر قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپؓ ہر سال کی آمدنی صرف کر دیا کریں، بچایا نہ کریں۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ اب مال کی کثرت ہو گئی ہے، اگر یہ پتہ نہ چلے کہ کس نے لیا اور کس نے نہیں لیا تو بہت دقت اور پریشانی کا سامنا ہوگا۔

خالدؓ بن ولید نے کہا: "میں نے شام کے بادشاہوں کو دیکھا ہے کہ دفاتر کا قیام اور عساکر کی تنظیم کرتے ہیں۔ آپؓ بھی ایسا ہی کیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے ان کی بات مان لی اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل، جبیر بن مطعم قریش کے نوجوانوں کو بلا کر حکم دیا کہ لوگوں کے نام مراتب کے لحاظ سے لکھو، انھوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے۔ ان کے بعد ابوبکرؓ اور ان کی قوم کے نام لکھے، پھر حضرت عمرؓ اور ان کی قوم کے نام لکھے گویا خلافت کی ترتیب کا اعتبار کیا۔ اور حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے۔ آپؓ نے دیکھ کر فرمایا: یہ ٹھیک نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے اعتبار سے لکھو۔ جو جس قدر آپؐ سے قریب ہو۔ اسی قدر مقدم ہوا۔ اور عمرؓ کو اس مرتبہ پر لکھو جس پر اس کو اللہ نے رکھا ہے۔[۱۲]

دفاتر کا نظام اور حضرت عمرؓ: اس سلسلے میں ایک اور روایت ذرا وضاحت کے ساتھ: حضرت عمرؓ نے ایک ایرانی سردار کے مشورے سے دفاتر کا نظام جاری کیا۔ اسلامی فتوحات پے در پے ہو رہی تھیں، دولت ہر طرف ایرانی خزانوں سے لبریز ہو گئی تھی، حضرت عمرؓ اس مال کو مسلمانوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے دفاتر کی تدوین کی۔ وظائف مقرر کیے، ہر مسلمان کے وظیفہ میں اس کے سبقت فی الدین اور غزوات میں نصرت رسول کا خیال رکھا گیا، دفاتر میں اس غرض کے لیے عملہ کلرک رکھے گئے، انھوں نے لوگوں کے مختلف طبقات کی فہرست تیار کی۔ ہر فہرست حضرت عباسؓ نے

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بعد بنی ہاشم تھے۔ پھر اور لوگوں کے اسماء تھے یہی صورت حال ان کی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں جنھوں نے اپنے دور میں قابل ذکر تبدیلیاں نہ کیں قائم رہیں۔

"دیوان" ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی "سرکاری کاغذات" یا دفتر کے ہیں۔ لیکن دیوان کا اطلاق مجازاً اس جگہ پر کیا جانے لگا۔ جہاں یہ دیوان محفوظ رکھے جاتے۔

ماوردی کی تصریحات: ماوردی نے لکھا ہے: "حقوق سلطنت سے متعلق اعمال و احوال اور ان کو سرانجام دینے والے جیوش و عمال کی تفصیلات کے اندراج کو محفوظ رکھنے کے لیے دیوان کی ضرورت پڑی"۔

جہشیاری نے حضرت عمرؓ کے تدوین (دواوین) دفاتر کے سبب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عربوں میں حضرت عمرؓ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اسلامی حکومت میں دواوین (دفاتر) کا نظام داخل کیا"۔

اسلامی جمہوریہ کا سیکرٹریٹ آستانۂ عدل اور مرکزِ حکومت مسجد تھی۔

سر ٹامس آرنلڈ نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مسجد کا تعلق اس حیثیت سے کہ وہ عبادت کی جگہ ہے (یعنی وہ مقام ہے جہاں خلیفہ یا والی نماز میں لوگوں کی امامت کرتا ہے) دولت کے سیاسی و اجتماعی مسائل کے نظم و ضبط سے کیا رہا ہے اور کس طرح خلیفہ یا والی کی ذات کے اندر ایک طرف نماز میں مسلمانوں کی امامت اور دوسری طرف دولت یا ولایت (حکومت) کا اہتمام و انصرام دونوں حیثیتیں جمع ہوتی ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"مسجد محض عبادت کی جگہ ہی نہ تھی بلکہ وہ سیاسی و اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں سفراء کا استقبال کرتے اور وہیں بیٹھ کر مہمات دولت کا انتظام و انصرام فرماتے اور منبر پر سیاسی و دینی مسائل کے متعلق

مسلمانوں کو خطاب کرتے، حضرت عمرؓ نے مدینہ کے منبر پر کھڑے ہو کر عراق میں مسلمان فوجیوں کی پسپائی کا اعلان کیا، اور اپنی قوم کو اس ملک کی طرف چل پڑنے کی ترغیب دی، حضرت عثمانؓ نے بھی اسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنی مدافعت کی، اسی طرح ہر خلیفہ اپنی تخت نشینی کے وقت اسی منبر پر جمہور کے سامنے اپنا وہ پہلا خطبہ دیتا جو بمنزلہ حکومت کی پالیسی کا اعلان ہوتا تھا۔

رائے عامہ کے احترام کے سلسلے میں ایک اور واقعہ گورنر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے متعلق:

"مسلمانوں کی ایک جماعت شکایت لے کر مدینہ منورہ آئی، حضرت عثمانؓ پر پہنچی اور ان کی معزولی کا مطالبہ کیا، حضرت عثمانؓ نے انھیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو نامزد کیا۔"

عہد بہ عہد کے مجتہدات: ایک نئی چیز یعنی "دیوان" وغیرہ قائم کرنے سے متعلق عہد بہ عہد کے مزید مجتہدات و تعدیلات:

"اس دیوان کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو عراق کے والی زیاد بن ابیہ کے پاس خط دے کر بھیجا کہ ان شخص کو ایک لاکھ درہم عطا کیے جائیں، اس شخص نے راستہ میں اس مکتوب کو پڑھ لیا — اس زمانہ تک ہی مہر کے فرامین مختوم نہ ہوتے تھے — اور ایک لاکھ کو دو لاکھ کر دیا۔ جب زیاد نے حضرت معاویہؓ کو خرچ کا حساب پیش کیا تو انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ میں نے صرف ایک لاکھ کے لیے لکھا تھا، اس کے بعد اس شخص کو بلا کر ایک درہم جو اس نے زائد لیے تھے، واپس لیے، اور دیوان الخاتم کا نظام جاری کیا۔ تمام فرامین مختوم کرنے کے لیے صادر ہونے لگے، نہ کسی شخص کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ فرمان میں کیا لکھا ہے اور نہ کوئی اس میں کسی قسم کا تغیر پیدا کر سکتا تھا۔"

عبدالملک بن مروان (۶۵ — ۸۶ھ) کے عہد میں دواوین کے نظام

میں ترقی ہوئی۔ اس کی سیاست و دواوین میں یونانی و فارسی دونوں زبانوں کے رائج رکھنے پر مشتمل تھی۔ اسی طرح رومی سکہ کے ختم کرنے کا اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ مہم اس وقت خاص طور پر رائج ہو گیا۔ جب اس کے اور قسطنطین رابع اور بستینان ثانی کے درمیان عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کے اوائل عہد میں دمشق و شام میں یونانی زبان میں اور ایران میں فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اس نے عربی زبان میں لکھنے کا حکم جاری کیا۔

عبدالملک ہر ہفتہ شاہنشاہ روم کو ایک ہزار دینار دیا کرتا تھا۔ اب عبدالملک نے اجنبی سکوں کے بجائے عربی سکوں کے ڈھالنے کا انتظام کیا دمشق میں سکوں کی ڈھلائی کے لیے ایک مکمل گھر بنوایا۔ جمیع اطراف دولت میں مستعمل سکوں کے رواج کو بند کرنے کا حکم جاری کیا۔ اور ان کے بجائے سونے اور چاندی کے جدید سکوں کو جن پر آیات قرآنیہ نقش تھیں، رائج کیا۔

دیوان الزمام: جو زمانے کے آڈٹ آفس کے مشابہ تھا۔ صیغہ ہائے نظم و نسق کا سب سے اہم شعبہ تھا جسے خلیفہ اول نے روشناس کیا تھا۔

حضرت عمر بن الخطاب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فوج کو ایک مخصوص صیغہ میں منتقل کیا اور ان کے نظم و نسق کے لیے ایک محکمہ "دیوان الجند" کے نام سے قائم کیا۔ جس میں سپاہیوں کے نام، اوصاف، ان کے وظائف کی مقدار اور ان کے اعمال و فرائض کی تفصیلات کا اندراج ہوتا تھا۔

عبدالملک نے جبری زچی بھرتی کا انتظام جاری کیا۔

دولت عباسیہ کے اوائل عہد بالخصوص منصور کے دورِ حکومت میں حربی مسائل پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ "عرض جیش" (فوجوں کی معائنہ) کو عسکری تربیت کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ منصور کو یہ امر بہت ہی محبوب تھا کہ "خود" پہنے اور اپنے تخت پر بیٹھ کر فوجوں کا معائنہ کرے چنانچہ اس کے سامنے فوج کی صف بندی تین قسموں میں ہوا کرتی تھی۔

بحر روم کی گودیوں کے پاس بسنے والی قوموں پر یورپ کی دوسری قوموں سے زیادہ گہرا اثر غزلوں پر پڑا۔

فان کریمر لکھتے ہیں: "قدیم عربی بیڑا، مسیحی دنیا کے بیڑوں کے لیے تھا۔ بہت سی عربی بحری اصطلاحات، جنوبی یورپ میں تجارتی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ مثلاً:

Canal عربی لفظ "حبل"۔ [illegible] طالوی زبان میں [illegible] "عربی لفظ "دار الصناعۃ" سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح "[illegible] Corvette عربی لفظ "غراب" اور "[illegible] "عربی لفظ "امیر البحر" سے لیے گئے ہیں"[۱۷]

"جدید" کو قبول کرنے میں تامل نہ تھا: جدید کو قبول کرنے، ترقی سے بہرہ ور ہونے اور ایجاد و اختراع سے مستفید ہونے کا سلسلہ برابر جاری رہا:

"بسا اوقات سلاطین یا امراء اپنے اور صاحب البرید کے درمیان خفیہ اشارات مقرر کر لیتے تھے۔ صاحب البرید کا خط اگر ان اشارات کا حامل نہ ہوتا تو گو وہ خود صاحب البرید کے ہاتھ کا لکھا ہوتا، اور اس پر اس کی مہر بھی ثبت ہوتی لیکن وہ اس کو قابلِ اعتماد نہ سمجھتے، اس لیے کہ صاحب البرید کبھی اپنی مرضی کے خلاف ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

مثلاً ابو مسلم خراسانی کو خراسان سے جب منصور نے بغداد بلایا تو ابو مسلم کھٹکا۔ اس نے ابو نصر مالک بن الہیثم کو اپنے لشکر پر اپنا جانشین بنایا اور اس کو یہ ہدایت دی کہ جب تک میرا خط تمہارے پاس نہ آجائے تم اس وقت تک یہاں قیام کرو۔ اگر خط پر نصف مہر لگی ہو تو سمجھنا کہ یہ مہر میں نے لگائی ہے اور اگر پوری لگی ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ مہر میں نے ثبت نہیں کی ہے۔ ابو مسلم جب مدائن پہنچا تو منصور نے اسے قتل کرا دیا اور اس کے بعد ابو مسلم خراسانی کی طرف سے ابو نصر کو اس مضمون کا خط لکھا کہ ابو مسلم جو کچھ مال و اسباب وہاں چھوڑ آیا ہے

اسے یہاں بھیج دو۔ خط پر ابو مسلم کی مہر لگا دی۔ ابو نصر نے جب دیکھا کہ مہر پوری لگی ہوئی ہے تو سمجھ گیا کہ ابو مسلم نے نہیں لکھا ہے[۱۸]۔

پولیس کی تنظیم: حضرت علی رضؓ بن ابی طالب کے عہد میں پولیس کی تنظیم کی گئی، اور اس کے افسر اعلیٰ کو صاحب الشرطہ کا نام دیا گیا۔ صاحب شرطہ کا انتخاب قوم کے معزز اور صاحب عصبیت، صاحب قوت افراد سے ہوتا، تاکہ اس زمانہ کے محافظ (Governor) کا ہم پلہ تھا۔ اس لیے کہ صاحب شرطہ اس منتظمہ جمعیت کے افسر اعلیٰ کو کہا جاتا تھا، جو قیام امن، حفظ نظام، اور مجرموں اور فتنہ پردازوں کی دار و گیر، میں والی کی اعانت کرتی تھی، ابتداء میں پولیس محکمہ قضا کے ماتحت تھی۔ عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کراتی، اور صاحب الشرطہ اقامت حدود کا ذمہ دار ہوتا، لیکن بعد کو یہ دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے اور صاحب الشرطہ کو جرائم پیشگی کے مقدمات خود دیکھنے کے کامل اختیارات ملے۔ ابتداء میں صاحب الشرطہ کے احکام ہر طبقہ کے آدمیوں پر جاری نہیں ہوتے تھے۔ صرف عوام الناس جان چھن کے مشکوک افراد، اغنیاء، اور مجرمین پر اختیارات حاصل تھے۔ لیکن بعد کو دولت بنی امیہ کے دور میں اس منصب کی عزت بڑھی اور شرطہ کبریٰ (پولیس اکبر) و شرطہ صغریٰ (پولیس اصغر) کے نام سے دو شعبوں میں اسے تقسیم کر دیا گیا۔ پولیس اکبر کے زیر اقتدار عوام و خواص دونوں تھے۔ یہ شاہی عہدیداروں کے خلاف کارروائیاں کرتی اور ارتکاب جرم پر ان کو، ان کے افراد کو اور ان کے علاوہ دوسرے ذی جاہ و عظمت افراد کو سزائیں دے سکتی تھی، لیکن پولیس اصغر کا تعلق صرف عوام الناس کے ساتھ مخصوص تھا۔

پولیس اکبر کا افسر اعلیٰ سلطانی محل کے دروازے پر کرسی لگا کر بیٹھتا، اور محکمہ کے دیگر افسران اس کے سامنے بیٹھتے۔ یہ اپنی جگہوں سے اسی وقت ہل سکتے تھے جب یہ ان کے سپرد کوئی کام کرتا۔ اکابر دولت میں کسی کو یہ عہدہ

بننے کے یہ معنی تھے کہ وزارت اور حجابت کے مناصب کی امیدواری کا حق اس کو حاصل ہو گیا[۱۹]

وصولی خراج : وصولی خراج کا نظم و نسق خلفاء خود اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اس مقصد کی خاطر ایک نظام جاری کیا۔ جو نظام مقاسمہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ والی کی تولیت سے پہلے ان کی دولت و ثروت کی ایک مکمل فہرست تیار کی جاتی تھی۔ جب وہ اپنی خدمات سے سبکدوش ہوتے تھے تو اموال کا نصف ان سے لے لیا جاتا تھا۔ جو ان کی تنخواہ کی آمدنی سے زائد اپنے زمانہ امارت میں ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے[۲۰] چنانچہ حضرت معاویہؓ نے عہد خلافت میں دولت جمع کی تھی، اس کا نصف اس نظام کے تحت انھیں بیت المال میں داخل کرنا پڑا، تاکہ بقیہ مال ان کے لیے حلال ہو جائے[۲۱]

حضرت عمرؓ کا نظام حکومت :

حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی دولت کو نصف نصف تقسیم کر لیا تھا۔

بلاذری کی تصریحات : بلاذری نے لکھا ہے : "حضرت عمرؓ اپنے عمال کو جب حاکم بنا کر بھیجتے تو ان کے اموال کی ایک فہرست تیار کر لیتے پھر بعد کو اس سے زیادہ جو کچھ ان کے پاس نکلتا، اسے نصف نصف تقسیم کر لیتے۔ اور ایسا اوقات سب کا سب ان سے چھین لیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے عمروؓ بن العاص کے نام ایک مرتبہ یہ تحریر بھیجی :

"تم نے مسلمانوں کے مال و متاع، غلاموں، برتنوں اور جانوروں کے اسرار منکشف ہو چکے ہیں جس وقت تم مصر کے والی بنائے گئے تھے اس وقت یہ چیزیں تمہارے پاس نہ تھیں۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب میں لکھا:

"ہمارا یہ ملک زراعت و تجارت کا ملک ہے، اس لیے یہاں ہماری ضرورت سے زیادہ ملتا ہے۔"

اس پر حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ مجھے عمال سوء کے متعلق شکایت زیادہ معلوم ہو چکا ہے۔ میرے نام تمہارا خط اس شخص کے خط کا منہ ہے جو خود بالحق پر مطمئن نہیں ہوتا۔ میری رائے تمہارے متعلق اچھی نہیں رہی ہے۔ میں تمہارے پاس محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں۔ تاکہ وہ تمہارے مال و دولت کی نصف نصف کر لیں۔ تم ان کو صحیح صحیح باتیں بتا دو، جو کچھ وہ تم سے طلب کریں، ان کے سامنے رکھ دو، اور اگر وہ تم پر کچھ سختی کریں تو برداشت کرو کہ اب رائے ظاہر ہو چکی ہے!

چنانچہ محمد بن مسلمہ نے حضرت عمروؓ بن العاص کے مال و متاع کا نصف نصف تقسیم کر لیا۔

ٹیکس اور زکوٰۃ کی جداگانہ حیثیت: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت عوام سے زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد کوئی ٹیکس نہیں وصول کر سکتی۔ یہ غلط خیال ہے۔ زکوٰۃ گو ٹیکس ہے تو صرف خدا کے لیے ہے۔ جن کے مصارف متعین ہیں۔ ان مصارف کے علاوہ کسی اور مد پر اسے خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حکومت کو استوار کرنے، فلاحی امور سرانجام دینے اور معاشرے کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت کو جو مصارف کرنا پڑتے ہیں۔ ان کے لیے نظر و اجتہاد سے اسباب و ذرائع حاصل کر سکتی ہے۔ اور اس کا یہ اقدام قطعاً خلاف شریعت نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے۔"[۲۲]

یہ ارشاد اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ حکومت حالات و

مقتضیات کے مطابق ٹیکس لگا سکتی ہے!

حضرت ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضؓ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ہدایات دیتے وقت ان سے فرمایا:

"وہاں کے لوگوں کو اس امر کی طرف دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں، اور میں (یعنی محمدؐ) خدا کا رسول ہوں۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں۔ پھر انھیں یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے، اگر وہ اسے بھی مان لیں، پھر انھیں یہ بتانا کہ خداوند تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا، اور ان کے غریبوں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔"[۲۴]

ہنگامی حالات میں چندہ: زکوٰۃ اور ٹیکس کے علاوہ حکومت اسلامی ضرورت کے وقت بھی چندہ وصول کر سکتی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال موجود ہے کہ ۹ھ میں جب قیصر روم کے حملے کی افواہیں پھیلیں تو آپؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ سامان جنگ کی تیاری کے لیے روپیہ دیں۔ سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس میں حضرت عثمان رضؓ اور حضرت ابوبکر رضؓ پیش پیش تھے ایک دولت مند تھا، اس نے تھیلیوں کا منہ کھول دیا۔ دوسرا بوریہ فقیر کا تاجدار تھا۔ اس نے گھر کی ساری پونجی لا کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ڈال دی۔ اور اہل و عیال کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ دیا۔

ٹیکس کی ایک اور صورت:

قاضی ابو یوسف رحؒ اپنی کتاب "الخراج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"عاصم بن سلیمان حسن رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری رضؓ نے عمر رضؓ بن الخطاب کو نوشتہ لکھا کہ جو مسلمان تاجر ارض حرب میں جاتے ہیں ان سے عشر وصول کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے لکھا جس طرح وہ مسلمان تاجر

سے عشر وصول کرتے ہیں، تم ان کے تاجروں سے وصول کرو، ذمیوں سے نصف عشر لو، اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم، دو سو سے کم پر کچھ نہ لو اور اگر دو سو ہوں تو پانچ درہم، زیادہ ہوں تو اسی حساب سے۔"

درآمد برآمد پر ٹیکس: حضرت عمرؓ کے وقت سے اسلامی حکومتوں میں یہی دستور نافذ ہو گیا اور درآمد برآمد پر ٹیکس لگ گیا۔ "تاجر اگر مسلمان ہے تو اس سے عشر کا چوتھائی لیا جائے گا جو گویا زکوٰۃ کے معیار کے مطابق ہے۔ اور اگر تاجر ذمی ہے تو اس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ اور اگر حربی ہے تو اس سے وہی سلوک کیا جائے گا، جو اس کی قوم مسلمان تاجروں کے ساتھ کرتی ہے۔ اور اگر مسلمان سے عشر لیتے ہیں تو ان سے بھی عشر لیا جائے گا۔ اور اگر وہ عشر کا چوتھائی لیتے ہیں تو اسلامی حکومت بھی یہی لے گی۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ لوگ مسلمانوں سے کیا لیتے ہیں تو اسلامی حکومت نصف عشر لے گی۔"[۲۶]

اسلامی حکومت میں ہر چیز پر مقدم جو چیز ہے وہ فلاح عوام ہے اور فلاح کو صحیح طور پر ہونے کو دلانے کے لیے احتساب اور مؤاخذہ کا سلسلہ قائم کیا گیا تاکہ عوام سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ بسا اوقات ضرورتیں اور دباؤ سے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حکومتیں اسلام کا پرچم دبانے کے باوجود کیسی کیسی ہوئیں۔ انھوں نے اس چیز کو کبھی بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

خلافت حکومت اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی اس نے بہت سے معاملات میں اپنی شان کو قائم رکھا، اور فلاح عوام کو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ نظام احتساب و مواخذہ کو بہت زیادہ منظم طور پر پہلی مرتبہ اسی حکومت نے قائم کیا اور اس کے خوش گوار

نتائج بھی نظر کے سامنے آئے اور لوگوں کو بہت سی زحمتوں اور پریشانیوں سے نجات مل گئی۔

فاطمیوں نے بہت سی اصلاحات رائج کیں۔ ہم صرف چند ایک کا ذکر کریں گے۔

عدالت ازالہ شکایات حکام: بہت ہی اہم اور نتائج کے اعتبار سے دُور رس اصلاح یہ کی گئی کہ ایسی عدالت بہ عہدہ منزلہ حکم کی گئی جس میں کہ والیوں اور عہدہ داروں کے خلاف شکایات کی سماعت ہوتی تھی۔ ایسی شکایات کا ازالہ معمولی عدالتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ اس عدالت کا فیصلہ ہوتے تھے اس کا فیصلہ خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا تھا اور اس کی منظوری کے بعد وہ صادر کیا جاتا تھا۔[۲۷]

دوسری اہم اصلاح یہ تھی کہ:

"جانب داری کو روکنے کے لیے ہر ملکی عہدے پر ایک اجنبی کے ساتھ ایک مقامی بھی شریک کیا گیا۔"[۲۸]

انتخاب اور عہدہ: انتخاب و انتخابیہ کا ذکر ہم اس عہد میں زیادہ واضح پاتے ہیں:

"منصب حکام شرع کی پابندی پر نظر رکھتے تھے۔ ازاریوں کے حکام کو دارالعدل کہتے تھے۔ ان کے ذمے ان تمام باتوں کا محاسبہ کرنا تھا جو سے نظام آمد و رفت میں خلل پیدا ہوتا ہو۔ فرض ادا کرتا تھا۔ ذرائع آمد و خرچ کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ کسی علاقے کی آمد و خرچ کا حساب رکھتا تھا۔"

اس آخری میں وہ کاندلوں کو نقابت دیتے تھے جو ان کے ذمے ہوں اور پیمانوں کا مطالبہ کرتا۔ دیکھ بھال کے بعد اگر ان میں کوئی نقص ہوتا تو بیت مال وغیرہ ضبط کر لیے جاتے تھے۔ اور دکانداروں کو حکم دیا جاتا کہ وہ صحیح

باٹ اور پیمانے خرید لیں یا انھیں درست کر لیں، یہ آفس فاطمیہ، ایوبیہ دونوں کے پورے دور میں قائم رہا۔[۳۰]

حضرت عمرؓ بن الخطاب وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے احتساب کی بنیاد رکھی۔ آپؓ نے محتسب کو فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا کہ وہ ایک شخص کو روکتے اور یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتے: "تم نے اپنے اونٹ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لاد دیا ہے۔"

محتسب کی تعریف مختصر طور پر یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا اور آداب کا محافظ اور فضیلت و امانت کا پاسبان ہوتا ہے۔

فاطمیوں کے عہد میں احتساب کے نظام نے ترقی کی۔ محتسب کے کئی نائب ہوتے تھے جو بازاروں میں پھرتے، گوشت، ہانڈیوں اور باورچیوں کے پکانے کے طریقوں کی تفتیش اور دیکھ بھال کرتے، جانوروں کے مالکوں کو جانوروں پر سب سے زیادہ وزن لادنے سے روکتے، مستحقین کو مستحقین کے ٹھہرانے رکھنے اور آداب عامہ کے خلاف پائجاموں کے پہننے کی تاکید کرتے، اور معلموں کو چھوٹے بچوں کو بے دردی سے مارنے سے روکتے تھے۔ محتسب لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی عدالت کے اجلاس بازار عمر اور جامع زہر میں کیا کرتا تھا۔ اس کے اختیارات اس حد تک وسیع ہو گئے تھے کہ اس نے ایوبیوں کے آدمیوں کو اپنے احکام کی تنفیذ کا فریضہ انجام دینے پر مجبور کیا۔[۳۱]

آج بہت سی چیزیں عام ہیں اور ان میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی۔ لیکن آج سے بارہ سو برس پہلے یہ کیفیت نہیں تھی۔ اس وقت سرے سے کوئی باقاعدہ نظام عدالت ہی نہیں تھا، اور جو تھا وہ بہت سے قانونی اور آئینی سقم اپنے اندر رکھتا تھا۔ لیکن اسلام کے نمودار ہونے کے بعد جو اسلامی

حکومت قائم ہوئی۔ اس نے ان اسباب کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ اور نئی نئی صورتیں اقتضائے انصاف کو بروئے کار لانے کی پیدا کیں۔ انہی میں ٹریبونل کا قیام اور قاضی کے حدود ذاتی کی توضیح بھی ہے۔

ٹریبونل: فریقین کے معین مقدمہ کو فیصلہ کرنے کے لیے ایک قاضی کا تقرر ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں کسی اور مقدمے کو لینے کا جواز نہ ہوگا جب تک یہ معین مقدمہ فریقین میں چلتا رہے گا، اس وقت تک اس کی حکومت باقی رہے گی، اور فیصلہ کرنے کے بعد حکومت زائل ہو جائے گی۔ پھر ان فریقین میں کوئی دوسرا مقدمہ چلے تو اس کا تعرفہ جدید اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔

قاضی کے حدود ذاتی کی توضیح:

تصفیہ مقدمات کو تعویق میں ڈالنا، قاضی کے لیے جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی اوقات استراحت کے علاوہ اپنے دروازہ پر حاجب اور دربان کا مقرر کرنا جائز نہیں۔ اپنے والدین یا اولاد کے حق میں جمانہت ہونے کی وجہ سے فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ ہاں ان کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ بدگمانی کا احتمال نہیں۔ اسی طرح ان کے حق میں شہادت نہیں دے سکتا مگر خلاف دے سکتا ہے۔ اپنے دشمن کے موافق شہادت دے سکتا ہے خلاف نہیں دے سکتا۔ اور اس کے موافق فیصلہ کر سکتا ہے مگر خلاف نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ حکم کے اسباب اگرچہ ظاہر ہیں مگر شہادت کے اسباب خفی ہیں۔ لہٰذا شہادت کی بدگمانی حکم کی طرف متوجہ ہو جانے کی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی امیدواری جائز ہے یا ناجائز؟: یہ مسئلہ بھی بعض حلقوں میں گشت کرتا رہتا ہے کہ اسلام میں کوئی شخص بطور خود خلافت یا امامت کا امیدوار نہیں بن سکتا، حالانکہ یہ دعویٰ اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اگر ایک شخص پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے تئیں خلیفہ کی حیثیت سے ملک و ملت کی خدمت کرنے کا اہل پاتا ہے تو آخر کیا سبب ہے کہ وہ امیدوار کی حیثیت سے منظرِ عام پر نہ آئے؟ کم از کم اسلام اس سے منع نہیں کرتا اور ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں دور کی نہیں۔ صدرِ اوّل کی مثالیں پیش کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار نے اپنی خدماتِ جلیلہ کے باعث اپنا امیدوار اس منصب کے لیے پیش کیا، اور صاف الفاظ میں ترغیب دی کہ:

"اللہ نے اپنے نبیؐ کو جب اپنے حضور میں واپس بلایا تو وہ تم سے ناراض نہ تھے، اور تم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، قبل اس کے کہ دوسرے ان کی نیابت کے لیے آگے بڑھیں، تم یہ چیز اپنے لیے یہ چیز خاص کر لو، کہ تم دوسروں کی نسبت اس منصب کے زیادہ اہل ہو[۳۰]!"

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"خلفائے راشدین کے طریقۂ انتخاب کی اگرچہ کوئی منظم شکل نہ تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی بیعت میں شوریٰ کا وہ عنصر تھا جو موروثی نظام سے ہر طرح دور اور پورے طور پر عربی روح کے موافق تھا۔

بیعت اور نقضِ بیعت: اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ڈائرکٹ (حضرت ابوبکرؓ) کے انتخاب میں کوئی ایسی صورت نہ تھی جس سے یہ ثابت ہو کہ امیدوار انتخاب کے لیے نامزد کیے جا سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انصار نے سعدؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے ابوعبیدہؓ اور حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی عجلت کی، جو انہیں نے ان کو ساتھ دیا، اور پھر دوسرے (ان) عامۃ المسلمین نے اس بیعت کی تصدیق کر دی[۳۱]۔

صرف تصدیق ہی نہیں کی، بلکہ امیدواری پر کوئی تعقید بھی نہیں کی، بلکہ مفاہمت کر کے انصار کو دستبردار ہو جانے پر آمادہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"مہاجرین اولین کے بعد ہمارے نزدیک تم ہی قدر و منزلت کے حامل ہو پس ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر۔ تمہارے مشورے کے بغیر ہم کوئی کام نہیں کریں گے"

پھر حضرت علی رضؓ کے دور میں جب حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے نقض بیعت کی تو حضرت علی رضؓ نے ان سے جواب طلب کیا:

"طلحہؓ نے نقض بیعت کا سبب یہ بتایا کہ وہ "جبری" تھی؟ اور زبیرؓ نے فرمایا کہ ہم آپ کو اپنے سے زیادہ مستحق زیادہ نہیں خیال کرتے تھے"

دونوں حضرات کے دعوے کی صحت یا عدم صحت پر گفتگو مقصود نہیں۔ لیکن اس بیان سے جو بات ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ:

۱۔ جبری بیعت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

۲۔ خلافت کی امیدواری میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت علی رضؓ کا ایک خطبہ بھی اس سلسلے میں قابلِ غور ہے:

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خلافت کا ہر شخص کے مقابلہ میں زیادہ مستحق اور سزاوار تر ہوں، پھر بھی ایثار سے کام لوں گا۔ اور اس وقت تک اس بیعت کو تسلیم کرتا رہوں گا جب تک امورِ مسلمین روبراہ رہیں گے"[۳۷]

اس سے ایک تیسری بات معلوم ہوتی کہ رضا مندانہ بیعت بھی اس وقت ختم کی جا سکتی ہے، اگر "امورِ مسلمین" روبراہ نہ ہوں۔

امیدواری کے بارے میں ماوردی کا فیصلہ: ماوردی نے تو امیدواری کے بارے میں بڑا واضح فیصلہ کر دیا ہے:

"جمہور علماء امامت کو انعقاد امامت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ"[۳۸]

یہ تاریخ کا عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے جب دوسروں کو چھوڑ کر اپنوں کی گردنیں کاٹنا شروع کیں تب بھی کسی غیر مسلم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ جن لوگوں کو امتِ مسلمہ کا سفاک ترین انسان قرار دیا جا سکتا ہے اُن کی سفاکی بھی صرف اپنوں تک ہی محدود رہی۔ غیر مسلموں کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اب دنیا میں ایک نئے سکے کا چلن شروع ہوا ہے۔ جس کا نام "سیکولرازم" ہے۔ جو حکومتیں سیکولر ہونے کی مدعی ہیں ان کے ہاں بھی اقلیتوں اور غیر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کاغذ پر انہیں ہر طرح کے حقوق عطا کر دیئے گئے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں یہ سارے قانون کاغذ ہی پر رہ جاتے ہیں۔

اسلام کی سابق تاریخ سامنے ہے۔ چودہ سو برس کی اس طویل مدت میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ پیش کیا جا سکے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی شخص کو صرف اس لئے موت کا حکم سنایا گیا کہ وہ مسلمان نہیں تھا بلکہ اس طرح کی بکثرت مثالیں مل جائیں گی کہ مذہب کے سوال کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات کا سلوک روا رکھا گیا۔ تاریخ اسلام کے آئینے میں کچھ ہرج نہیں اگر ایک جھلک اس دوست کی خدمت میں بھی دکھائی جا سکے۔

غیر مسلموں سے حسنِ سلوک و مراعات: آنحضرت نے جب اسلام قبول کیا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یا ان سے ایک زمانہ پہلے یہودی قوم کی طرف سے ایذا دینے کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ اسلام اور نبی اسلام کے بدترین دشمن تھے ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ نے اس فیصلے پر پوری قوت کے ساتھ عمل بھی کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہودی قبائل آپ کے ساتھ ہو گئے۔ آنحضرت کو یہ کہنے کی نوبت آئی کہ "یہود کی نقل و حمل جاری رہنے دی جائے۔"

دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک کی دنیا میں کیا یہ پہلی مثال نہیں تھی؟

جنگ بدر ان غیر مسلموں سے لیا جانا ہے جو لڑ کر شکست کھا چکے ہوں یا جنگ

کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔ ایسے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں یعنی اسلامی حکومت ان کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے۔ اس ذیل میں فقہ حنفی مشہور کتاب کا فتویٰ یہ ہے:

"جزیہ دینے والے ذمی کی جان و مال کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح مسلمانوں کی۔ ان کے لیے وہی اصول ہوں گے جو مسلمانوں کے لیے ہیں کیونکہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ کفار جزیہ اس لیے دیتے ہیں کہ ان کا خون مسلمان کے خون کی طرح اور ان کا مال مسلمانوں کے مال کی مانند محترم ہو جائے۔"[۲۰]

جنگی قیدیوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ: جو لوگ جنگی قیدی بن کر آتے تھے سب سے پہلے آپؐ ان کو کافر کر دیتے تھے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا تھا کہ وہ ثنا خوانی کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ جنگِ بدر کے ایک قیدی کا بیان ہے:

"اللہ مسلمانوں پر رحم کرے۔ یہ اپنے اہل و عیال سے اچھا کھانا کھاتے تھے اور اپنے گھر کے لوگوں سے کہیں زیادہ ہماری آسائش کا خیال رکھتے تھے۔"

اسی کے فکر اور عقیدے میں جبر و جور کے ذریعے تبدیلی نہیں کرتا۔ اس کا ارشاد ہے:

"لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں ہے

جب دین کے معاملے میں جبر روا نہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ذیل میں پیش کی جاتی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ آپؐ کی نظر میں غیر مسلم کا خون بھی اتنا ہی محترم تھا جتنا مسلمان کا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اگر کوئی مسلمان کسی معاہد (غیر مسلم رعایا) کو قتل کرے گا تو وہ جنت کی

خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا، حالانکہ وہ چالیس سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے۔[۴۳]

غیر معاہد غیر مسلموں سے استعانت: جو غیر مسلم اپنے مذہب پر تو استوار تھے لیکن اسلام کے موافق نہیں تھے۔ ان سے استعانت تک کی مثال اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے۔ اور وہ بھی کب؟ فتح مکہ کے موقعہ پر:۔

آپ نے فرمایا: "اے ابو امیہ! ہمیں اپنے ہتھیار مستعار دو، کل ہم ان سے اپنے دشمن کا مقابلہ کریں گے!"

صفوان بولا: "اے محمد! کیا غصب کرنا چاہتے ہو؟"

آپ نے فرمایا: "نہیں، مستعار لے رہا ہوں۔ اور واپس دینے کی ضمانت لیتا ہوں۔!"

وہ کہنے لگا: "اچھا پھر کوئی حرج نہیں۔" اس نے آپ کی خدمت میں ایک سو زرہیں پیش کیں، اور ساتھ ہی بقدر کفایت ہتھیار بھی مہیا کیے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سواریوں کے متعلق بھی فرمایا۔ اس کی تعمیل بھی ہوئی۔

غزوہ حنین کے موقعہ پر آپ کے ہمراہ اہل مکہ کے دو ہزار نئے آنے والے بھی ہزار مسلمان تھے۔ جن کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے فتح کرایا۔[۴۴]

غیر مسلم کو حکومت کا انتظامیہ کا عہدہ دار بھی بن سکتا ہے۔

ہر وہ شخص جو اس کام کا اہل اور امانت دار ہو، عامل ہو سکتا ہے۔ پس کہ عامل تفویض کا عہدہ ہو تو حریت اسلام اور اجتہاد کا ہونا شرط ہے۔ اور عامل تنفیذ [illegible]

غیر مسلم رعایا میں کو مسلمانوں پر ترجیح: مسلم اور غیر مسلم رعایا میں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنے کو کبھی روا نہیں:۔

[illegible] یعنی گروہ مسلمان دین کے معاملہ میں تم سے [illegible]

فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق"

کے طالب ہوں تو مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی (غیر مسلم) قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔!"

"اسلامی حکومت میں جو حد مسلمانوں پر جاری ہوتی ہے غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً زنا کے جرم میں سنگساری کی سزا صرف مسلمان کو دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سزا کے نفاذ کے لیے اسلام شرط اول ہے۔ یہ جرم کسی کافر سے سرزد ہو تو اسے سزائے تازیانہ دی جائے گی۔ سنگسار نہیں کیا جائے گا۔!"

فتح مکہ تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ عہد آفریں واقعہ ہے۔

آج کے فاتح کل بے بس اور مجبور ہو کر اپنے دیس سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ جب تک یہ اپنے دیس میں رہے کون سا رزہ خیز ظلم تھا جو ان پر روا نہیں رکھا گیا۔ ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا گیا۔ مکان اور کھیت ہتھیا لیے گئے۔ بیوی اور بچوں کو چھین لیا گیا۔ ان میں سے نہ جانے کتنوں کو قتل کر دیا گیا۔ یہ فاتح کی حیثیت سے اپنے دیس میں داخل ہو رہے تھے۔ مفتوحوں سے فراخدلانہ برتاؤ: مکہ کا ہر باشندہ سہما ہوا تھا۔ دیکھیے کاتب تقدیر کیا لکھتا ہے؟

یہ ڈرے اور سہمے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے اپنے ظلم اور زیادتی کو یاد کر رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ حاکم مفتوح کے ساتھ کیا کرتا ہے!

یہ خود بھی اپنے زیردستوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کر چکے تھے؟ آج ان کی باری تھی۔ اور انھیں اپنا حساب چکانا تھا!

انھیں مال و دولت کی فکر نہیں تھی، زندگی کی فکر تھی۔ آج وہ چھنتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

لیکن فاتح فوج کا سپہ سالار اعلیٰ صرف سپہ سالار اعلیٰ نہ تھا بلکہ نبی

بھی تھا۔ اس نے داخلے کے وقت اپنی منظم اور اطاعت کیش فوج کے لیے فرمان صادر کیا:

۱: جو ہتھیار پھینک دے قتل نہ کیا جائے۔

۲: جو خانہ کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔

۳: جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ قتل سے محفوظ ہو جائے گا۔

۴: جو خانہ نشین ہو جائے اس کا قتل ممنوع ہو گا۔

۵: جو حکیم بن حزام کے گھر چلا جائے وہ قتل سے بری ہو گا۔

۶: بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

۷: کسی جنگی قیدی کو قتل نہ کیا جائے[۴۸]

اور: جنگ کے بارے میں امن کے قانون بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں۔ صرف شقاوت اور سفاکی کا قانون چلتا ہے۔ لیکن اسلامی حکومت جنگ کے بارے میں بھی امن ہی کے قانون پر عمل پیرا رہتی ہے۔

اسلامی جنگ کے احکام متعدد پہلوؤں سے قانون بین الاقوامی کے احکام سے متفق ہیں۔ نہ صرف متفق بلکہ ان سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ البتہ اختلافی پہلو جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ احکام دینی اور شرعی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اور ان کی تنفیذ میں مسلمان کی قوت ایمان اور اس کا ایمان ہی کارفرما رہتا ہے جس کا دوسرے احکام میں بھی جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے کے ہاں یہ چیز مفقود ہے۔

قانون بین الاقوامی کے احکام میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے قوت تنفیذ نہیں ہے جو ان کی بجا آوری کی ضامن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفکرین احکام اولیہ کو ایسا قانون کہتے ہیں جو تسامح کے اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ قانون صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوت اس کی حمایت و حفاظت و تنفیذ کے لیے موجود ہو جس کے احکام کو کسی حالت میں رد نہ کیا جا سکے۔

جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ ضروری ہے:- قوانین بین الاقوامی میں سے ایک اہم قانون یہ ہے کہ کوئی حکومت کسی دوسری حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے پر مجبور ہو تو اس پر واجب ہے کہ باقاعدہ اعلانِ جنگ کرے، اور اس کی رعایا کو اپنے ارادۂ جنگ سے مطلع کر دے۔ اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ اچانک حملہ نہ ہو۔ اور بدعہدی نہ ہو۔ آج یہ قانون صرف قانون ہے۔ اس پر عمل درآمد ضروری نہیں۔ جاپان نے چین پر اور جرمنی نے روس پر۔ بھارت نے پاکستان پر اعلانِ جنگ کئے بغیر حملہ کر دیا تھا۔

اب شریعتِ اسلامیہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ کفار سے مقاتلہ کرنے سے پہلے مسلمانوں پر واجب ہے کہ انہیں باقاعدہ دعوت دیں۔ وہ دعوت کو رد کر دیں تو جنگ کریں۔

قوانینِ دولت میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ جو لوگ غیر فوجی ہوں انہیں دشمن نہ سمجھا جائے۔ اور انہیں تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ لیکن یہ قانون کبھی صرف زینتِ قرطاس ہے۔ ورنہ اس پر عمل درآمد تو بہرحال ہے کہ غیر فوجی لوگوں کو بدترین دشمن سمجھ کر انہیں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ بدتر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن شریعتِ اسلامیہ نے کوئی مجمل بات نہیں کی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ عورتوں اور بچوں، راہبوں، پادریوں، بوڑھوں، بیماروں اور نکمیوں کی قتل قطعاً ناجائز ہے۔ نیز جو لوگ جنگ آزما ہوں، انہیں قتل نہ کیا جائے۔ اور اس قانون پر اسلامی حکومت میں ہمیشہ سختی سے عمل درآمد ہوا۔

غیر محارب غیر مسلموں اور معاہدین کے ساتھ رعایت:- شریعتِ اسلامیہ میں وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے جو جنگ سے الگ تھلگ ہوں۔ اور اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ زندہ یا مردہ کو آگ میں جلایا جائے۔ اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ فصلوں کو، پھلوں کو، کھیتوں

خراب اور ناکارہ بنایا جاتے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی ان ہدایات پر ان ملوک و سلاطین نے بھی سختی سے عمل کیا جن کا برتاؤ خود مسلمانوں کے ساتھ یعنی اپنی قوم و ملت کے ساتھ درجہ بہیمانہ اور سفاکانہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کتنا بڑا خونخوار آشام الدین تھا۔ اس نے ہزارہا مسلمانوں کو بے جرم و خطا موت کے گھاٹ اتارا۔ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں مگر اس کے سارے دورِ حیات میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس نے غیر مسلموں پر ظلم کیا ہو بلکہ سچ ہے تو یہ کہ اس نے باایں ہمہ شقاوت و سنگدلی غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ یہ رعایت رکھی ہے کہ وہ اگر جھاڑ سے تنگ آ جائیں اور ذرا سی صلح و مفاہمت کی طرف مائل ہوں تو معاہدہ اٹھا لیا جائے اور نرم شرائط پر صلح کر لی جائے۔ تاریخ اسلام میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں نے مغلوب و عاجز دشمن سے جب صلح کی اپنے شرائط نہیں تھوپے بلکہ خود اس کے پیش کیے ہوئے شرائط پر صلح کر لی اور اسے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے دشمن کی ہزیمت نہیں دی ہے اور نہ ایسا ہی کہا ہے اسلام نے دیتے ہیں اس سے بھی تخفیف و رعایت مخصوص ہے۔ مثلاً یہ کہ مثلہ نہ کیا جائے۔ عذاب نہ دیا جائے۔ نہ دوران زندگی کا اتلاف نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کے دشمن مثلہ کریں، یعنی کسی مسلمان پر قابو پا کر اس کے اعضا کاٹ ڈالیں تو افضل یہ ہے کہ اس تکلیف دہ مثال کی پیروی نہ کی جائے۔ یعنی مستحسن یہ ہے کہ مسلمان کے قبضہ میں اگر دشمن کا کوئی آدمی آ جائے تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے۔[۴۹]

معاہدۂ صلح کا احترام: امیر معاویہؓ کا رومیوں سے معاہدۂ صلح

تھا لیکن صلح کے زمانے میں انھوں نے رومیوں سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر بڑھے کہ معاہدہ ختم ہوتے ہی حملہ بھی شروع کر دیں۔ اثنائے سفر میں، عمرو بن عبسہ نے لوگوں: اللہ اکبر اللہ اکبر! یہ نقض عہد ہے! امیر معاویہؓ نے انھیں قائل کرنا چاہا۔ جواب میں انھوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ صلح کرتا ہے، تو نہ وہ اس کی گرہ باندھے نہ کھولے، یہاں تک کہ معاہدہ ختم ہو جائے، یا ختم معاہدہ کا کھلم کھلا اعلان کر دیا جائے (تاکہ دشمن کو جنگ کی تیاری کر لے)۔ آخر امیر معاویہ نقض عہد نہ کر سکے اور واپس آ گئے۔"

حضرت عمرؓ اور ہرمزان: ایران کا ہرمزان جو جنگ کے دوران میں بہت سے مسلمانوں کو قتل کر چکا ہے اور جلیل القدر صحابہؓ کے خون سے بھی اس کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، اسلام کی رواداری سے بہرہ ور ہو کر جان بخشی کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دربارِ عمرؓ میں حاضر ہو کر اپنا حکم قتل سنتا ہے اور پانی مانگتا ہے گلاس ہاتھ میں لے کر کہتا ہے جب تک یہ پانی نہ پی لوں مجھے قتل نہ کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔ ہاں کوئی حرج نہیں، وہ پانی پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے میں تو نہیں پیتا۔ پھر حضرت عمرؓ نے جب اس کے قتل کا حکم دیا تو حضرت انسؓ نے کہا۔ آپ اسے امان دے چکے ہیں۔ لہٰذا قتل کیسا؟

حضرت عمرؓ نے کہا: اے انس! اس نے براء بن مالک اور مجزاۃ بن ثور السدوسی کو قتل کیا ہے!

انسؓ کہتے ہیں، میں نے کہا: "آپ کے پاس اس کے قتل کا کوئی سبیل نہیں ہے!"

حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا اس نے تجھے کچھ دے دیا ہے؟"

میں نے کہا نہیں! لیکن امیر المومنین نے اس سے کہا تھا۔ لا بأس!

حضرت عمرؓ نے کہا: "یہ میں نے کب کہا تھا؟ شاہد لاؤ، ورنہ میں

تمھیں سزا دوں گا!"

انسؓ کہتے ہیں، میں اٹھا اور زبیرؓ بن عوام کے پاس گیا، وہ اس وقت مجلس میں موجود تھے، اور انھیں وہ بات یاد تھی، جو مجھے یاد تھی، وہ آئے اور انھوں نے شہادت دی۔

حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو رہا کر دیا، وہ اسلام لایا، اور اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے سالار سعدؓ کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں انھوں نے مجوسیوں کے بارے میں فرمایا: "اگر تم میں سے کوئی شخص بطور مجوسی کے کسی مجوسی کو امان دے یا ایسا اشارہ کرے، یا ایسے الفاظ کہے، جن کو کبھی نہ سمجھتے ہوں، مگر یہ اس کو امان جانیں، تو تم اس امان کو برقرار رکھو!"

اسلامی حکومت جن آداب جنگ کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہے وہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ناقابل ترمیم ہیں:

"عورتوں اور بچوں کو گرفتار نہ کرتے ہوں تو کسی حالت میں بھی قتل کرنا جائز نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ عورتیں اور خادموں کے قتل سے بھی آپ نے روکا ہے۔ اگر عورتیں اور بچے قتال میں حصہ لے رہے ہوں تو ان کو بھی قتل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مدافعت کر رہے ہوں۔ اور اگر پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں تو قتل کرنا جائز نہیں۔

اگر دشمن صلح کرتے وقت یہ شرط کریں کہ ہمارا آدمی مسلمان ہو جائے تو وہ ہمیں واپس کر دیا جائے، تو یہ شرط منظور کر لینی جائز ہے۔ اگر ان میں سے کسی نے اسلام قبول کر لیا، اور واپس کرنے میں اس کی جان تلف ہونے کا خطرہ نہیں ہے تو وہ واپس کر دیا جائے، اور اگر خطرہ ہو تو واپس نہ کیا جائے اور اگر کوئی عورت اسلام لے آئے، تو اس کے واپس کرنے کی شرط منظور نہیں ہے اس لیے کہ وہ کفار پر حرام ہو جاتی ہے۔ اگر یہ شرط منظور کر لی گئی

ہو تب بھی واپس نہ کی جائے۔[۵۲]

کفار سے خواہ مخواہ جنگ بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بھی کچھ حدود و شرائط ہیں:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ۰

یعنی اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

یعنی جنگ صرف ان کافروں سے کی جا سکتی ہے جو خود ہی برسرِ آزار ہوں۔ ایسے لوگوں سے بھی زیادتی نہ کرنا چاہیے۔ اور جو کافر جنگ آزما نہ ہوں ان سے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک سفرِ جہاد میں صحابہؓ بھوک کی شدت سے نڈھال ہو گئے۔ آخر یہاں وہاں سے بکریاں لوٹ کر لائے۔ ذبح کر کے ان کا گوشت دیگچیوں میں پکنے دیا۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو کمان کی نوک سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا:

"لوٹنے کا مال مردار کی طرح ہے!"[۵۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سفر میں ایک عورت کو قتل کیا۔ اس پر آپؐ نے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔[۵۴]

اسلامی حکومت کافروں سے نہ صرف خواہ مخواہ جنگ نہیں کر سکتی بلکہ دشمن کے سامنے صلح کی دعوت دینے پر بھی مجبور ہے:

"فلا تہنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون ۰"

یعنی سست نہ پڑو اور صلح کی دعوت دیتے رہو، یاد رکھو تم ہی غالب و سربلند ہو۔

کفار مائل بہ صلح ہوں تو صلح کر لینا ضروری ہے:

اگر جنگ کا انجام دیکھ کر کفار میدانِ جنگ سے ہٹ جائیں تو بھی ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی بلکہ صلح کر لینی چاہیے۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم

یعنی اگر کفار تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور

والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا ۔ جنگ نہ کریں بلکہ صلح کی پیش کش کریں، پھر خدا نے تمھیں ان سے جنگ کا اختیار نہیں دیا ہے۔[۵۷]

مسلمان فاتح مفتوح کافروں سے اپنا مال مغصوبہ بھی واپس نہیں لے سکتا۔

فتح مکہ کے دن مہاجرین جب مکہ واپس آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں کا مطالبہ کیا جن پر مشرکین قابض ہو چکے تھے لیکن آپؐ نے کسی مشرک کے قبضہ سے چھین کر مسلمان کا چھنا ہوا مکان اسے واپس نہیں دیا۔[۵۸]

اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے: اسیرانِ جنگ کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ وہ غلام بنا لیے جائیں گے، قطعاً غلط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی جنگی قیدی کو غلام نہیں بنایا۔ اسلام غلامی کو مٹانے آیا تھا، برقرار رکھنے کے لیے نہیں۔ اس نے یہ البتہ کیا کہ جو غلام بہ تعداد کثیر پہلے سے سوسائٹی میں موجود تھے اُن کی تدریجی آزادی کا لائحہ عمل تیار کیا۔ باقی رہا یہ کے لیے قرآن کا حکم موجود ہے۔

فاما منا بعد واما فداء ۔ یعنی یا تو انھیں احسان کر کے یونہی چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر پروانۂ رہائی عطا کیا جائے۔[۵۹]

اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت اسلام میں نہیں ہے۔

ان مراعات و رعایات کے ساتھ ساتھ جہاں تک جنگی چوکسی کا تعلق ہے وہ اسلام اور صحابہ کرامؓ نے کبھی کسی طرح کے "وہن" کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ خود پیش قدمی نہ کرنے کے دفاع کے لیے ہمیشہ آمادہ اور تیار رہے۔

جب آپؐ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو جنگی چال سے کام لیتے۔ مثلاً آپؐ نے جب غزوۂ حنین کا ارادہ فرمایا تو دریافت کیا کہ نجد کا راستہ کون سا ہے؟ اور اس کا پانی کیسا؟ اور وہاں کون دشمن ہے؟

یعنی حنین کے بجائے نجد کا راستہ معلوم کیا اور دوسری معلومات فراہم کیں۔ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہم نجد جائیں گے کیونکہ غلط بیانی ہوتی اور یہ بزدلی

معلوم ہوتا ہے۔

نیز لڑائی میں آپؐ صحابہؓ کا ایک نشان مقرر فرما دیتے، جب وہ آپس میں ملیں (تاکہ دشمن دھوکا دے کر شریک نہ ہو سکے) ایک بار ان کا شعار یہ تھا، امت امت ایک بار "یا منصور" شعار مقرر کیا گیا۔ ایک "حم لا ینصرون" تھا۔

کسی وجہ سے مسلمان اگر کافروں سے عہد کر لے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک جنگ ہو کر ان کے مقابلے میں نہیں آئے گا، تو اس عہد کی پابندی لازمی ہے:

"نیز آپؐ کی سنت طیبہ تھی کہ اگر آپؐ کے دشمن کسی صحابیؓ سے معاہدہ کرتے (محدود مدت تک) جاری رکھتے، جیسا کہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ کے ساتھ ہوا کہ وہ غزوہ بدر میں آپؐ کے ساتھ شریک ہونے آئے تو آپؐ نے اسے (عہد کو) جاری رہنے دیا، اور فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ، جو عہد کیا ہے، اسے پورا کرو۔ اور ہم کافروں کے مقابلہ میں صرف اللہ سے مدد چاہتے ہیں۔

میدان جنگ میں کلمہ پڑھ لینے کے بعد کسی کی نیت پر اور اس کے اسلام پر شک نہیں کیا جا سکتا:

"حضرت اسامہؓ ایک آدمی کے پیچھے نکلے، جس کا نام مرداس تھا۔ جب اس کے قریب آئے، اور تلوار سے اس پر حملہ کیا، تو اس نے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھ دیا۔

انھوں نے پھر بھی اسے قتل کر دیا۔ پھر انھوں نے بکریوں، چوپایوں وغیرہ کو ہنکایا، ہر آدمی کو دس بکریاں یا اس کے برابر چوپائے ملے۔

جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، آپؐ کو حضرت اسامہؓ کے اس فعل کی خبر دی گئی۔

آپؐ کو یہ بات سخت ناگوار گذری۔ اور فرمایا کہ تو نے "لا الٰہ الا اللہ" کہنے کے بعد بھی اسے قتل دیا؟

انھوں نے جواب دیا: "اس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا"

آپؐ نے فرمایا: "کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟"

پھر فرمایا: "قیامت کے دن "لا الہ الا اللہ" کے مقابلے میں کون تیرا مددگار ہوگا؟" پھر آپؐ یہ بات دہراتے رہے، یہاں تک کہ اسامہؓ نے دل میں کہا: کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ پھر کہا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اللہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس آدمی کو قتل نہ کروں گا جو لا الہ الا اللہ کہتا ہوگا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ:

خالد بن ولیدؓ کی شمشیر شکاف کے سامنے چند کافر آ گئے۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کہا: "ہم صابی ہو گئے، ہم صابی ہو گئے!" اور صحیح انداز سے یوں نہ کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ اس گفتگو کے بعد مقتولوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

پھر خالدؓ نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر لو۔ وہ گرفتار کر لیے گئے۔ بعض کو باندھ دیا، اور اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔ جب سحر ہوئی تو خالدؓ نے آواز دی کہ جس کے ساتھ کوئی قیدی ہو، اسے قتل کر دو۔ بنو سلیم نے اپنے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا۔ مہاجرین و انصار نے اپنے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خالدؓ بن ولید کے اس فعل کی خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ، خالد نے جو کچھ کیا، میں اس سے بری ہوں۔" پھر حضرت علیؓ کو بھیجا تاکہ مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے۔[۶۰]

غلامی کا انسداد: میں عرض کر چکا ہوں، اسلام غلامی ختم کرنے آیا تھا اور اسلامی حکومت نے اس کام کو سرانجام دینا بہت آسان بنا دیا، کیونکہ زکوٰۃ میں غلاموں کا حصہ رکھ دیا گیا کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں:

"زکوٰۃ میں پانچواں حصہ غلاموں کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مکاتبین کو رقم دی جائے جس سے خود کو آزاد کر لیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔"[۶۱]

غلام کے حقوق اور مرتبہ: امر واقعہ یہ ہے کہ: "غلام کو آزاد کرانے کے جتنے مواقع ہو سکتے تھے، اسلام نے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کیا، "تدبیر" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے مفہوم اس کا یہ ہے کہ آقا وصیت کر دے کہ اس کی موت کے بعد غلام آزاد ہوگا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ کسی انسان کے قبضے میں کوئی عاقل بالغ شخص ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ میرا غلام ہے، غلام تکذیب کرتا ہے تو غلام کی بات قسم دلانے کے بعد تسلیم کر لی جائے گی۔ کہ وہ آزاد آدمی ہے۔ مشہور قاعدہ: "البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر" کی روشنی میں اگر اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی حریت کو شریعت نے اصل سمجھا ہے اور غلامی کو ایک امر عارض، اسی لیے مدعی پر بار ثبوت ڈالا اور منکر کے ساتھ محض یمین (قسم) پر کفایت کی، اس سے شارع علیہ السلام کی شدت حرص کا پتہ چلتا ہے جو آپؐ کے اندر غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے ہر گنجائش کے موقع پر پائی جاتی تھی، اسی کے ساتھ فقہاء کے اس اجماع کا بھی اضافہ کر لیجیے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کا غلام ہے، اور کافر کہے کہ نہیں وہ اس کا لڑکا ہے تو اس کو آزاد رکھنے اور غلامی کی لعنت سے بچانے کے لیے کافر کا لڑکا ہی قرار دیا جائے گا، اور فیصلہ مسلمان کے خلاف ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حریت اسلام کے نزدیک کس قدر مقدس چیز ہے؟

واصل الاحدب سے روایت ہے کہ انھوں نے معرور بن سوید کو یہ فرماتے سنا کہ: "میں نے ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ وہ اور ان کا غلام ایک ایک حلہ پہنے ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک مرتبہ اس شخص کو گالی دی۔ اس نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی، آنحضرتؐ نے مجھے کہا: "تم نے اس کو ماں کی گالی دی؟"

پھر آپؐ نے فرمایا: "تمھارے ملازم تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو

تمہارے ماتحت کر دیا ہے پس جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو، اس کو چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور اسے وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالو اور اگر ڈالو تو پھر ان کی مدد کرو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے کسی کے پاس جب اس کا نوکر کھانا لے کر آئے اور وہ اس کو کھانے پر نہ بٹھائے تو چاہیے کہ اس میں سے ایک یا دو لقمہ اس کو ضرور دے دے کہ اس نے کھانا پکانے کے تمام لوازمات اور ضروریات کی مشقتوں اور آگ کی گرمی کو برداشت کیا ہے۔

ابن مسعودؓ انصاری سے روایت ہے کہ "میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یک بہ یک میں نے یہ آواز سنی:

"خبردار! ابن مسعود!"

تھوڑے وقفے کے بعد پھر یہی آواز سنائی دی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ کوڑے کو میں نے پھینک دیا۔

آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ اللہ تم پر قادر ہے!"

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سوار اور اس کے غلام کو اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ کر فرمایا:

"بندۂ خدا! اس کو بھی اپنے پیچھے بٹھا لو، اس کی جان بھی تمہاری ہی جان کی طرح ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنے غلام کو بھی اپنے پیچھے سواری پر بٹھایا۔

غلاموں کے ساتھ یہ عنایتیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھیں۔

روایت ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: "مجھے شرم آتی ہے کہ میں ایک انسان کو غلام بنا دوں، جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہتا ہے"[۶۲]

حضرت علی رضؓ کے متعلق ایک نہایت ہی عمدہ روایت ہے کہ آپؓ نے اپنے غلام کو کچھ درہم دیے کہ وہ قطعے کپڑا متفاوت قیمت کے خرید لائے۔ غلام جب کپڑا لے کر آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو باریک کپڑا اور گراں قیمت والا کپڑا آپؓ نے غلام کو عنایت فرما دیا اور دوسرا اپنے لئے رکھ لیا۔

اور فرمایا: "جو کپڑا بہتر ہے اس کے تم مجھ سے زیادہ مستحق ہو، اس لیے کہ تم جوان ہو، تمھارا دل زینت و آرائش کی طرف ہوگا، رہا میں، تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں"[۵۶۳]

خلفائے عباس کی ایک بہت بڑی تعداد امہات اولاد سے تھی، ہادی کی ماں ایک ایرانی لونڈی تھی۔ اسی طرح متوکل کی ماں "شجاع" رومی (یا خوزی) باندی تھی، اور مقتدر کی ماں سیدہ رومی لونڈی تھی، خلیفہ مستکفی کی ماں بھی رومی ہی تھی۔ اور مطیع کی ماں ایک دلبلی باندی تھی جو نہایت ہی عمدہ سیٹی بجاتی اور تمام خوش آواز چڑیوں کی بولیاں بول لیتی تھی۔

لونڈیوں کے سر تخت عقد صرف عباسی خلفاء ہی کا دستور نہ تھا، بلکہ فاطمیوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ چنانچہ مستنصر کی ماں ایک یہودی ابوسعید تستری کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس لونڈی نے اپنے ہم قوم سوڈانیوں کو کثرت سے دولت فاطمیہ میں لینا شروع کیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ خلیفہ مستنصر کی موجودگی میں جبر خلیج میں جو جشن منایا گیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے حکیم ناصر خسرو نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس جشن میں جن گروہوں نے شرکت کی تھی، ان میں تیس ہزار سوڈانی تھے۔ جنھیں عبید الشراء یعنی امیران زرخرید کہا جاتا تھا۔ اور ان کے علاوہ اور دوسرے غلام بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے[۵۶۴]

J. B. Fyzee اپنی کتاب "تراث الاسلام" کی اس فصل

ہیں جس کا تعلق اسپین اور پرتگال سے ہے، رقمطراز ہیں:

"مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات مسیحی عورتوں کے ساتھ کثرت سے قائم ہوئے، عبدالعزیز موسیٰ بن نصیر اور دوسرے سپہ سالاروں نے اسپین کے ملوک قوط کے آخری فرماں روا وترا کے خاندان میں شادیاں کیں۔ اور بعد کی آنے والی نسلوں ـــــ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں ـــــ کی مائیں ہسپانوی نسل کی مستورات ہونے لگیں۔ اسی طرح زمانہ مابعد کی نسلوں کے مسلم افراد ان سرخ بالوں والی قیدی عورتوں کا جو سپین کے شمالی حصے سے گرفتار کر کے لائی جاتی تھیں، اس شرط پر اپنی امہات اولاد بنانے لگے کہ ان کو اپنی قوم کی عورتوں کے برابر درجہ دیں گے۔ پروفیسر رمیرا نے قرطبہ کے عہد بازار بردہ فروشی کے متعدد کاغذات کے مطالعے اور بحث و تنقیح کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ باندیوں کی خرید و فروخت کوئی آسان چیز نہ تھی۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھتے ہیں، بلکہ خریدار کو اپنی خریداری کی تکمیل کاتب العقود کے سامنے کرنی پڑتی تھی۔ اور جن اسباب کی بناء پر کسی لونڈی کی خرید ہوتی تھی ان کی وضاحت کی جاتی اور موقع ان اختیار کرنے کے بعد ان کے نام درج ہوتے تھے۔

اندلس کے امویوں کے زیر سایہ عورتوں کو آزادی کا بہت بڑا حصہ ملا۔ اس عہد میں ان کا بہت زیادہ پاس و لحاظ کیا جاتا۔ بغداد کے عباسیوں کے دور میں ان کو جو حیثیت حاصل تھی۔ وہ اس دور سے بھی زیادہ تھی، شریف خاندان جن باندیوں کو اپنی امہات اولاد بنانا چاہتے تھے، ان کے متعلق زیادہ مرغوب چیز یہ تھی کہ وہ گوری چٹی یا اگر ممکن ہو تو جلیقی (اندلس میں ایک خطہ جلق کی طرف نسبت) ہوں۔ ہسپانوی عورتوں کے ساتھ ازدواجی زندگی قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی قرن میں عربی عنصر خالص النسل نہ رہا، لیکن باوجود اس کے جہاں تک سلسلۂ نسب کا تعلق ہے، اس میں آباء و اجداد ہی کا اعتبار کیا جاتا تھا۔[۱۶۵]

اسپین کے غلاموں کے ساتھ مسلمان فاتحوں کا سلوک: مسٹر آرنلڈ

نے اس باب میں جس کا تمام تر تعلق اسپین کے عیسائیوں میں اسلام کے نشر و اشاعت سے ہے، لکھا ہے کہ اس ملک کے غلاموں کو جو کینتھولک عیسائیوں کے عہد میں غربت و افلاس کے شکار تھے، مسلمانوں کے زیر حکومت آنے کے بعد ان کی نرم رواداری کے باعث بہت سے حقوق ملے۔ اسی لیے یہ غلام جو تحت الثریٰ میں پہنچ چکے تھے۔ اگر اسپین میں سب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ان کے نقش قدم کی پیروی دوسرے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے بھی کی جو ہمیشہ سے بُت پرستی کرتے چلے آرہے تھے۔

اسپین کے فتح کرنے میں اس ملک کے غلاموں کے طبقہ سے بڑا رد عمل انھوں نے عربوں کو خوش آمدید کہا، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ اس قید و بند سے ان کو نجات دلائیں گے۔ جس میں ان کے قوط آقاؤں نے انھیں ڈال رکھا ہے۔ ان کے بہت سے افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اور جن ایسے سارے حقوق سے مستفیض ہوئے جن سے اب تک محروم تھے، انھیں کاشت کے لیے زمینیں جو انھیں کے قبضے میں ہوتیں، انھیں صرف حکومت کو کچھ خراج دینا پڑتا۔

غلام کا مسلمان قاتل قتل کیا جائے گا۔ غلام کو قتل کرنے والا مرد قتل کی سزا سے نہیں بچ سکتا:

"امام محمدؒ نے سمرہ سے حسنؒ کی حدیث روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جو اپنے غلام کو قتل کرتا ہے، ہم اسے قتل کی سزا دیتے ہیں۔"!

آپؐ نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ غلام اپنے آقا کو "ربی" (میرا پروردگار) یا آقا اپنے غلام کو "عبدی" (میرا غلام) کہے اور فرمایا: بلکہ یوں کہو "میرے بچے" "میری بچی"!

آنحضرتؐ کا "غلام"! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تو انھوں نے حضرت زید بن حارثہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہبہ کے طور پر پیش کر دیا۔ زیدؓ کے والد اور چچا فدیہ دینے حاضر ہوئے، ان دونوں

نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ آپؐ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ چنانچہ دونوں وہاں آئے اور عرض کیا: "اے عبدالمطلب کے بیٹے! اے ابنِ ہاشم! اے سردارِ قوم کے بیٹے! آپ حرم کے محافظ اور اس کے پڑوسی ہیں۔ آپؐ مسکین کی مدد کرتے اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے لیے فدیہ ہوئے ہیں۔ ہم پر احسان کیجیے، اور اس کا فدیہ قبول کر کے ہم پر کرم کیجیے۔"

آپؐ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ انھوں نے عرض کیا، زیدؓ بن حارثہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک اور کام کیوں نہ کر لیا جائے۔" انھوں نے عرض کیا: "وہ کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "زید کو بلاؤ۔ میں اسے اختیار دیتا ہوں، اگر وہ تمھیں منتخب کرے تو وہ تمھارا ہے۔ اور اگر مجھے منتخب کرے تو اللہ کی قسم! میں اس آدمی کے ساتھ نہیں جو اختیار سے اختلاف رکھتا ہو۔"

ان دونوں نے عرض کیا۔ "آپؐ نے انصاف کیا اور بہت ہی خوب فرمایا!" چنانچہ انھیں بلایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "تم ان کو جانتے ہو؟"

انھوں نے عرض کیا: "جی ہاں! یہ میرے والد اور میرے چچا ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا: "میں کون ہوں، یہ بھی تمھیں معلوم ہے! اور تم نے میری صحبت بھی دیکھ لی۔ اس لیے اب یا مجھے انتخاب کر لو، یا ان دونوں کو منتخب کر لو!"

حضرت زید بن حارثہؓ نے عرض کیا: "میں کبھی بھی آپؐ کے علاوہ کسی اور کو منتخب نہیں کروں گا۔ آپؐ میرے نزدیک باپ اور ماں کے مقام پر ہیں!"

وہ دونوں کہنے لگے۔ "اے زید تعجب ہے تو آزادی اور اپنے والد اور چچا کے مقابلے میں غلامی قبول کرتا ہے!"

حضرت زید نے فرمایا: "ہاں! میں نے اس ہستی میں ایسی بات دیکھی ہے جس کے باعث میں اس کے سوا کبھی بھی کسی دوسرے کو منتخب نہیں کر سکتا!"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ دیکھا تو انھیں اپنے دامن میں لے لیا۔

زرِ فدیہ نقد کے بجائے کسب و ہنر سے بھی وا کیا جا سکتا ہے۔

"امام احمدؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہ تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔"

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: "میں نے اپنے غلام کو کسی لونڈی پر زنا کی تہمت لگائی۔ اس کی خبر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا: ابوذر! کیا تو نے اس کو اس کی ماں سے غیرت دلائی ہے؟ اس میں سبب ہے کہ تم میں اب تک جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے قبضے میں دے دیا ہے۔ پس جس شخص کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو وہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور ایسا ہی لباس پہنائے جیسا خود پہنتا ہے۔ انھیں ایسی تکلیف نہ دے جو ان پر گراں گزرے۔ اور اگر انھیں کوئی ایسا کام کرنے کے لیے کہے جو ان کے لیے کرنا مشکل ہو تو اس کام میں خود بھی ان کا ہاتھ بٹائے۔"

اسلام کا دشمن اور مسلمانوں کا قاتل دربارِ رسول میں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجد کی طرف لشکر روانہ فرمایا۔ چنانچہ وہ لوگ بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال حنفی کو گرفتار کر کے لائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ پھر آپؐ اس کے پاس سے گزرے اور فرمایا: "اے ثمامہ کیا حال ہے!"

وہ کہنے لگا: "اے محمدؐ! اگر آپ مجھے قتل کریں تو ایک قاتل کو قتل کریں گے اور اگر معاف کریں تو ایک شکر گزار کو معاف کریں گے۔ اور اگر آپ مال (فدیہ) چاہتے ہوں تو فرمائیے! جتنا مال درکار ہو میں دوں گا!"

آپؐ آگے بڑھ گئے پھر دوبارہ پاس سے گذرے اور وہی سوال کیا۔ اس نے وہی جواب دیا۔ پھر تیسری بار گذرے تو فرمایا: ثمامہؓ کو چھوڑ دو (صحابہ نے انھیں چھوڑ دیا)۔ یہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے پاس گئے، غسل کیا۔ پھر واپس آکر اسلام قبول کر لیا۔ وہ کہا: "اللہ کی قسم! میرے نزدیک زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ مبغوض کوئی چہرہ نہ تھا۔ لیکن اب یہ چہرہ تمام دنیا سے زیادہ میرے لیے محبوب بن چکا ہے۔ خدا کی قسم! آپ کے دین سے زیادہ مجھے اس زمین پر کوئی دین مبغوض نہ تھا، لیکن آپؐ کا دین تمام ادیان سے محبوب اب میرے لیے محبوب بن چکا ہے۔ میں عمرہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

غسل کی آگے اب اختلاف ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا قول مرتد آپ کے مقابلے میں قابل تسلیم ہے۔

فقہا کا اجماع ہے کہ اگر ایک شخص کے قبضے میں قتل بالغ مسلم ہے اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے اور اسلام کو اس سے انکار ہو، ایسی حالت میں قسم کے بعد غلام کا قول معتبر ہوگا۔ اور اسے آزاد خیال کیا جائے گا۔ اس جگہ اسلام کے مشہور قانون: "قسم مدعی پر اور قسم مدعا علیہ پر ضروری ہے" کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مدعی زاویہ نگاہ سے غلامی ایک غارتی چیز ہے۔ اس لیے مدعی کو ثبوت پیش کرنے کی تکلیف دی گئی اور مدعا علیہ کی قسم قبول کر لی گئی۔

حضرت عمرؓ کی مثال: بلاذری اور ابن سعد روایت کرتے ہیں کہ کسی عمرؓ ابن مالک نامی شخص نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کر لے۔ اگر تو کسی غیر مسلم سے نہیں بنایا جا سکتا لیکن میں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"لا اکراہ فی الدین" "یعنی دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں"

آپؓ کا وقتِ موت قریب آیا، تو آپ نے مجھے آزاد کر دیا، اور فرمایا: "تیرا جہاں جی چاہے، چلا جا!"[۷۱]

غیر مسلم غلام کی توکیل جائز ہے:

اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ذمی کو اپنے نکاح کے سلسلے میں وکیل بنانا چاہے، تو شرع اسے روک نہیں سکتی، وہ ایسا کر سکتا ہے، اور ذمی کی توکیل جائز ہوگی، اس میں کوئی قباحت نہیں۔[۷۲]

حضرت عمرؓ کو احترامِ انسانیت کس درجہ عزیز تھا، اس کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہوگا:

"عمروؓ بن العاص (فاتح مصر) کے صاحبزادے نے ایک قبطی عیسائی کو مارا پیٹا۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے اس قبطی کے ہاتھ سے انہیں مجمعِ عام میں سزا دلوائی پھر عمروؓ ابن العاص اور ان کے صاحبزادے سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے، حالانکہ ان کی ماں نے تو انھیں آزاد جنا تھا!"[۷۳]

ایک مسلمان نے عبادیوں کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا۔ حضرت عمرؓ سے فریاد کی گئی۔ آپؓ نے مسلمان کے قتل کا حکم صادر فرما دیا!

حضرت علیؓ کا فیصلہ: حضرت علیؓ کے پاس اہلِ حیرہ کا ایک شخص آیا۔ اس نے کہا: "یا امیر المومنین! ایک مسلمان نے میرے لڑکے کو قتل کر دیا ہے اس کا میرے پاس ثبوت بھی ہے۔ چنانچہ اس نے گواہوں کو پیش کیا، جنہوں نے گواہی دے دی۔ حضرت علیؓ نے ان گواہوں سے پوچھ گچھ کے بعد قاتل مسلمان کو طلب فرمایا، اور ایک تلوار حیری کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

"قاتل کو قتل گاہ میں لے جاؤ تاکہ یہ حیری اسے قتل کر دے!"

حیری نے لوگوں نے کہا: "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم دیت قبول کر لو، تاکہ ہم مقتول سے محفوظ ہوں، اور پھر دیت کی رقم سے اطمینان کی زندگی بسر کرو!"

جبری نے یہ بات مان لی۔ تلوار میان میں رکھی۔ اور حضرت علیؓ کے پاس واپس آیا۔

آپؓ نے پوچھا: "شاید تجھ کو لوگوں نے بُرا بھلا کہا۔ اور ڈرایا دھمکایا ہے؟"

جبری نے کہا: "نہیں خدا کی قسم نہیں! میں خوشی سے دیت لینے پر رضامند ہو گیا ہوں!"

حضرت علیؓ نے کہا: "اگر یہ بات ہے۔ تو تم جانو۔"

پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ہم نے ذمیوں کو وہ حقوق دیے ہیں کہ ہمارا خون ان کے خون کی طرح اور ہماری دیت ان کی دیت کے مانند ہو جائے!"

ذمیوں کے حقوق کی ایک مختصر فہرست: "جب یہ لوگ اپنے دینی مسائل و عقائد میں باہم نزاع و اختلاف کریں تو ان سے تعرض یا ان کے شبہات کا ازالہ نہ کیا جائے۔"

: اپنے حقوق کا مقدمہ اپنے حاکم کے پاس لے جانے سے نہ روکے جائیں۔

: اگر ہمارے حاکم کے پاس مرافعہ کریں تو وہ قانون اسلامی کے ماتحت تعذیر کرے۔ یا سزائے حدود کے مستوجب ہوں —— تو ان پر جاری کی جائے۔

: ان میں سے جو شخص نقض عہد کرے۔ اسے اس کی جائے پناہ میں پہنچا دیا جائے: اس کے بعد سے وہ حربی ہوگا۔

: اہل عہد (غیر مسلم) دارالاسلام آکر جان و مال سے محفوظ ہوں گے۔ اور چار مہینے بغیر جزیہ اور سال بھر جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں مدتوں کے درمیان کے متعلق اختلاف ہے۔ ذمیوں کی طرح ان کو بھی نقصان پہنچانا ممنوع ہے: مگر دوسرے حملہ آوروں کا دفاع ضروری نہیں، ذمیوں سے غیروں کا دفاع بھی ضروری ہے۔

: عاقل بالغ مسلمان کسی حربی کو امان دے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہے۔

: امان دینے میں عورت، مرد، غلام، آزاد سب برابر ہیں۔

: اگر حربی اسلامی قانون سے واقف نہ ہو تو پہلے اس کی پناہ گاہ تک پہنچا دیا جائے، اس کے بعد حربی ہوگا۔

: اہل عہد اور اہل ذمہ جس وقت مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کریں تو فوراً حربی ہو جائیں گے۔

: لڑنے والوں کو قتل کیا جائے، اور باقیوں کا قتل ان کے اعلان تک موقوف رکھا جائے، ذمی جزیہ دینا چھوڑ دیں تو یہ نقض عہد ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں دار الحرب ہونے سے یہ نقض عہد نہیں ہے۔ ڈاکوؤں کی طرح جبراً وصول کیا جائے۔

ذمی نقض عہد کے بعد جب تک قتال نہ کریں ان کو قتل کرنا، مال غنیمت کے اہل و عیال کو گرفتار کرنا مباح نہیں۔ اس سے قبل ضروری ہے کہ ان کے ساتھ دار الاسلام سے نکال کر دار الحرب کے قریب ترین مقام میں پہنچا دیا جائے۔ اگر وہ خود نہ جائیں تو جبراً نکالا جائے۔

دوسرے اکابر بھی اسی طرف گئے ہیں:

وہ جزیہ دینے سے انکار کریں، یا کسی مسلمان کی خطا کریں، یا کسی جرم کا ارتکاب کریں، بشرطیکہ وہ شخصی ہو، اجتماعی نہ ہو، نقض عہد موجب نہیں ہوتا۔ یہ پابندیاں جو مسلمان پر عائد کی گئی ہیں وہ اس امر پر مبنی ہیں کہ ذمی سے کوئی بیا فعل سرزد ہو جس کی تاویل ہو سکتی ہو، یا خطا شبہ ہو، اس سے ذمہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ بدستور برقرار رہتا ہے۔

کیا یہ رواداری اور وسعت قلب و ظرف کی نظیر نہیں ہے؟

شام کے شہر حمص کے ذمیوں کی داستان: "امام ابو یوسف کہتے

ہیں کہ جب ذمیوں کو مسلمانوں کے پاسِ وفا اور حسنِ سیرت کا خوب اچھی طرح تجربہ ہو گیا تو یہی کافر مسلمانوں کے دشمن کے گہرے دشمن اور مسلمانوں کے دوست کے بہترین دوست بن گئے۔

دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کرنے لگے۔ ان تمام غیر مسلم شہروں کے لوگوں میں سے جن سے مسلمانوں کی صلح تھی، کچھ لوگ چھانٹ چھانٹ کر جب رومی بن کر رومیوں کے ساتھ ہو گئے کہ وہ معلوم کر کے بتائیں۔ وہاں کیا تیاریاں ہو رہی ہیں؟ وہ لوٹ کر آئے اور انھوں نے بتایا کہ رومیوں نے تن بہ تن لشکر جمع کر لیا ہے۔ کہ اس سے پہلے کبھی جمع نہیں کیا ہوگا۔

جب یہ خبریں کثرت اور تواتر سے ابو عبیدہؓ کو پہنچنے لگیں تو وہ اور شام کے مسلمان کچھ پیچھے ہٹ آئے تھے۔ لیکن کہ انھوں نے غیر مسلموں سے جو فدیہ اور خراج وصول کیا ہے، واپس کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تمھارا مال ہم تمھیں واپس کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے مقابلہ کے لیے بہت بڑا لشکر تیار ہے، اور ہماری شرط یہ تھی کہ ہم تمھاری حفاظت کریں گے۔ اور حفاظت اس وقت ہم کر نہیں سکتے۔ لہٰذا ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا وہ واپس کرتے ہیں۔ البتہ اگر خدا نے ہماری مدد کی اور ہمیں فتح حاصل ہوئی تو جو شرط ہمارے تمھارے درمیان طے پائی ہے، ہم ان پر قائم و عمل کریں گے۔

جب گورنروں نے ذمیوں سے یہ کہا، اور ان کا مال واپس کیا تو ذمیوں نے کہا: "خدا تمھیں ہمارے درمیان جلد واپس لائے۔ اور تمھاری مدد کرے۔ اگر آج تمھارے علاوہ کوئی اور ہوتا تو نہ صرف یہ کہ وہ ہمارا مال واپس نہ کرتے بلکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ جو کچھ ہوتا چھین لیتے!"

پھر جب رومی شکست ہوئی اور مسلمانوں کو خدا نے فتح و نصرت عطا فرمائی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے عمرؓ بن خطاب کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت

عمرؓ نے انھیں تحریر فرمایا: "میں مسلمانوں کو تلقین کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں پر ظلم نہ کریں، انھیں تکلیف نہ پہنچائیں، بغیر حق کے ان کا مال نہ کھائیں، تم نے ان سے جو شرطیں کی ہیں انھیں پورا کرو۔ اور جو کچھ ان سے عہد کیا ہے اسے اچھی طرح نبھاؤ۔"[۷۶]

جزیہ: اس کی مقدار اور مستثنیات: جزیہ وہ ٹیکس تھا جو ذمی یعنی یہود و نصاریٰ سے وصول کیا جاتا تھا جو سالانہ لیا جاتا تھا لیکن صرف اس شخص سے جو جزیہ ادا کرنے کی مالی اعتبار سے سکت رکھتا ہو۔ جزیہ صرف ان لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا جو برسرِ روزگار اور برسرِ کار ہوں۔[۷۷]

ناداروں اور پریشان حالوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ عورتوں، بچوں، غلاموں اور راہبوں سے لیا جاتا تھا۔ جزیہ کی شرط یہ تھی کہ جس سے لیا جائے وہ عاقل ہو، بالغ ہو، آزاد ہو۔[۷۸]

جزیہ قبولِ اسلام کے بعد ساقط ہو جاتا تھا۔[۷۹]

جزیہ کی رقم ان سے حفاظت، جان و مال کے لیے لی جاتی تھی کیونکہ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی، اور جو فوجی خدمات انجام دیتے تھے ان پر جزیہ ساقط ہو جاتا تھا۔

ماوردی نے بھی جزیہ کی اس حد تک تصریح کی ہے۔ یہ صرف مرد پر واجب ہے۔ عورت، بچے، مجنون، غلام سے نہ لیا جائے۔ وہ تابع کے حکم میں ہوتے ہیں۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر یا رشتہ دار سے الگ ہو تو اس سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اس صورت میں اپنی قوم کے مردوں کی اگرچہ وہ رشتہ دار نہ ہوں، تابع ہوگی۔ اگر کوئی عورت دارالحرب کو چھوڑ کر دارالاسلام میں رہنے لگے اور یہاں رہنے کی وجہ سے وہ جزیہ دینا چاہے تو یہ اس پر واجب نہ ہوگا اس کی طرف سے ہبہ سمجھا جائے گا۔

[illegible] ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اگرچہ ذمی قوم کے
[illegible] نہیں ہے، مگر اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی جا سکتی ہے۔
جس کی اقدار میں [illegible] اختلاف ہے، ابوحنیفہ [illegible]
[illegible] کہتے ہیں کہ [illegible] ہم معاملہ ہو [illegible]
[illegible] ہم معاملہ نہ کیا جائے۔ [illegible]
[illegible] ایک اس چیز کی [illegible] نہ ہوگی [illegible]
[illegible] کوئی [illegible] امام کے [illegible]

غیر مسلم رعایا کے [illegible] اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے
[illegible] ہر [illegible] میں [illegible] دیا گیا:

یعقوب بن کاس یہودی تھا۔ بغداد میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔ بغداد
[illegible] باپ کے ساتھ مصر آیا۔ وہاں سے اس کے باپ نے اس کو [illegible]
[illegible]۔ یہ اخشیدی [illegible] اخشیدی کا وزیر تھا۔ اخشید کی وفات کے بعد
اس کا [illegible] کافور اخشیدی کے [illegible] ہو گیا۔ جو مصر کا خود سر فرمان روا بن گیا تھا
کافور نے اپنے [illegible] کا [illegible] اس کے [illegible] کر دیا اور پھر اس کی [illegible]
کو [illegible] دیوان [illegible] کے [illegible] میں شامل کر لیا۔ کافور کی [illegible]
[illegible] کی قدر و منزلت بڑھتی گئی۔ ایک دن وہ آیا جب کافور نے [illegible]
کے [illegible] کو [illegible] کوئی قوم ابن کلس کے [illegible] کے [illegible]
[illegible] دولت اخشیدیہ کے آخری عہد میں یعقوب بن کلس مختصر
اسلام میں داخل ہو گیا۔

غیر مسلموں کی [illegible] زبان بھی تھی:

[illegible] تاخیر کے [illegible] کی [illegible]
[illegible] وقت جب کہ [illegible] پر [illegible] کی [illegible]
[illegible] میں کوئی [illegible] تھا [illegible]

مغفرتی (۱۲۰ - ۱۲۷) قبطیوں کی گواہی انہی کی زبان میں مذاکرتے تھے[۹]

مسجد میں عیسائیوں کی عبادت :

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حاضر ہوا۔ مجھے محمد بن جعفر بن زبیر نے بتایا کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نجران کا وفد آیا تو یہ لوگ عصر کے بعد مسجد میں آپ کے سامنے حاضر ہوئے۔ اور مسجد میں ہی نماز ادا کرنے لگے۔ لوگوں نے انہیں منع کرنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار انہیں مت ٹوکو! چنانچہ انہوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے اپنی مخصوص عبادت کی[۱۰]

مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ :

بعض علماء کرام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ یہ اہل کتاب نہیں اور مسلمان مرد کو صرف کتابیہ عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے لیکن خلافت راشدہ کے دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مثال کے پیش نظر مجوسیوں کے ساتھ بھی سلوک کیا گیا جو ان کتابیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور نجران کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح بھی جائز ہوا۔ چنانچہ بعض ائمہ کا فتویٰ ہے کہ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

امام شافعیؒ کا قول مجوسی عورتوں سے جواز نکاح کو تائید میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ان کا ذبیحہ جائز ہے لہٰذا ان کی عورتوں سے نکاح بھی ہو سکتا ہے۔

مغفرتی بن عبداللہ قبطی کا بہت بڑا مورخ تھا۔ فتح مکہ کے بعد اس نے اعمال نامہ دیا۔ ہر ہر جرم موت کا آئینہ دار تھا۔ ٹھہرنے کا جواز باقی نہ رہا۔ جان بچانے کے لئے آپ کو دل و جان سے اسلام کی شاخ ہونی۔ ایمان کی علامت کے طور پر پہلے

پس حضرت عمرؓ کو رحمت فرمایا کہ وہ جائیں اور اس کو لے آئیں۔ جس نے اسلام کے قلع قمع کرنے میں واقعی اسلام کو ایذائیں پہنچانے میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

تلوار لئے ہوئے دشمن کو مٹانے کے جوش و خروش میں گھر سے نکل گئے تھے۔ وہ خود بستانہ زمرت سے تبسم کناں اور مغفور واپس آگئے۔

حضرت عمرؓ نے صحابیوں کے اصرار کے باوجود قیام شام کے دوران کسی بھی اس خیال سے نماز نہ پڑھنے سے انکار کر دیا کہ کہیں مسلمان مغلوب نہ ہو جائیں۔

غیر مسلموں سے تعلقات کی بنیاد امن ہے نہ کہ جنگ و نفرت۔ ان لوگوں کی نادانی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی بنیاد مسالمت اور امان قرار دی ہے، نہ کہ حرب و قتال۔ اس صورت کے مسلمان فتنہ میں مبتلا کر دیئے گئے ہوں، ان کے دین کے معاملہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہوں۔ ان کی دعوت اسلام کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو۔ اس صورت میں مسلمانوں پر یہ شرعاً جہاد فرض ہے کہ وہ شر کو رفع کر دیں اور دعوت و تبلیغ کا راستہ کھول دیں۔

قرآن میں آیا ہے:

لا ینھکم اللہ عن الذین لم	دین کے معاملے میں جو غیر مسلم تم سے
یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم	مقاتلہ نہ کریں اور تمہیں جلاوطن کرنے کی سعی نہ
من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا	کریں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے
الیھم ان اللہ یحب المقسطین ۝	ساتھ انصاف سے منع نہیں کرتا، بے شک
انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم	اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے
فی الدین واخرجوکم من دیارکم	البتہ قرآن تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی رکھنے کو منع کرتا ہے
وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم	جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں مقابلہ کیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اعلانِ جنگ نہیں کیا۔

[illegible]

[illegible] قانون کا اس پر اتفاق ہے کہ قوت حاکمہ اور امت محکومہ کے درمیان جو تعلقات اور اختیارات کا رابطہ ہے وہ محدود ہوتا کہ حاکم کے دائرے اور محکوم کی حریت میں ہم آہنگی رہے۔ ان تعلقات کے اختلاف سے حکومت کی شکل و ہیئت میں تبدیلی ہوتی اور وہ بالفعل [illegible] حکومت میں [illegible] ہوتی ہے یا [illegible] حکومت کا [illegible] کہلاتی ہے۔[۱۶]

حاشیہ:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۲۱۔ طبری ج ۰۰ ص ۲۸۶۴ ۲۲۔ طبری ج ۲، ص ۲۰۲

۲۲۔ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۶۲ — ۴۶۹

۲۳۔ ترمذی میں اور دیگر کتب سنن میں یہ حدیث مروی ہوئی ہے۔

۲۴۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، عن ابن عباس۔

۲۵۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ، نیز مستدرک حاکم، ج ۳، ص ۰۲، نیز زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۳، ص ۳۴۲، ۳۴۳۔

۲۶۔ السیاسۃ الشرعیہ (عبدالوہاب خلاف) طبع مصر، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

۲۷۔ Islamic Constitutional Theory & Practice

۲۸۔ العقد الثمین، ص ۷۸ ۲۹۔ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۲۔

۳۰۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۰۔

۳۱۔ تاریخ دولت فاطمیہ ص ۶۷، ۶۸۔

۳۲۔ احکام سلطانیہ (ماوردی) ص ۲۰، ۲۱۔ ۳۳۔ طبری ج ۰ ص ۰۰

۳۴۔ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۸۶، ۸۷۔

۳۵۔ طبری، ج ۳، ص ۴۰۷۔

۳۶۔ صرف طبری ہی میں نہیں، دوسری متداول تاریخوں میں بھی یہ بیان موجود ہے۔

۳۷۔ تاریخ ابن خلدون، طبع مصر، ص ۵۰۲، ۳۸۔ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۵

۳۹۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، عن ابی ہریرہؓ، نیز زاد المعاد (ابن قیم) ج ۰ ص ۳۰۳، ۳۰۴۔ ۴۰۔ بدایہ ج ۲، ص ۲۱۲

۴۱۔ صحیح بخاری، باب کسوۃ النساء، عن جابرؓ

۴۲۔ سورۂ بقرہ، رکوع آیت ۴۳۔ صحیح بخاری کتاب جزیہ، عبداللہ بن عمر

۴۴۔ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۳۸، ۳۹، طبع مصر۔

۴۵۔ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۹۔ ۴۶۔ سورۂ انفال آیت ۷۲

۴۷۔ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۹۔

۴۹ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۱، ص ۴۲

۵۰ سیاسۃ شرعیۃ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰

۵۱ سنن ابی داؤد، اور دوسری کتب سنن میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔

۵۲ تبصرہ ج ۱، ص ۳۱۲ ۵۳ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۷۰، ۹۱

۵۴ سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۰

۵۵ سنن ابی داؤد، اور دوسری کتب سنن میں یہ حدیث طرق کے ساتھ مروی ہے۔

۵۶ صحیح مسلم اور دوسری کتب سنن و مسانید میں یہ بھی طرق کے تعدد کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ ۵۷ سورۂ نحل، پارہ ۲۷، رکوع ۱۲، آیت ۳۶

۵۸ سورۂ نساء، پارہ ۵، رکوع ۱۲، آیت ۵۹۔

۵۹ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۳، ص ۵۱۷۔

۶۰ سورۂ شوریٰ، پارہ ۲۵، رکوع ۶، آیت ۳۸

۶۱ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۳۳، ۱۳۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷۔

۶۲ احکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۸۳

۶۳ مقدمہ صاحب (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۱۰، ۱۱

۶۴ عینی شرح بخاری طبع مصر، ج ۱۳، ص ۷۴۔

۶۵ مقدمہ صاحب (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۲۲

۶۶ The Legacy of Islam P. 11, 12

۶۷ Preaching of Islam P. 146

۶۸ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۱، ص ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۹۲۔

۶۹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، حسن ابوالبقاء، ص ۱۰۔

۷۰ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۱، ص ۳۰، ۳۱

۷۱ کتاب الفقہ (ابن قدامہ) طبع مصر، ص ۱۳۵

۷۷ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر ج ۲، ص ۴۴۔

۷۸ مختصر الفتاویٰ (ابن تیمیہ) طبع مصر، ۴۲۔

۷۹ یعقوبی ج ۲، ص ۱۱۱ ۸۰ احکام القرآن ج ۲ (جصاص)

۸۱ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۱۲، ۲۱۳۔

۸۲ السیاسۃ الشرعیہ (عبدالوہاب خلاف) طبع مصر، ص ۲۷۲۔

۸۳ المقریزی، خطط، طبع بولاق، ج ۱، ص ۸۲۔

۸۴ خالدیون (الدتاذ ابی) طبع مصر، ج ۲، ص ۱۳۸۔

۸۵ مقدمی آمین کہ کوئی صورت ہے جو [illegible] اسلامی لوگوں کو سکون [illegible]
[illegible] قائم کر سکتی ہے۔

۸۶ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۱۰۔

۸۷ نظم اسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۳۰۵، ۳۰۶۔

۸۸ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۱۲۰۔

۸۹ مختصر الفتاویٰ المصریہ (ابن تیمیہ) طبع مصر، ص ۲۷۰۔

۹۰ اسلام اور داری، ص ۳۷۔

۹۱ فتوح البلدان (بلاذری) ص ۲۷۶۔

۹۲ سیاسۃ الشرعیہ (عبدالوہاب خلاف) طبع مصر، ص ۲۷۲، ۲۷۳۔

(۱۴)

اسلامی سوشلزم یا اسلامزم؟

۱۹۱۴ء کی پہلی عالمگیر جنگ نتیجہ تھی عالمگیر معاشی بحران کا۔ سرمایہ دار اور سرمایہ کار بادشاہت کر رہے تھے۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے نگاہِ حسرت سے ان کی طرف دیکھتے تھے اور کہا کرتے تھے ؎

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

اس معاشی بحران نے، سیاسی بحران پیدا کر دیا ہے۔ یعنی جتنا جتنا حکومتیں اور زبردست اپنے حالات کو سازگار بنانے کے لیے ابھرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی شدت اور جوش و خروش کے ساتھ قیصریت اور شہنشاہیت کی قوتیں انھیں پامال کرنے، کچلنے اور دبانے کے لیے آگے بڑھتی تھیں۔ خفیہ اور اعلانیہ جنگ کی ختم ہوتے ہی اسلامی حکومتیں اور زبردست اور سرمایہ دار غلام اور آقا کے مابین جاری تھا۔

اس جنگ کے اختتام کا "معجل" ردِ عمل وہ تھا، جو فوراً روس کے اندر اشتراکیت کی صورت میں رونما ہوا۔ اور "موجل" ردِ عمل وہ تھا جو ہٹلر کی صورت میں ساری دنیا کے لیے بالخصوص یورپ اور یہودیوں کے لیے قیامت ایجاد کا طوفان بن کر نمودار ہوا۔ اور جس سے ابھی دنیا آزاد نہیں ہو سکی۔

اس کتاب کا موضوع سیاسیاتِ عالم نہیں ہے۔ لہٰذا اعلیٰ جنگِ عظیم کے "موجل" ردِ عمل پر بحث و گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن "معجل" ردِ عمل کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کے باعث دنیا ایک نئے تجربے سے دوچار

ہوئی۔ جو اشتراکیت کی صورت میں آج دنیا کی دو تہائی سے زیادہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

اشتراکیت اور اشتمالیت: اشتراکیت (کمیونزم) یا اشتمالیت (سوشلزم) میں صرف الفاظ کا فرق ہے، ورنہ حقیقتاً دونوں ایک ہی ہیں اور اگر فرق ہے بھی تو بہت معمولی ہے۔

اشتراکیت، ابطال ملکیت کی علمبردار تھی، ("ہے" میں نے اس لیے نہیں کہا کہ اب اس میں لچک پیدا ہو چلی ہے) اور اشتمالیت (سوشلزم) اور خاص طور پر ہٹلر کی ایجاد کردہ "قومی اشتمالیت" (نیشنل سوشلزم) کا مقصد ان جملہ وسائل کو قومیانا تھا جو عوام کی ضروریات زندگی سے متعلق ہوں۔

یہ دونوں تحریکیں خوب پھلیں پھولیں، اور نہ صرف یہ کہ مائل بہ انحطاط نہیں بلکہ ان کی جاذبیت میں برابر اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ایسے ملک بہت کم ہیں، جہاں "انقلاب" آیا ہو، اور فوراً ہی اشتراکیت یا اشتمالیت نے سکۂ رائج الوقت کی حیثیت نہ اختیار کر لی ہو۔

۱۹۱۴ء سے پہلے یہ دونوں الفاظ صرف ایک دلچسپ اصطلاح کی حیثیت رکھتے تھے اور اب ایک بہت بڑا سلسلۂ انقلاب اور سلسلۂ حیات بن چکے ہیں۔ یورپ اور ایشیا اور افریقہ بلکہ امریکہ تک میں ان کے قدم جم چکے ہیں۔ اور روس کا پورا ملک، چین کی ۷۵ کروڑ آبادی، افریقہ کی کئی ریاستیں، یورپ میں مشرقی جرمنی، اور سابق بلقان کی ریاستیں پولینڈ، البانیہ اور کئی دیگر ممالک، تمام کے تمام یہ مذہب اختیار کر چکے ہیں۔ ویت نام کی جنگ اسی سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کو روکنے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ عجب یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کی کئی ریاستوں تک اس طوفان بلا خیز کی صدائے بازگشت سنی جا رہی ہے۔ اقبال آج زندہ ہوتے تو ایک مرتبہ پھر کہتے ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

پس ماندہ، مفلوک الحال اور غریب ممالک نے، اشتراکیت اور اشتمالیت کا

کا چرچا سنا تو وہ بھی اس کی آرزو اور تمنا کرنے لگے۔ اور یہ انسان کی فطرت بھی ہے کہ نامساعد حالات میں جب گھبرا جاتا ہے تو ایک انقلاب کی توقع کرنے لگتا ہے کہ شاید اس طرح حالات اگر پورے طور پر نہ سہی، کسی حد تک سہی درست ہو جائیں۔ چنانچہ عالمی سطح سے فرد تا بہ ممالک ہر کہیں اس تحریک کی مقبولیت کم از کم ذہنی طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔

اس طوفان کو روکنے کے لیے بعض سیاسی رہنماؤں اور مدبروں نے اسلامی سوشلزم کا پرچار شروع کیا ہے۔ اشتراکیت اور اشتمالیت میں پہلی زد مذہب پر پڑتی ہے اور اسے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی سوشلزم کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو تو نہیں چھوڑتے ہیں لیکن فلسفۂ حیات جتنا زیادہ سے زیادہ اپنایا جا سکتا ہے اپنا لیا جائے۔

اسلامی سوشلزم: جو لوگ اسلامی سوشلزم کے علم بردار ہیں، ان کی دیانت پر شک کرنے کا کوئی خصوصی سبب نہیں لیکن سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ اسلام میں مساوات عمومی اور مساوات بین الناس کی جتنی زیادہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ وہ اگر پورے طور پر ذہن میں ہو تو ماننا پڑے گا کہ اسلام کو ان تحریکوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اگر سماجی تحریکات کی بنیاد ایک ہی ہے جو فلسفۂ حیات کی بنیاد پر کھڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

اسلامزم ہی اصل اصول ہے: اگر اسلام سے پوری واقفیت ہے تو پھر "اسلامزم" ہی کا نعرہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسلامی سوشلزم کو یہ روز خود اسلام کے آستانے پر سر جھکانا پڑے گا۔ کیونکہ ان تحریکوں میں بشری کمزوریاں موجود ہیں۔ اور اسلام چونکہ ایک خدائی مذہب ہے۔ اس لیے وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے بری ہے۔ ان تحریکوں میں نفی زیادہ ہے اثبات کم ہے انکار کی افراط ہے۔ اقرار نایاب ہے۔ شہرت رساں انتہا پسندی کی کثرت ہے۔ فائدہ بخش اعتدال و توسط نایاب ہے۔ اپنی بات، اپنا عقیدہ، اپنا مسلک اور

اپنی فکر منوانے کے لیے چمکتی ہوئی تلوار موجود ہے: "لا اکراہ فی الدین" کی بشارت نہیں، اور جو چیز جبر و جور کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے وہ اپنے دامن اور حقیقی حسن سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہو جاتی ہے۔

اسلام ازم کے خصائص: اسلام نے ملکیت قائم رکھی ہے، لیکن اسے محدود کر دیا ہے۔ اس نے نفع اندوزی کی ممانعت نہیں کی ہے، لیکن گرانفروشی، چور بازاری، اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس نے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد پر مالکانہ حق تسلیم کیا ہے لیکن اپنے قوانین وراثت کے ذریعہ کسی کے لیے بھی فورڈ یا راک فیلر بننے کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اس نے سود کو حرام قرار دے دیا ہے اور اسی طرح وقت کے شائلاکوں کے ابھرنے کے مواقع ختم کر دیے ہیں، اس نے ایک ایسے سماج، ایک ایسے معاشرے، ایک ایسے نظام حیات اور ایک ایسے طرز زندگی کی تخلیق و تشکیل کی ہے جس میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا، کوئی کسی کی جیب نہیں کاٹ سکتا، کوئی کسی کے ساتھ سماجی ناانصافی نہیں کر سکتا، کوئی کسی کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ کوئی کسی کی محنت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا، کوئی صرف اپنے سرمایہ اور دولت کے بل پر دولت، عیش و عشرت نہیں دے سکتا۔ کیا اس کے بعد بھی اشتراکیت یا اشتمالیت کی ضرورت ہے کہ ایک غلط اصطلاح "اسلامی سوشلزم" کے نام سے وضع کی جائے؟ بقول شیکسپیئر کے، الفاظ میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کو کسی نام سے بھی پکارا جائے وہ گلاب ہی رہے گا۔ لہٰذا اگر "اسلامی سوشلزم" کا لفظ محض "اسلامی" کہہ کر کسی کو پسند آتا ہے تو اپنا لگا دینے سے ایک طرح کی مدافعانہ ذہنیت ابھرتی ہے، ایک قسم کی مرعوبیت جھلکتی ہے، اور یہ بات کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتی۔ اس لیے اس جدت سے احتراز اور اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

اچھی ہے۔ لیکن اگر تسلی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یہ اصطلاح استعمال کی جائے تو اوراق ذیل سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلام سے بڑا، سچا، کھرا، حد درجہ غیر مضر اور حد درجہ نافع، سوشلسٹ کوئی نہیں ہے۔

اسلام ازم کا سربراہ مملکت: کتاب و سنت سے قدم قدم پر جس چیز کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، وہ بھی "سوشلزم" ہے۔ اور یہ ایسا سوشلزم ہے جس کا سربراہ کسی کریمین میں نہیں رہ سکتا۔ نہ شراب پی سکتا ہے، نہ رقص کر سکتا ہے، نہ اپنی ذاتی صوابدید پر بے تحاشا خرچ کر سکتا ہے۔ نہ عیش و عشرت اور تنعم کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ نہ عام افرادِ امت سے اچھا کھا سکتا ہے، نہ اچھا پہن سکتا ہے۔ اسے راتوں کو اٹھ کر بے نواؤں اور تباہ حالوں کی خبر گیری اور دستگیری کرنا پڑتی ہے۔ اسے "پارٹی" کے اندر نہیں، صحن مسجد میں ہر سیرِ عام نکتہ چینی کا مقابلہ کرنا اور بیان صفائی دینا پڑتا ہے۔ نہ یہ کسی ٹیکس سے محفوظ، نہ کسی خصوصی رعایت سے بہرہ ور۔ سفر کرنا ہو تو اپنی سواری پر جائے گا، گھر میں رہے گا تو اپنے کام کاج خود کرے گا۔ مسند امارت پر بیٹھنے کے بعد اس کی کوئی چیز بھی پرائیویٹ نہیں رہ جاتی، ہر چیز پبلک بن جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنی اولاد تک کے لیے جائز منفعت کے دروازے اسے بند کر لینا پڑتے ہیں حالانکہ دوسرے افرادِ امت کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی جرم ہو گا، تو قاضی کی عدالت میں اصالتاً حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ قاضی کی عدالت میں نہ اس کے لیے کہیں خالی کی جائے گی، نہ اسے فریق مقابل پر ترجیح دی جائے گی، اور اگر قاضی اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دے گا تو بے چون و چرا اسے مان لینا پڑے گا۔ یہ دن کو امورِ مملکت انجام دے گا، اور رات کو مصلیٰ بچھا کر خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرے گا۔ اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں معافی مانگے گا اور روئے گا، اور روتے روتے اس کی داڑھی آنسوؤں

سے تر ہو جائے گی۔ پھر بھی اپنے کو خطا کار تصور کرتا رہے گا، اور آخرت کی جواب دہی سے ڈرتا رہے گا۔ شمع کی روشنی میں سرکاری کام کرنے بیٹھے گا، اس اثنا میں کوئی شخص آجائے اور ذاتی باتیں چھڑ جائیں تو شمع بجھا دے گا کہ سرکاری چیز ذاتی استعمال میں کیوں آئے؟ بیمار پڑے گا، طبیب شہد تجویز کریں گے تو بغیر اذن بیت المال کا شہد بھی استعمال نہیں کرے گا، اور جب اس خاکدانِ عالم سے کنارہ کش ہونے کا وقت آئے گا تو وصیت کر جائے گا کہ عہدِ امارت میں اپنے آذوقے اور پوشش کے لیے میں نے جتنی رقم لی ہے وہ میری فلاں جائداد فروخت کر کے بیت المال کو واپس کر دی جائے، اور پھر بھی روتا اور زار زار ہوتا رہے گا کہ کاش میں حساب کتاب سے بچ جاتا۔ سوشلزم یہ ہے یا وہ؟

دنیا کی اصل آبادی کسانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہے، یہ کھیت جوتتے ہیں، غلہ اگاتے ہیں، پسینہ بہاتے ہیں، دن رات ایک کرتے ہیں۔ تب خوشۂ گندم پیدا کرتے ہیں، لیکن اس محنت کا صلہ انھیں کیا ملتا ہے؟ — صرف فقر و فاقہ!

محروم حق ملکیت و سماج تر مراعات: اشتراکیت نے سی جیز کو دارِ فکر بنا کر قدم آگے بڑھائے اور زمین کا حق ملکیت سوخت کر لیا۔ مطلق طور پر زمین کی حق ملکیت سوخت کرنے سے جو مفاسد پیدا ہوئے۔ ان کا ذکر لوئی فشر نے اپنی کتاب "اسٹالن" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اسلام نے حق ملکیت تو سوخت نہیں کیا ہے، لیکن اس حق کے استعمال کو آزاد شوار کر دیا ہے، اور کاشتکاروں کو اتنی سہولتیں دے دی ہیں کہ پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کون اپنے حق سے محروم رہا، اور کس نے اپنے حق سے زیادہ لے لیا۔

زہیر بن رافع کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایسے کام سے روک دیا، جس سے ہم بہت مزے میں رہتے تھے۔ آپ

نے ایک دن مجھے بلایا، اور دریافت فرمایا: "اپنے کھیتوں کے بارے میں تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "اپنے کھیتوں کا کبھی چوتھا حصہ بٹائی پر دے دیتے ہیں کبھی وسق کھجور اور جو پر اٹھا دیتے ہیں۔"

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، خود کاشت کرو، یا کسی کو کاشت کے لیے دے دو۔"

فاضل پانی کو معمولی ضرورت کے لیے روک کر دوسرے کی اہم ضرورت کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔

بو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بچے ہوئے پانی کو گھاس کے تر و تازہ رکھنے کے لیے مت روکو!"

چراگاہیں تو بالکل سرکاری ملک قرار دی گئیں۔

صعب بن جثامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے!"

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے!"[1]

کیا مکان کا کرایہ جائز ہے؟ غلط قسم کی نفع اندوزی کا ایک ذریعہ مکان بنانا، اور اسے کرایہ پر دینا اور من مانا کرایہ وصول کرنا ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں یہ غیر پسندیدہ فعل ہے۔

حضرت عمرؓ تین کمروں سے زیادہ بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے!

حضرت عمروؓ بن العاص مصر کے گورنر تھے، انھوں نے وہاں مکان تعمیر کیا۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات سخت ناگوار گذری کہ جو شخص صرف منصبی فرض داریوں کے لیے مصر گیا ہوا ہے، وہ اپنی مستقل جائے اقامت رکھنے کے لیے مکان بنواتے۔ چنانچہ آپؓ کے حکم سے وہ بازار میں تبدیل کر دیا گیا۔[2]

ذاتی ضرورت سے زیادہ زمین نہیں رکھی جا سکتی: طلحہ بن عبید نے جب ایک زمین پر حق ملکیت ثابت کرنا چاہا، تو حضرت عمرؓ بگڑ گئے۔ اور ارشاد فرمایا: "یہ اتنی ساری زمین دوسرے مسلمانوں کو محروم کر کے صرف تمہارا کیسے بن سکتی ہے؟"[۳۳]

حضرت بلالؓ کی زائد زمین واپس لے لی گئی: بلال ایسا ہی ماجرا مؤذنِ رسولؐ حضرت بلال کے ساتھ بھی گذرا، وہ اپنی زمین جب ایک حد تک کاشت نہ کر سکے تو عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔ صرف اتنی زمین رکھنے کی اجازت دی جس پر وہ خود کاشت کر سکیں۔

سرمایہ داری کے خلاف ابوذرؓ کا جہاد: حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے اللہ رسول صحابی رسولؐ تھے۔ انھوں نے اس وقت، جب امویوں کا آفتاب عروج و اقبال طلوع ہو رہا تھا، "الصراع الاسلامی والاقطاعی" کا پرچار شروع کر دیا۔ اُن کے لب و لہجہ کا تیکھا پن، انداز گفتگو اور جوشِ کلام ابھرتی ہوئی سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی چیز نہ برداشت کی بلکہ برداشت کیں، اور مصیبتیں بھی جھیلیں لیکن اپنے جہاد کو اب سے نہ نہ ہوئے، ان کا مدار استدلال قرآن کریم کی یہ آیت تھی:

"والذین یکنزون الذھب والفضۃ فبشرھم بعذاب الیم" — یعنی جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں انھیں عذاب الیم کی بشارت دے دو!

حضرت ابوذرؓ نے یہ دعوت شام میں جو امیر معاویہؓ کا مرکز تھا، شروع کی تھی۔ یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ عوام نے اس دعوت کو لبیک کہا۔ اور دولت مندوں اور سرمایہ داروں کو اپنی پگڑی سنبھالنی مشکل ہو گئی!

حضرت عثمانؓ نے امیر معاویہؓ کی فریاد پر واپس بلا لیا، اور اپنے پاس رکھ کر ان کی کفالت کرنا چاہی، مگر ان کا جواب یہ تھا: "مجھے آپ کی دنیا سے کوئی

کوئی سروکار نہیں ہے!"

حضرت ابوذرؓ مزاج شناسِ رسولؐ تھے۔ جانتے تھے آپؐ کی رائے دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے بارے میں کیا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جبل اُحد کو دیکھ کر فرمایا:

"یہ پہاڑ اگر سونا بن جائے تو بھی میں پسند نہیں کرتا کہ تین دن سے زیادہ ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہ جائے۔ البتہ وہ دینار جسے میں نے قرض ادا کرنے کے لیے روک لیا ہو۔"

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: "دولت مند لوگ (بہ اعتبار نیکی) بہت کم ہیں، مگر وہ دولت مند جو اپنے مال کو اس طرح خرچ کرے۔"

یہ کہہ کر آپؐ نے دونوں ہاتھوں سے کھونچ بنا کر سامنے، داہنے، بائیں مٹھی بھر کر دینے کا نمونہ فرمایا (اور فرمایا) لیکن ایسے لوگ کم ہی ہیں۔"

پانی فروخت نہیں کیا جا سکتا: بخاری کے اسی باب میں تقریباً اسی مفہوم کی ایک دوسری حدیث بھی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔

آج بھی قحط میں پانی کی بہم رسانی اور استحقاق سے زیادہ پانی کے استعمال یا پانی کو روک کر بیچنے یا اس کی قیمت لینے کا رواج ہے۔

لیکن اسلامی سوشلزم ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیتا ہے:

۱۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زائد از ضرورت پانی فروخت کرنے سے منع کیا ہے۔

۲۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے پانی کو عباد و بہائم کے درمیان مشترک پیدا کیا ہے۔ اس لیے اس باب میں کوئی بھی ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ اگر چہ دوسرے کا پانی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ پانی کا زیادہ مستحق ہے کنواں بنانے والے سے!

۳۔ پانی جو ہمسایہ اپنے جانوروں کی حاجت سے جو پانی زیادہ ہو، اور

جس کے دوسرے آدمی اور بہائم محتاج ہوں، بغیر کسی معاوضہ کے ہر شخص ایسے پانی پر آسکتا ہے - اسے پی سکتا ہے۔ اور اپنے جانوروں کو پلا سکتا ہے، پانی کا مالک منع نہیں کر سکتا ہے نہ وہ کوئی معاوضہ لے سکتا ہے۔

۴ - اثرم کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، ان سے سوال کیا گیا کہ کچھ لوگوں کے درمیان ایک نہر بہتی ہے جس سے وہ اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں - ایک دن یہ، دو دن وہ، اس تقسیم حصص پر اتفاق ہے - ایک دن جب میری باری آتی ہے تو میں پانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں، اور چند روپے کرایہ لے کر کسی دوسرے کو دے دیتا ہوں -

ابو عبداللہ رضی اللہ نے کہا، میں نہیں جانتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی بیچنے سے منع فرمایا ہے! -

کہا گیا کہ وہ پانی نہیں بیچتا، کرایہ پہ دیتا ہے -

ابو عبداللہ نے کہا کہ یہ ایک حیلہ ہے تاکہ ایک غلط چیز کو اچھا رنگ دیا جا سکے، ورنہ یہ چیز بیع کے علاوہ اور کیا ہے؟[۹۸]

ابطال ملکیت زمین : فاطمیوں نے اپنے عہد حکومت میں جو کام کیا ان کے فقہا نظر سے غائب ہو اور شرعی تقاضا ابطال ملکیت زمین کے حق میں فیصلہ کر دیا، اور اسی پر عمل درآمد ہوتا رہا -

دیوان جیش سے متعلق دو دیوان میں ایک دیوان اقطاع تھا جو فوجیوں کو حسب ضرورت زمین اور جاگیر عطا کرتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ عام طور پر یہ جاگیریں ان لوگوں سے حاصل کی جاتی تھیں جن کے پاس فاضل بچتی تھیں یا کسی سبب سے ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اسی طرح اسماعیلیوں نے ابطال ملکیت زمین کی بنیاد شرکتوں کی بنا پر ڈال دی تھی۔ جیسے وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کو حق سے انتفاع کا حق دیا جاتا تھا، ملکیت کا نہیں۔ وفات کے بعد پھر قبضہ کی ہو جاتی تھیں۔ یہ

جاگیریں اور زمینیں نہ منتقل ہو سکتی تھیں۔ نہ ان میں وراثت چلتی تھی۔

فاطمی خلفاء کی طرف سے جن لوگوں کو جاگیریں اور زمینیں عطا ہوتی تھیں، وہ انھیں زرخیز اور شاداب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، بنجر زمینیں قابلِ کاشت بن جاتی تھیں، ان کے سینہ میں جو معادن چھپے ہوتے تھے وہ برآمد کر لیے جاتے تھے۔ ان سے بعض زرعی صنعتوں کی داغ بیل ڈالی جاتی تھی۔[۱۰]

حضرت ابوبکر رضؓ صدیق خلیفہ اوّل نے وقت وفات اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں تاکید کی کہ بدن پر جو کپڑا ہے وہی دھو لیا جائے۔ حضرت عائشہ رضؓ ضبط نہ کر سکیں فرمایا۔ "یہ تو بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کفن تو نئے کپڑے کا ہونا چاہیے!"

یہ سُن کر حضرت ابوبکر رضؓ نے جواب میں فرمایا! "میرے لیے یہ بوسیدہ کپڑا کافی ہے۔ نئے کپڑوں کی ضرورت زندوں کو ہوا کرتی ہے۔[۱۱]"

دنیا کی کسی سوشلسٹ حکومت کے سربراہ نے کیا کوئی ایسا اسوہ چھوڑا ہے؟

حضرت علی رضؓ اکثر بازار کا گشت کرتے، تاجروں اور سوداگروں کو اچھا اور سستا مال بیچنے کی تلقین کرتے، کبھی ایسی دکان سے مال نہ خریدتے جس کا مالک انھیں پہچانتا ہو۔ ایک مرتبہ بھیس بدل کر نکلے۔ دو دوکانداروں نے اس کے باوجود بھی پہچان لیا، اب تیسری دکان پر پہنچے، جہاں باپ کے بجائے ایک طفل نوخیز بیٹھا تھا، اس سے تین درہم میں ایک قمیص خریدی، وہیں اسے پہنا، اور تشریف لے گئے۔ باپ جب آیا تو اسے پتہ چل گیا، دوڑا دوڑا حاضر ہوا، اور ایک درہم واپس کرنے لگا کہ یہ زیادہ ہے۔ مگر آپ رضؓ نے جواب دیا، یہ سودا تو باہمی رضامندی سے ہوا ہے لوٹ نہیں سکتا۔[۱۲]

کسی سوشلسٹ ملک میں کوئی ایسا سربراہِ مملکت بھی ہے؟ کیا اس کے بعد بھی ہمیں سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کا پرچم بلند کرنے کی ضرورت ہے؟

ماخذ:

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث عن زبیر بن عوام، عن ابی ہریرہؓ، وعن خباب بن جبلہ، و عن عائشہؓ۔ نیز سنن ابی داؤد، کتاب الامارہ، سنن ترمذی، کتاب الاحکام، ملاحظہ ہو کتاب الاحکام، کتاب القضیہ۔

۲۔ طبری، ج ۴، ص ۱۹۱ ۳۔ کتاب الاموال (ابوعبید) ص ۲۰۷

۴۔ سورۂ توبہ پارہ ۱۰، رکوع ۵، آیت ۲۴۔

۵۔ البدایہ والنہایہ، ج ۵، ص ۱۳۔

۶۔ طبقات ابن سعد، ملاحظہ ہوں حالات ابوذرؓ

۷۔ صحیح بخاری، کتاب مدیون والحجر، عن ابی ذرؓ

۸۔ زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۳، ص ۴۹۸ - ۴۹۰، ۵۹۰، ۴۹۵۔

۹۔ تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام، ج ۱، ص ۲۸۔

۱۰۔ النجوم الزاہرہ، ج ۵، ص ۳۱۳

۱۱۔ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۳۶

۱۲۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۴۔

(۱۵)

اسلامی سیکولرازم

"اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح میرے نزدیک چند در چند غلط فہمیوں کی موجب بن سکتی ہے، لیکن "اسلامی سیکولرازم" یقیناً ایسی چیز ہے جو درست اور بجا بھی ہے اور جس پر فخر بھی کر سکتے ہیں۔

سیکولرازم کا مطلب بعض لوگ "لامذہبی" لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس سے مراد "مذہبی غیر جانبداری" ہے۔ یعنی صحیح معنی میں وہ حکومت سیکولر کہلائی جا سکتی ہے، جو اکثریت رکھنے کے باوجود اپنے مذہب کے آئین، شعائر، رسوم میں مداخلت نہ کرے اور اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو وہ سیکولر نہیں کہلا سکتی۔ وہ بدترین قسم کی مذہبی حکومت ہے اور مذہب میں اتنا کٹر پن مذہب کا استخفاف بھی ہے۔ عقل عامہ کا بھی اور انسانیت کا بھی۔

فکری بددیانتی اور ذہنی نفاق: اس زمانے میں کسی حکومت کا مذہبی ہونا معیوب بن گیا ہے۔ مذہبی حکومتیں، مذہبی بنتے ہوئے بھی، اپنے مذہبی ہونے سے انکار کرتی ہیں، تاکہ سیکولرازم کا نقاب اوڑھ کر اپنے آپ کو مقبول کرا سکیں۔ حالانکہ یہ فکری بددیانتی اور ذہنی نفاق کی انتہائی افسوسناک مثال ہے۔ کوئی مذہب ہے جو کذب و دروغ کی تعلیم دیتا ہو؟ ایک طرف مذہب پر یہ تعصب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ شعوان، مشروب، مقبور، ان کے وسائل

حیات مسدود، ان کے لیے مساوات مفقود، امور مملکت میں ان کا حصہ حد درجہ محدود اور دوسری طرف سیکولرازم کا ذہنی تحفظ کے ساتھ غلط اور خلافِ حقیقت اعلان!

اسلام نے یہ راستہ نہیں اختیار کیا ہے۔

اسلامی حکومت کا اختصاص: اسلامی حکومت فخر کے ساتھ اپنے مذہبی ہونے کی مقر ہوتی ہے اور اتنے ہی فخر کے ساتھ اپنی مذہبی غیر جانبداری یعنی سیکولرازم کی بھی مقر ہوتی ہے، وہ اپنے ابنائے ملت کے ساتھ خالص مذہبی حکومت ہے، ان کے لیے نماز قائم کرے گی، حلال و حرام کی پابندی کرائے گی۔ اسلامی حدود و تعزیرات کا ان پر اجرا کرے گی، ان سے زکوٰۃ لے گی، انھیں منظم کرے گی۔ ان کی اصلاح کرے گی۔ لیکن غیر مذاہب والوں کے پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی، اپنے شعائر، رسوم، تہذیب و تمدن، ثقافت زبان، کوئی چیز بھی ان پر مسلط نہیں کرے گی، انھیں مساوات کی نعمت سے آشنا کرے گی۔ انھیں انسانی حقوق عطا کرے گی، ان کے مذہبی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی، ان کے تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارے آزاد اور خود مختار ہوں گے۔ ان کے معابد پر کسی طرح کا کنٹرول نہیں رکھے گی ان کے مذہبی منصب داروں سے کوئی تعرض نہیں کرے گی۔ مذہبی اداروں اور مذہبی منصب داروں کا قرار واقعی احترام کرے گی۔ ان کے ساتھ جو عہد و میثاق ہوگا، ہر قیمت پر اسے بجا لائے گی۔ انھیں وسائل حیات سے محروم نہیں کرے گی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے ساتھ زیادہ مراعات ملحوظ رکھے گی۔ انھیں کسی قیمت پر یہ محسوس نہیں ہونے دے گی کہ وہ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔

سیکولرازم عمل کی زبان میں: جو حکومتیں خالص مذہبی ہونے کی مدعی ہیں۔ ان کے ہاں بھی بعض ایسے مواقع آتے ہیں۔ جب یہ

والے کی قابلیت، اہلیت، استحقاق اور خدمات کو نظر انداز کر کے "ہم مذہب" کو صدارت بالا سے محروم ہونے کے باوجود ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً فرانس میں کوئی یہودی صدر مملکت نہیں بن سکتا۔ امریکہ میں کوئی حبشی صدر تو بڑی چیز ہے، وزیر خارجہ بھی نہیں بن سکتا۔ [illegible] جو سراپا سیکولر ہے کوئی مسلمان نہ "پوپ" کا لیڈر بن سکتا ہے، نہ وزیر اعظم، نہ صدر والا قدر۔ ہمارے پڑوسی ملک میں جو اپنے سیکولرازم کا اعلان گزشتہ ۲۰ سال سے بہ بانگ دہل کرتا چلا آرہا ہے۔ آج تک نہ کوئی مسلمان ہر طرح کی اہلیت، استحقاق، قابلیت اور خدمات جلیلہ کے باوجود مرکز یا صوبے کا وزیر اعظم بنا، نہ سپہ سالار عساکر کے منصب پر فائز ہوا، نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ گو "اصولی طور" پر ایسا ہو سکتا ہے لیکن اس اصول کو ہمیشہ ٹھکرا دیا گیا اور ہمیشہ ٹھکرایا جاتا رہے گا۔

اسلام نہ خود فریبی کو پسند کرتا ہے، نہ فریب کاری کو۔ وہ مذہبی غیر جانبداری پر تو سختی کے ساتھ قائم ہے، لیکن فی النفس مذہبی معاملات میں، وہ غیر مسلم کو مسلم پر ترجیح نہیں دیتا اور اپنے اصول کو [illegible] کرتا ہے، جو منصب خالص اسلامی اور مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان پر وہ کسی غیر مسلم کو فائز نہیں کر سکتا۔ لیکن جو منصب دفاع ملکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا دروازہ اپنی رعایا کے غیر مسلموں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ایسے مواقع پر کوئی غیر مسلم اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے نہ ہو مسلمان۔ لیکن اگر صلاحیت، قابلیت، اہلیت، استعداد اور استحقاق رکھتا ہے تو ضرور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

اسلامی سیکولرازم: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر اسلام کے سیکولرازم پر بھی ڈال لی جائے کہ آیا واقعی وہ ایک مذہب ہونے اور معاملات و مسائل پر مذہبی نقطہ نظر رکھنے کے باوجود مذہباً سیکولر ہے؟ واقعات اور

حقائق کا جواب یقیناً اور بلاشبہ ثبات میں ہے۔ اور یہ ایسے واقعات و حقائق ہیں، جو تاریخ کے ایوان میں بقائے دوام کا خلعت پہن کر غیر فانی بن چکے ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان احد من المشرکین استجارک فاجره حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغه مأمنه ذلک بانهم قوم لا یعلمون"

یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ خواہ ہو تو اس کو پناہ دو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے کلام خدا کو سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ واپس پہنچا دو، یہ سلوک اس لیے کرنا ضروری ہے کہ یہ مشرک ناواقف لوگ ہیں۔

حماوی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: "کافر کو اس کے مقام امن تک پہنچا دو، یعنی گر دعوت اسلام سننے کے بعد واپس جانا چاہے اور اگر نہ قبول کرے تو اسے اس قوم تک حفاظت سے پہنچا دو، تاکہ بعد میں وہ اطمینان کے ساتھ خالی الذہن ہو کر معاملہ پر غور کر سکے۔"

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ "پناہ طلب کرنے والا" وہ ہے جو بات چیت کا خواہاں ہو۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے لوگوں کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص امان طلب کرے تو اسے امان دے دینا جائز ہے، تاکہ وہ اسلام کی صحت و صداقت کے دلائل سن سکے، کیونکہ اللہ کی طرف سے دلائل کے بیان کے بعد اس کو مہلت دینا واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ تم سے طلب امن کرے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے، جس میں اس کے لیے ہدایت ہے، اور تاکہ وہ اللہ کی کلام سن لے جس میں اس کے لیے ہدایت ہے، اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت نبوت کی دلیلیں ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی کافر اللہ کے بیان توحید اور نبیؐ کی صحت نبوت کے بارے میں دلیل و برہان کا مطالبہ کرے تو ہمارے لیے اس کا قتل کر دینا ناجائز ہے، جبکہ اس سلسلہ میں وہ ہم سے طالب امن ہوا ہو۔ بجز اس صورت کے کہ ہم دلیلیں بیان کر چکیں، اور حجت قائم کر لیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اسے امان دیں۔ یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے۔ اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی ہم سے امور دین کی تعریف وتبیین چاہے تو ہم اسے تعلیم دیں اس لیے کہ وہ کافر ہمارے پاس اس لیے پناہ گزین ہے کہ صحت دین کی معرفت حاصل کر سکے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ:

"پھر اسے اس کے مأمن میں پہنچا دو" دلیل ہے اس بات کی کہ مستجیر کی حفاظت امام وقت پر واجب ہے۔ اور لوگوں کو اسے گزند پہنچانے سے روکنا فرض ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ: "اسے امان دو"

اور خدا کے اس قول سے کہ اسے اس کے مأمن تک پہنچا دو۔ یہ دلیل بھی نکلتی ہے کہ امام وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ اہل ذمہ کے جان ومال کی حفاظت کرے۔ انھیں کسی طرح کی اذیت نہ پہنچنے دے اور انھیں ہر طرح کے ظلم و جور سے بچائے۔[۱۲]

دشمن کا اعتراف: اصل یہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں۔ چنانچہ کرنل جیمس بیکر کی کتاب ذیل کا یہ بیان خاص طور پر قابل ذکر و مطالعہ ہے لکھتے ہیں: "ایک شخص جارج برنیکا وچ نے جو گریک چرچ کا پیرو تھا ایک رومن کیتھولک شخص جیانوس سے پوچھا کہ اگر تم فتح یاب ہوتے تو کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا: "تمام باشندوں کو جبراً رومن کیتھولک بناؤں گا!" اس کے بعد برنیکا وچ سلطان ترکی کی خدمت میں گیا، اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ میں ہر مسجد کے قریب ایک گدھا بناؤں گا، اور تمام

لوگوں کو اجازت دوں گا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجدوں میں سجدہ کریں یا گرجاؤں میں صلیب کے سامنے جھکیں۔

جب اہل سرویا نے یہ سنا تو انھوں نے لٹسن جرج کے محکوم بننے کے مقابلہ میں سلطان کی رعایا بننا زیادہ پسند کیا۔

یہ سلطان محمد ثانی کا ذکر ہے، ان کے عہد میں بوسینیا اور بلغاریہ کے بہت سے اعیان و اشراف نے اسلام قبول کیا۔

لا اکراہ فی الدین: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں

اس آیت کی شان نزول علامہ جصاص نے یہ بتائی ہے:

"انہا نزلت فی بعض ابناء الانصار کانوا یہودیا ما جاؤھم اکرہوا علی الاسلام" یعنی یہ آیت کریمہ بعض انصار کے بچوں کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے جو یہودی ہو گئے تھے اور ان کے باپ انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔

پھر آگے چل کر اس بارے میں علامہ موصوف ایک شبہ رفع فرماتے ہیں، اس آیت کے ظاہر بیان سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ گویا خبر یا مشورہ ہے، وہ فرماتے ہیں:

"لا اکراہ فی الدین امر فی صورۃ الخبر" یعنی اکراہ کی آیت خبر کی صورت میں امر ہے[۵۳]

اسلام نے قتل کی سزا خصاص رکھی ہے:

"ان النفس بالنفس والعین بالعین الخ" یعنی جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ[۵۴]

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے تو قتل کر دیا جائے گا۔

ایک ذمی اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے، تو وہ بھی قتل کیا جائے گا۔

ایک مسلمان اگر ایک ذمی کو قتل کر دے تو قطعاً قتل کر ڈالا جائے گا۔

"کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" یعنی مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص واجب کیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل کے سلسلے میں مفسر ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

"مقتول ذمی کے بدلہ میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے، کیونکہ ان حقوق میں ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے، اور قصاص کے واجب ہونے کی حکمت سب میں ہے سب میں!"

عام معاملات میں مسلم و کافر برابر ہیں: اس آیۂ کریمہ کی رو سے، ان معاملات میں ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں، قصاص کا حکم دونوں پر یکساں ہوگا۔ اور اس پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ جو شخص قتل ہوا اور ہم نے اس کے ولی کو دعوے کا حق دیا ہے۔"

قرآن مجید کی آیت ہے:

"ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکیناً ویتیماً و اسیراً"

علامہ جصاص نے اس آیت سے استشہاد کیا ہے کہ اس آیت میں جنگی قیدیوں سے یہ کافر و مشرک نہیں ہیں، اور فرماتے ہیں:

"قیدی سے تمام پر ہے کہ مشرکوں کو صدقہ دینا جائز ہے، اور ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقے کی رقم انہیں دی جا سکتی ہے۔"

پھر آگے چل کر علامہ موصوف امام ابوحنیفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ زکوٰۃ کے سوا ہر صدقہ اہل ذمہ کو دیا جا سکتا ہے البتہ زکوٰۃ اہل ذمہ پر نہیں صرف کی جا سکتی، مگر کفارہ، نذر اور صدقۂ فطر کی رقمیں اہل ذمہ کو دی جا سکتی ہیں۔"

آنحضرتؐ کا استفتاء کا حکم ایک یہودی کے لیے: یہودیوں کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استفتاء کا حکم: علامہ ابوبکر جصاص لکھتے

کریمہ "ولا تکن للخائنین خصیما" (یعنی خیانت کرنے والوں کی پاسداری مت کرو) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ یہ اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک زرہ چرالی تھی۔ اور جب اندیشہ ہوا کہ چوری کھل جائے گی تو ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی۔ جب زرہ یہودی کے گھر میں پائی گئی، تو اس نے چوری سے صاف انکار کر دیا۔ اور اصل چور یہودی پر چوری کا الزام دھرنے لگا۔ اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہودی کے مقابلہ میں مسلمان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے قول کی طرف مائل ہو گئے۔ لیکن اللہ نے آپؐ کو اصل واقعہ کی اطلاع دے دی اور یہودی کو بری کر دیا۔ اور اس کے خلاف فیصلہ کرنے سے روک دیا۔ اور استغفار کا حکم دیا۔"[۱۱۱]

فتح مکہ کا اصل سبب معاہدہ شکن تھے: اس حقیقت پر شاید ہی کم لوگوں کی نظر ہو گی کہ فتح مکہ کا اصل محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پاس عہد تھا جو آپؐ نے شرک قبیلہ بنو خزاعہ سے کیا تھا۔ اگر بنو بکر خزاعہ پر یورش نہ کرتے، اور قریش کی خلاف عہد بنو بکر کی مدد نہ کرتے، تو شاید فتح مکہ اس قدر جلد عمل میں نہ آتی۔ قریش کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشرک حلیف کے لیے مسلمانوں کی جان قربان نہیں کریں گے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خزاعہ کی حمایت میں جہاد کرنے کو تیار ہیں تو وہ گھبرائے۔ اور ابوسفیان کو بھیجا کہ تجدید صلح ہو جائے مگر وہ نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ پیمان شکنوں پر بار بار اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔[۱۱۲]

حاکم یمامہ مہاجر بن امیہ کے پاس چند لوگ دو عورتوں کو گرفتار کر کے لائے۔ ان میں سے ایک مسلمانوں کے خلاف ہجو سے بھرے ہوئے گیت گایا کرتی تھی۔ حاکم یمامہ نے سزا قطع ید اور دانت نکلوانے کی دی۔

بات خلیفۃ اللہ صدیق اکبرؓ تک پہنچی، انھوں نے حاکم یمامہ کو لکھا:

"وہ عورت جو مسلمانوں کی ہجو کیا کرتی ہے، اگر دعویٰ اسلام رکھتی ہے تو اس کی تادیب کرنا اور سرزنش کرنا چاہیے تھا، ہنوز نہ کاٹنا چاہیے تھا، اور اگر ذمی ہے تو یہ (ہجو مسلمین) شرک سے زیادہ بُرا فعل نہ تھا، جب اس کا شرک برداشت کیا جا سکتا ہے تو اس فعل کو بھی گوارا کرنا چاہیے تھا۔ قصاص کے سوا کسی اور جُرم میں ہاتھ کٹوانا میں مکروہ خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح کی سزا پانے والے کو ہمیشہ شرم دامنگیر رہتی ہے"[۱۳]

مسلمانوں اور یہودیوں کا معاہدہ: عہدِ رسالت میں اور اس کے بعد بھی اسلام اور داعی اسلام کے بدترین دشمن یہودی رہے ہیں لیکن ان سے بھی ہم قومی کی بنا پر معاہدۂ امن کرنے میں آپؐ نے تامل نہیں فرمایا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد جو معاہدہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہوا، اس کے خاص خاص حصص یہ ہیں:

۱۔ بنی عوف کے یہودی، اور مسلمان ایک قوم شمار ہوں گے۔

۲۔ طرفین میں سے اگر کسی سے بھی کوئی جنگ آزما ہوا تو دونوں اس کے خلاف نبرد آزما ہوں گے۔

۳۔ طرفین کے مراسم باہم دگر خیر سگالی اور خیر خواہی پر مبنی ہوں گے۔ معصیت اور گناہ پر نہیں۔

۴۔ دوران جنگ میں یہودی، صرف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہیں گے۔

۵۔ جن قبیلوں کی یہودیوں سے دوستی ہے، ان کے حقوق بھی یہودیوں کے برابر مسلمان مقرر کریں گے۔

۶۔ طرفین ایک دوسرے کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

۷۔ مظلوم کی امداد اور پشت پناہی کی جائے گی۔

۸۔ اختلاف کی صورت میں فیصلہ خدا اور رسولؐ کے ہاتھ میں ہوگا[۱۴]

اہلِ نجران (عیسائیوں) سے آپؐ نے جو معاہدہ فرمایا تھا، وہ اس لیے خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ آپ مسلمان ایک طاقتور حکومت بن چکے تھے، حاجز و بے دست و پا نہ تھے لیکن ان سے معاہدہ ہوا اور ایسا معاہدہ ہوا جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ: یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا وہ وقت سامان کمزور تھے لیکن نجران کے عیسائیوں سے آپؐ نے جو معاہدہ کیا وہ اس وقت جب مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار تھا، زمام و عنانِ حکومت تھی، فتوحات کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، ایسے ہی مواقع پر انسان کا دروازہ کھلتا ہے، طاقت ور کمزور کی آزادی ہی نہیں چھینتا۔ فکر و خیال اور عقیدے کی آزادی بھی سلب کر لیتا ہے۔

معاہدہ قوموں سے زبردست اور باجبروت قوموں کی ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ جب حالات اور معاملے کا تقاضا ہوگا، ہماری فوجیں تمہاری سرزمین پر چڑھ جائیں گی اور دشمن سے لڑیں گی اور تم کو یہ اجازت دینا پڑے گی اور جو کرنا ہوتا ہے اسے بے چون و چرا یہ شرط مان لینی پڑتی ہے ؎

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی کوئی شرط نہیں کی۔

معاہدے کی رُو سے:

۱۔ نجران اور مضافات کے باشندوں کی جان، زمین، جائداد، مذہب، اہلِ نجران کے حاضر اور غائب، ان کے جانور، ان کے قاصد، ان کی عبادت، ان کی عبادت گاہیں، اللہ کی امان اور محمد رسول اللہ کی حمایت میں ہیں۔

۲۔ نہ ان کا کوئی پادری اور نہ ان میں تبدیلی کی جائے گی۔

۳۔ نہ کسی حق سے دست اندازی کی جائے گی۔

۴۔ نہ کسی حالت میں سختی کی جائے گی۔

۶۔ کوئی مقف استقفیت سے، کوئی راہب راہبانیت سے، اور کوئی
دانشمند دانشمندی سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔
۷۔ جو کچھ کم زیادہ تمہارے قبضے اور تصرف میں ہے، اسے بدلا نہیں
جائے گا۔
۸۔ تم سے جاہلیت کے کسی جرم کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔
۹۔ نہ فوجی خدمت پر لگایا جائے گا۔
۱۰۔ نہ کوئی لشکر تمہاری سرزمین کو پامال کرے گا۔
۱۱۔ اگر کوئی اپنا حق تم سے طلب کرے گا، تو دونوں کے درمیان انصاف
کیا جائے گا۔
۱۲۔ نہ تم پر ظلم کیا جائے گا، نہ تمہیں ظلم کرنے دیا جائے گا۔
۱۳۔ تم سے کسی کے خلاف کسی دوسرے کے جرم میں کوئی مؤاخذہ نہیں
کیا جائے گا۔
۱۴۔ امن ہمارے ساتھ ہے جس نے فساد پھیلانے کی کوشش کی، وہ
میری ضمانت سے خارج ہے۔

اس معاہدے کی اور اس طرح کے دوسرے معاہدوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستخط ہیں اور خلفائے راشدین کے زمانے میں پوری پوری تعمیل کی جاتی رہی۔ ان میں کسی طرح کا تغیر اور تبدل نہیں کیا گیا، نہ انہیں منسوخ کیا گیا۔

ایک نسطوری کی تحریر: اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بطریق نسطوری [illegible] (نسطوریہ) [illegible] (۶۵۸ء) نے [illegible] کی سرداری پر [illegible] کے عہد میں براہ راست قائم رہا۔ اس نے لکھا ہے:

"عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حکومت سونپی ہے۔ یہ ایک نصرانیت کے دشمن نہیں ہیں بلکہ ہمارے دین اور مذہب کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔"

ہمارے رہبروں، پادریوں اور کاہنوں کی عزت و تکریم میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے، ہمارے دیباء رئیسے ان کی امداد و اعانت کے مرہونِ منت ہیں۔

ایک اور اس نسطوری قائد کی تحریر ہے جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اسقفوں کو مکمل اختیارات اپنے دینی، قومی اور نجی معاملات میں حاصل تھے۔ وہ بغیر کسی خوف اور اندیشے کے اپنے اعمال مذہبی انجام دیتے تھے۔

"کیا اس اسلامی اسکولرازم کا مقابلہ آج بھی دنیا کی کوئی سیکولر حکومت کر سکتی ہے؟"

ماخذ:

۱ سورۂ توبہ، رکوع ۱، آیت ۶ ۲ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۳۰۰

۳ ۴ سورۂ بقرہ، رکوع ۳۴، آیت ۲۵۸

۵ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۳۶۲، ۶ سورۂ مائدہ، رکوع ۷، آیت ۳۰

۷ احکام القرآن (جصاص) ج ۱، ص ۱۶۷، ۸ سورۂ قدر، رکوع ۱، آیت ۵، پارہ ۳۰

۹ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۵۷۸

۱۰ سورۂ نساء، پارہ ۴، رکوع ۱۶، آیت ۱۰۶، ۱۱ احکام القرآن (جصاص) ج ۱، ص ۱۰۰ طبع مصر

۱۲ سیرۃ ابن ہشام، ۲۳۰ (ذکر فتح مکہ) ۱۳ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۱۰۷

۱۴ سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۷۸،

۱۵ فتوح البلدان (بلاذری) ج ۱، ص ۱۰۳-۱۰۵

۱۶ یعقوبی، ج ۲، ص ۶۲

۱۷ تاریخ خوارزمی (عمر بن الخطاب) طبع بیروت، ص ۴۹

(۶)

حاکمیتِ عوام اور مسئولیتِ حاکم

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"وما کان ربک لیھلک القریٰ بظلم و اھلھا مصلحون" (یعنی یہ نہیں ہوتا کہ کسی بستی کے باشندے نیکوکار ہوں اور صلح جو ہوں، اور تمہارا رب انہیں از راہِ ظلم ہلاک کر دے!)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

"ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" (یعنی زمین کی حکومت میرے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہے!)

ان دونوں آیتوں سے یہ منتج ہوتا ہے کہ جن بستیوں کو خدا کی حکومت ملی اور جہاں کے باشندوں کو یہ کہہ کر بھیجا گیا، وہ نیکوکار ہی رہ گئے تھے، نیز یہ کہ خدا کی اس زمین پر حکومت اور فرمانروائی کا حق اللہ کے انہی بندوں کو ہے جو نیک اور صالح ہوں، یعنی فساد و جور سے مجتنب رہتے ہوں اور انسانی و نسبتہً اخلاق اور آدابِ حیات کے حدود و شرائط پر عامل ہوں، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ نہ ظالم ہوں، نہ مظلوم!

نہ ظالم ہونے کے معنے یہ ہیں کہ دوسروں کا حق نہ چھینیں، اور نہ خلافِ مصلحت سے مراد یہ ہے کہ قوم برداشت کریں، اور ان دونوں میں سے کوئی بات بھی بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ نہیں!

حقوق عامہ کی نگہداری اور پاسبانی: پس ظالم اور مظلوم نہ بننے کی صورت یہ ٹھہری کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہو، جو ظلم و تعدی کو ناموجود کر دے۔ اور یہ معاشرہ ایسی حکومت قائم کرے، جہاں کوئی کسی پر زیادتی نہ کر سکے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

اس طرح کا معاشرہ صرف اسی طرح عالمِ وجود میں آسکتا ہے اور اس طرح کی مثالی حکومت صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ حاکم اور محکوم، راعی اور رعایا، عوام اور حکمران کے مابین ایسا رشتہ قائم ہو جائے جو ایک دوسرے کے حقوق و حدود کی نگہداری اور پاسبانی کرے۔ اور کسی کو بھی حدود سے متجاوز نہ ہونے دے۔ اور یہ رشتہ ایسی صورت قائم ہو کہ اقتدار رکھنے والا اپنے آپ کو مسئول اور جوابدہ سمجھتا رہے۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک چیز نہیں ہے تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ حاکم اور محکوم کے مابین بعد پیدا ہو چکا ہے اور یہ کسی وقت بھی کوئی المناک رُخ اختیار کر سکتا ہے۔

عوام کی حاکمیت اور حاکم کی مسئولیت: اسلام کا جہاں تک تعلق ہے، اس نے دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ عوام کی حاکمیت اور حاکم کی مسئولیت تسلیم کی ہے۔ قرآن کریم میں شوریٰ کا جو حکم دیا گیا ہے اور احادیث نبویؐ میں سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کو افضل جہاد سے جو تعبیر کیا گیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی روشن برہان ہے۔

قرآن و سنت کے علاوہ اسوۂ خلفائے راشدین سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے خلیفۂ رسولؐ بننے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں حاضرین سے فرمایا تھا:

"اگر میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو!"

حضرت عمرؓ جیسی باجبروت شخصیت کے بارے میں بھی ہماری نظر میں

گذر چکا ہے کہ ان سے ایک بدو نے کہا تھا:-

"اگر تم سیدھے رستے نہ چلے تو ہم تم کو تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے!"

اور اس پر حضرت عمرؓ نے خفا ہونے کے بجائے خدا کا شکر ادا کیا تھا، کہ امتِ محمدیہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے حکمران کو تکلے کی طرح سیدھا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں اگرچہ کئی باتیں ایسی ہوئیں جو محلِ بحث و گفتگو بن سکتی ہیں لیکن یہ حقیقت بالکل واضح اور نمایاں ہے کہ انھوں نے مسئولیتِ حاکم، اور حاکمیتِ عوام کا اصول اپنے قول و عمل سے ہمیشہ تسلیم کیا، اور اس سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں بھی معلوم ہے کہ انھوں نے اس اصول کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی رہے۔ قتلِ عثمانؓ کے بعد جب ان سے خلافت قبول کرنے کی استدعا کی گئی تو انھوں نے تین دن تک صرف اس لیے یہ گراں بار ذمے داری کو قبول نہیں کیا کہ عوام و رجحان طبع اچھی طرح معلوم کر لیں۔ جب دیکھا کہ لوگ ان کے سوا کسی طرف رخ نہیں کرتے ہیں، تب کہیں جا کر خلیفہ بننا منظور کیا۔ ہم تو واقعہ تحکیم کو بھی اسی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اگر حکمین کے فیصلہ کو تسلیم کر لیتے تو اپنے اور دنیا کے خیال میں حکم کا فیصلہ قبول کرتے، نہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو حکم بنانے پر راضی ہوتے۔

طبری کی روایت: حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں طبری نے لکھا ہے کہ ابوعبیدہؓ سے مروی ہے کہ جب تک اہلِ یمن کی بیعت کی اطلاع نہیں آئی، اور اس اطلاع کے آنے میں چھ مہینے لگے، اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ نے حقوقِ خلافت کا باقاعدہ استعمال نہیں فرمایا۔[۹۳]

اس میں مصلحت یہ تھی کہ جملہ قطعاتِ خلافت کی توثیق ہو جائے اور سب لوگ اسے تسلیم کر لیں۔ ہاں ہم آپ کے دورِ خلافت میں آپ پر کئی جگہیں بھی ہوئیں۔ رد و کد بھی ہوئی اور آپؓ نے کسی چیز کو برا نہیں مانا بلکہ خوش دلی

اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان چیزوں کو برداشت کیا۔ آپ نکتہ چینی اور اختلاف احتساب کو جانشین رسول ؐ کی حیثیت سے روک نہیں سکتے تھے کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہی تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ احتساب کو امت کے لیے بعض ائمہ نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا مسلک: حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت کو زینت دی۔ حاکمیت عوام اور مسئولیت حاکم کے نظریے پر وہ بھی عامل رہے انھوں نے اپنی تقریر میں خود فرمایا تھا: "عام لوگ اس شخص کے تابع ہیں جسے انھوں نے والی حکومت قرار دیا ہے۔ اور جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ اور جو ولی حکومت ہے، وہ ذی رائے اصحاب کا تابع ہے"[1]

ان الفاظ کی معنویت پر بطور خاص غور کرنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ جیسی ہستی کے منہ سے ان الفاظ کا سننا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مطلق العنان نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف شوریٰ پر مجبور ہے بلکہ اصحاب شوریٰ کے فیصلے کے آگے سر جھکانے پر بھی مجبور ہے۔ عوام گرامی قدر ہیں اس کے تابع ہیں، تو وہ بھی اصحاب شوریٰ کا تابع ہے۔ اس دوسری تابعیت کا نام خلافت ہے۔

عمر ابوالنصر نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں، مثال ایک بات بڑی دلچسپ اور اہم بھی لکھی ہے:

عوام کے افکار و آراء کا اثر تشکیل حکومت پر: "انقلاب فرانس نے اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیا کہ عوام کے سیاسی افکار و آراء حکومت کی تشکیل میں کوئی اثر رکھتے ہیں یہ ایک ایسا جدید سیاسی نظام تھا جو ان جماعتوں کی تعلیمات سے بہت قریب تھا جو اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ کیونکہ جمہوری نظام ہی تھا جو نظام انتخاب کا جس میں ان کے حقوق محفوظ رہ سکتے تھے اور ان کے افراد قبیلہ اور خاندان کی

تحقیر کے بغیر مسندِ خلافت پر پہنچ سکتے تھے۔ اس نظامِ جدید کی رُو کوئی مسلمان خلافت کا امیدوار اور سزاوار قرار دیا جا سکتا تھا، جس طرح سلطانِ عامہ کسی خلیفہ کو معزول کر سکتی تھی۔ اسی طرح راستے عامہ کے بل پر خلیفہ بن بھی سکتا تھا۔

لیکن خوارج کا یہ رویہ اپنا نہ تھا، بلکہ ان کی پیدائش اسلام سے قریب تر تھی۔ دوسرے الفاظ میں خوارج نے خواہ کتنی ہی ڈینگیں کھائی ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے منصبِ خلافت کے لیے خاندان اور قوم کی تخصیص منکر ایک بہت بڑا اسلامی نظریہ ایجاد کیا تھا، اسے یقیناً ان کا وسیع ترین کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

امام ابو یوسف کا خطاب ہارون رشید سے: امام ابو یوسف رح نے جو امام ابو حنیفہ رح کے اجل تلامذہ میں تھے اپنی کتاب میں خلیفہ ہارون رشید کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رعیت کا مالک نہیں، بلکہ مالک صرف خدا ہے، اور وہ نفسِ خدا کا خلیفہ ہے!

[illegible] نظر و نسق میں کا اصول حکومت، اس کا طریق کار [illegible] ہوگی، جو [illegible] مالک کے منشا اور مرضی کے مطابق ہو، اور کہ اس کے خلاف ہوں تو وہ اپنے منصب کا استحقاق کھو بیٹھے گا۔ پس خلیفہ جب خدا کا خلیفہ ٹھہرا تو وہ ان احکام و حدود سے دگرداں اور منحرف نہیں ہو سکتا، جو خطے بنا کے [illegible] فرماتے ہیں۔ جب تک خلیفہ ٹھیک ٹھیک ان پر عمل کرتا ہے اس کی اطاعت [illegible] فرض ہے لیکن اگر اس راہ صواب سے [illegible] خوف ہوتا ہے تو اس کی منصب بھی کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] خلیفہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی خدمت داری پر مقرر رہے تو معزول بھی کیا جا سکتا ہے!

حالات کی تبدیلی کے ساتھ نظامِ حکومت کی تبدیلی: البتہ یہ ضرور ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ نظامِ حکومت

دستور میں کبھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسلام میں اس چیز کو بطریق احسن پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اصولی اور بنیادی باتیں تو بتا دی ہیں، لیکن اجمال کی تفصیل خود امت پر چھوڑ دی ہے کہ وہ حالات و مقتضیات زمانہ کے مطابق اسی خاکے میں وہ خود رنگ بھرے۔

علامہ عبدالوہاب خلاف نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے یہی خیال ظاہر کیا ہے، چنانچہ شوریٰ کے موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"خدا نے شوریٰ کا حکم دیا ہے، لیکن اس کی تفصیل کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے، تاکہ ہر امت کے ارباب کار اپنے احوال و ماحول کی رعایت سے اپنے آدمیوں کے لیے ایک نظام انتخاب قائم کریں۔ اس کے شرائط و ضوابط طے کریں کہ کون منتخب ہوگا، کس طرح منتخب ہوگا، انتخاب کی صورت اور نوعیت کیا ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

نظام مسئولیت: یہی حال نظام مسئولیت کا ہے، حکومت کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہے، لیکن اس مسئولیت کی تفصیل نہیں فرمائی گئی ہے، یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ ہر ملک اپنے حالات و ماحول کے مطابق اسے وضع کرے۔[۹]

لیکن اپنے حالات و ماحول کے مطابق شوریٰ کی جو تفصیل وہ مرتب کرے گی، ظاہر ہے لازمی طور پر وہ کتاب و سنت کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی کہ حرف آخر کی حیثیت اسی کو حاصل ہے:

طاعت "حق" کے ساتھ ملحوظ رہے: تعمیل حکم کی صورت میں طاعت کو اولیت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "حق" کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بعد تم پر حکام متعین ہوں گے، نیک بھی نیکی کے ساتھ اور بد بھی بدی کے

ساتھ۔ مگر تم لوگ ان کے اس حکم کی جو "حق" کے موافق ہو۔ تعمیل کرو۔"

حاکمیت عوام کی شرعی و دینی حیثیت کا اندازہ حضرت خالدؓ کے ایک قول سے ہو سکتا ہے۔

خالدؓ بن ولید کا استغاثہ عامۂ مسلمین کی عدالت میں: حضرت عمرؓ نے جب حضرت خالدؓ سیف اللہ کو معزول کیا تو گو انھوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے منصب سے علیحدگی اختیار کر لی، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، تو صاف الفاظ میں رو در رو فرما دیا گیا:

"جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا، وہ حق و انصاف سے دور ہے، بہ خدا میں عامۂ مسلمین کے سامنے اس مسئلے کو پیش کروں گا! اور ان سے اس تعدی کا مداوا چاہوں گا!"

اور کوئی شبہ نہیں، حضرت خالدؓ کو اس کا حق تھا!

ماوردی کے نزدیک خلیفہ کو غالب ترین اکثریت کا معتمد ہونا چاہیے، اور یہ حق اس خلیفہ کے خلاف ہے جسے متفقہ طور پر یا غالب اکثریت سے عامۂ مسلمین نے یہ منصب سونپا ہو۔ کیونکہ جب تک یہ صورت نہ ہو، نہ امامت مکمل ہوتی ہے نہ خلافت۔ جیسا کہ علامہ ماوردی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے وضاحت اور صراحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"امیر یا خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ متفقہ یا کم از کم بہت بڑی **اکثریت کا معتمد ہو۔**

علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تک ہر شہر کے ارباب حل و عقد اسے اختیار نہ کریں امام نہیں ہو سکتا۔ اس شرط کو وہ اس لیے ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس کی امامت کو سب لوگ پسند کریں، اور متفقہ طور پر امامت کو اس **کے سپرد کر دیں۔"**

حاکمیت عوام اور مسئولیت حاکم کی ایک مثال حضرت عثمان ذوالنورینؓ

کا عہدِ خلافت بھی ہے :-

حضرت عثمانؓ کی فکر و رائے پر جب مروان وغیرہ نے غلبہ حاصل کر کے معاملات کو زیادہ سے زیادہ ابتر کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو مسلمانوں میں جتنی بھی بے چینی پھیلی اور وہ بار بار سختی اور درشتی کے ساتھ ان کی حکومت کے خلاف تنقید کرنے لگے، حضرت عثمانؓ نے کبھی کسی کا حق تنقید نہیں چھینا، بلکہ ہر نکتہ چینی کا جواب اپنے عقلہ نظرت سے کر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ جب معاملات نے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک صورت اختیار کر لی تو ایک سے زائد بار انھوں نے حضرت علیؓ کو واسطہ بنایا، اور عوام کے ساتھ خلوص اور سچائی کے ساتھ باہمی فیصلہ کر لیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن مروان نے اس راج کی ہر تدبیر کو ہمیشہ ناکام بنا دیا۔ جب بھی حضرت عثمانؓ ایک بات طے کر لیتے تھے تو ان کو اس میں اپنا مفاد مجروح ہوتا نظر آتا تھا، اور کبھی وہ انھیں فریب دے کر، کبھی غلط فہمی میں مبتلا کر کے دھوکہ دے کر اپنی تدبیر پوری کرتا تھا۔

حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عمرو بن العاص کا بیان ہوگا حضرت عثمانؓ کی خلافت تمام تر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مرہونِ منت تھی۔ اگر حضرت علیؓ نے ان سے کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ سیرت شیخین پر چلنے کا وعدہ کر لیا ہوتا تو وہ بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا ہی چکے تھے۔ فوراً کر لیتے لیکن جب حضرت علیؓ نے صرف کتاب و سنت اور سیرت شیخین کے ساتھ اپنے اجتہاد پر اصرار کیا تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہی سوال ——— تفصیل گذر چکی ہے ——— حضرت عثمانؓ سے کیا۔ انھوں نے بتا کر وعدہ کرا لیا۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اور ان کے فوراً بعد حضرت علیؓ اور دوسرے اکابر صحابہؓ اور شہریانِ مدینہ نے بیعت کر لی۔ لیکن جب عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے کانوں تک حضرت عثمانؓ کی شکایتیں پہنچیں اور انھیں معلوم

کے واقعات کبھی معلوم ہوتے، اور خود ان پر لوگ اعتراض کرنے لگے کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی وجہ سے ہو رہا ہے تو وہ حضرت عثمانؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے سختی کے ساتھ باز پرس کی اور زندگی بھر کے لیے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ حد یہ ہے کہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، اور حضرت عثمانؓ بطور عیادت تشریف لے گئے، تب بھی نہ آنکھ ملائی، نہ رخ ان کی طرف کیا، نہ گفتگو کی، اس لیے کہ مروان نے نظام خلافت میں جو ابتری پھیلائی تھی اس کا ذمہ دار کسی نہ کسی درجے میں وہ حضرت عثمانؓ کو بھی سمجھتے تھے[۱۲]

اسی طرح عمروؓ بن العاص — جو بعد میں امیر معاویہؓ کے دست راست بن گئے — نے بھی حد درجہ تند و تلخ لب و لہجہ میں حضرت عثمانؓ سے گفتگو کی، اور بہ الفاظ واضح انھیں مشورہ دیا کہ یا تو وہ حالات سازگار بنائیں، یا پھر منصب خلافت سے دست بردار ہو جائیں[۳]

اوپر جو واقعات پیش کیے گئے ہیں، ان سے یہ بات اچھی طرح صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ عوام کی حاکمیت اور بالادستی، اور حاکم کی مسئولیت اور جواب دہی ایک اٹل حقیقت اور مسلّم امر ہے، جسے اگر اسلام کی روح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایسی روح جس پر اسلام کی عمارت استوار ہے!

حاشیہ:

۱۔ سورہ ہود، پارہ ۱۲، رکوع ۱۰، آیت ۸۹

۲۔ سورۃ انبیاء، رکوع ۵، آیت ۸۲

۳۔ الطبری، ج ۱، ۴، ص ۲۴۰

۴۔ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۳۱۵

۵۔ الطبری ج ۱، ج ۴ (واقعات ۳۵ھ)

٦ تاریخ خوارج (عمر ابو نصر) طبع بیروت، ص ۹۰ ۔
٧ کتاب خراج (امام ابو یوسفؒ) طبع مصر، ص ۵۔
٨ السیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۲۰ ۔
٩ الاحکام السلطانیہ (ماوردی)، ص ۳۴ ۔
١٠ الطبری، ج ۱، ص ۲ (وقائع عہد عمرؓ)
١١ الاحکام السلطانیہ (ماوردی)، ص ۴۱ ۔
١٢ عقد الفرید، ج ۳، ص ۷۹ ۔
١٣ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۱۶۰ ۔

باب ۱۷

پاکستان: ایک اسلامی جمہوریت!

قائداعظم کے ارشادات کی روشنی میں!

قائداعظم کی کوئی بات اپنی ذات میں آسیب تھی۔ اُن کے افکار و خیالات سے بعض لوگوں نے اختلاف کیا لیکن بدترین مخالف کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اُن پر بے ایمانی، منافقت کا الزام لگا سکے۔ اُن کی زبان سے وہی بات نکلتی تھی جو دل میں تھی اُن کے دل میں آتی تھی۔ اور جو کچھ وہ کر دیتے تھے اس پر بڑی سے بڑی قوتیں سے خوفزدہ رہتے تھے۔ عوام کی خاطر ہر دل عزیزی، مقبولیت عامہ اور قیادت کے لالچ میں کبھی دوسروں پر لگا دیتے ہیں ذرا نہ ہچکچاتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگ اسلامی اقدار سے واقف تھے ــــ یہ بات اس زمانے کی ہے جب انگریزوں نے سیاسی میدان میں پہلے پہل قدم رکھا تھا ــــ لیکن اسلامی تہذیب ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور اسی نے ان کا رخ بالکل بدل دیا۔ وہ ذہنی طور سے بڑے مسلمان ملک کے خادم اور معمار بن گئے۔

ایک مسلمان کو یہ یقین، وثوق علی اللہ، دامن میں تھا ان کی ہمیشہ تقریر اسی کی ترجمانی کرتی تھی۔ اور آخر وقت تک اللہ کو اپنا شکار دینے کا کام انہی کے ہاتھ سے انجام پایا۔ بعد ازاں ان کی اسلامی شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت مسلم لیگ اور کانگریس کے چوٹی کے لیڈر تھے۔ ترقی پسندی سے جملہ بلند تھے۔ سرد جنگ، ایٹم بم، اقتصادی بے خبر تھے، لیکن قوت اسلامیہ کی تاریخ سے

دست بردار ہونے کو کبھی اور کسی حالت میں تیار نہیں ہوتے۔

ہندو مسلم اتحاد اور وحدتِ ہند برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے بے حد جدوجہد کی۔ لیکن نہرو رپورٹ کے بعد انھیں یقین ہو گیا کہ مسلمانوں پر ہندو اکثریت اپنی بالادستی مسلط کرنے پر تل گئی ہے۔ اور اس بات کو گوارا کرنا ان کے اسلامی ذہن اور مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ وہ مسلمانوں کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے آمادۂ جہاد و عمل ہو گئے۔ انھوں نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو چودھری خلیق الزماں کے مشورے سے پیش کیے تھے۔ وہ ہندو مسلم تنازعے کا بہترین حل تھا۔ اس وقت کے صدر کانگریس سری نواس آئنگر نے بھی انھیں قبول کر لیا تھا لیکن موتی لال نے اپنی رپورٹ میں ان نکات کو یکسر مسترد کر دیا۔ اور جب موتی لال نے مرکزی اسمبلی میں حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اس دستورِ اساسی کو اگر قبول نہیں کرتی تو جنگ کے لیے اسے تیار ہو جانا چاہیے، قائداعظم فوراً اٹھے اور انھوں نے موتی لال کو لکارا۔ یہ متفقہ دستور نہیں ہے مسلمان اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔

پھر ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں انھوں نے حتی الامکان مفاہمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر دل برداشتہ ہو کر وطن کی اقامت ترک کر کے لندن کے مکین بن گئے۔ مسلمانوں نے انھیں واپس آنے پر اصرار کر کے بلایا، اور قیادتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن کر دیا۔

۱۹۳۵ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کا احیا کیا۔ اور ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ کانگریس مسلمانوں کے مطالبات مان لے، اور ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو جائیں۔ وہ مسلمانوں کو اقلیت ماننے پر کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ ایک مستقل قوم کو جو اپنا مخصوص دستور حیات اور نظامِ زندگی رکھتی تھی کس طرح اقلیت مان لیتے؟ بات یہیں سے بگڑی، اور مطالبہ پاکستان پر ختم ہوئی۔

قائداعظم نہ عالمِ دین تھے، نہ مورخِ اسلام، نہ صوفی باصفا تھے، نہ سیاسی

دین نہیں، وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ایک فرد تھے، اور اس طبقے کی اکثریت کا دینی رجحان رکھنے والے طبقات وغیرہ سے کوئی ربط ضبط نہیں تھا۔ لہٰذا یہ فرد پاکستان کے بارے میں ان کا تصور بھی یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ایک ایسا آزاد ملک ہوگا جہاں رائج الوقت سیاسی نظام نافذ ہوگا۔ یعنی قومیت الگ اور کیسا الگ جہاں مذہب ایک ذاتی اور نجی چیز ہوگی اور نظام حیات کی بالادستی عمومی اور اجتماعی طور پر نافذ ہوگی۔

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا تھا کہ اعظم مذہبی آدمی نہ ہونے کے باوجود مذہبی عصبیت سے بھرپور تھے۔ انھوں نے جب مسلمانوں کو خدا کی نعمت کا خیال اپنے ذہن میں پیدا کیا تو بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس خطہ ملک کا قیام و استحکام صرف اسی ذات ممکن ہے کہ اس کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام پر ہو۔

لیکن اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ اس کی روایات کیا ہیں؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اس سے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟ ان باتوں پر انھوں نے باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تقریروں میں اسلام زیادہ سے زیادہ ایک روحانی رشتے کے طور پر یا سیاسی اصطلاح کے طور پر اس لفظ کو استعمال کرتا نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب اسلام سے متعلق ان کے معلومات وسیع ہوئے اور اس کی تاریخ اور روایات سے آشنا ہو گئے تو انھوں نے صاف واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان میں جو جمہوریت نافذ ہوگی، وہ خالص اسلامی ہوگی۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس کی جرأت نہ اسلام میں سے کسی ملک نے اب تک نہیں کی تھی۔ آج اسلامی ممالک میں جمہوریت تو رائج تھی لیکن اسلامی جمہوریت تو کہیں بھی نافذ نہیں ہے۔ اس اعلان نے قدرتاً ہندوؤں اور بعض غیر مسلم جماعتوں کے پرستاروں نیز مسلمانوں کو اندیشہ لاحق ہوا۔ دو دو راتیں جلسے ہوئے۔ ان کی طرف سے تابڑ توڑ حملے ہوئے۔ اعتراضات کیے گئے، مذاق اڑایا گیا لیکن وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہے۔ نہ ڈگمگائے نہ ہٹے، نہ جھکے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے وضاحت کی جو خلاف ناموس اسلام ہو سکتی ہے کہ قائداعظم کا تصور پاکستان ان دونوں باتوں کے خلاف ناموس اسلام ہوتا ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قبل ازیں کہ میں اپنے اس مختصر خطاب کا اختتام کروں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک جمہوری ریاست میں بسنے والی مسلم قوم کو جن حقوق کی ضرورت ہے ان کا تحفظ اور ان کا مستقبل صرف حصول پاکستان میں مضمر ہے۔ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان مقاصد عالیہ یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا انہیں برداشت کرنے کے لیے مسلمان ہر وقت تیار ہیں۔

یہ خطاب اگر کسی دنیاوی حکومت کے لیے ہو سکتا ہے جو کہ ابتدا اور انتہا آیات قرآنی سے ہو، ظاہر ہے ان کا مقصد نظریۂ اسلامی ریاست ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مسلمانان ہند کے قتل عام سے متاثر ہو کر قائداعظم نے یہ بیان دیا: یہ بیان ایک سیاسی مدبر کا نہیں، ایک درد مند کا ہے۔ فرمایا:

"مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ کیا ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہ و معصوم قتل ہوتے رہیں گے اور ہم اپنے اموال اور عزت کی حفاظت خود نہ کریں گے۔ پاکستان کی تخلیق کے بغیر مسلمانوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس لائق ہیں کہ اکثریت میں رہنے والے غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں۔ ان کے لیے جو کچھ ممکن ہو گا کیا جائے گا۔ ہم پاکستان کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔"

پاکستان کی تخلیق کا مقصد کیا تھا؟ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم سے فرمایا جب ہوتا ہے تو انہیں ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر کو دیا اور انہوں نے ان کو لکھ دیا:

"شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس خیر سگالی اور رواداری کی بنا ڈالی تھی اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسول ؐ نے کر دی تھی۔ انھوں نے نہ صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی، یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا۔ ان کے ساتھ رواداری برتی۔ اور ان کے مذہبی احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے۔ انھوں نے اس طرح حکومت کی، ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں سے معمور ملے گی جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے!"

جس سربراہ مملکت کے یہ خیالات ہوں وہ اسلامی حکومت کے سوا اور کسی طرح کی حکومت قائم کرنے کا تصور بھی کر سکتا تھا؟

۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے ہندوستان کے فسادات اور مسلمانوں کی ہلاکت سے متاثر ہو کر ایک بیان دیا۔ جسے اگر عہد آفریں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

"میں پاکستان کے ہر مسلمان مرد اور عورت سے کہتا ہوں کہ وہ موجودہ خطرہ اندوہ کے سیلاب میں نہ بہہ جائیں۔ انھوں نے اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے لیے بہت دکھ اٹھائے ہیں اور قربانیاں دی ہیں۔ اب یہ انھی کا کام ہے کہ اس کی تعمیر کریں۔ صرف اسی صورت میں ہم اس قتل و غارت گری کا جو ہمارے ہندو بھائیوں کے ساتھ دوسری طرف کی جا رہی ہے بہترین بدلہ لے سکتے ہیں۔!"

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو افسران حکومت سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے پاکستان کے نظام حکومت کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے فرمایا:

"اپنے لیے ایک مملکت قائم کرنا ہی ہمارا مقصد نہیں تھا بلکہ یہ ذریعہ تھا حصول مقصد کا۔ ہم ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں ہم اپنے روایات و ثقافتی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں، جہاں اسلام کے عدل و انصاف اور مساوات کے اصولوں کو آزادی کے ساتھ بروئے کار آنے کا موقع ہو۔!"

۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبّی دربار (بلوچستان) میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے بات بالکل صاف کر دی۔ انھوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے نبیؐ نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد میں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں!"

پھر ۳۰ فروری ۱۹۴۸ء کو افواج پاکستان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"فاشیت کے خطرات سے دنیا کو بچانے کی خاطر کروڑوں کے نقصان سے حتمی طور پر آپ نے فاشیت کو شکست دی ہے مگر اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی عدل و مساوات اور اسلامی اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے!"

یہی اسلامی جمہوریت تھی جس کے لیے قائداعظم کے بعد قائد ملت سرگرم کار رہے۔ اور اب موجودہ صدر مملکت سامنے ہیں کہ پاکستان کی ترقی اور فلاح صرف اسی میں مضمر ہے!

(۲) قائد ملت کی تصریحات کی روشنی میں!

قائد ملت لیاقت علی خان صحیح معنوں میں قائداعظم کے جانشین تھے۔ ان کا خلوص، تدبر، جذبۂ ایثار، مقصد کے لیے مر مٹنے کا جذبہ، یہ ساری چیزیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

قائد ملت اسی نقش قدم پر چلے جو قائداعظم چھوڑ گئے تھے۔ پاکستان کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دلانے کی وہی جدوجہد لگن ان میں بھی تھی جو قائداعظم میں پائی جاتی تھی۔ وادیت کے اس دور میں روحانیت کو پیش نظر رکھا گیا لیکن سیکولرازم کی حکومت مطالبہ کے اس عہد میں اسلامی حکومت کی تشکیل و تعمیر کا خیال ان کے ذہن سے کبھی اوجھل نہ ہوا۔ بلکہ فخر و ناز کے ساتھ لیاقت علی خان ہی کا حصہ تھا۔

۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے پاکستان کی مجلس دستور ساز کے سامنے قرارداد مقاصد پیش کی۔ یہ تجویز بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اس نے ایک طرف تو پاکستان میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ دوسری طرف بھارت میں تہلکہ مچا دیا۔ تیسری طرف فرنگی حکومتیں بھی بغیر توقع اور ناموس آواز سن کر چونک پڑیں۔

قرارداد کا متن: قرارداد کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی تمام کائنات پر بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے، اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو حکمرانی کا اختیار اپنے مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے، اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔ جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آئندہ مملکت پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے جس کی رو سے جملہ اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کیے جائیں گے۔ اس دستور میں جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول کی جس طرح اسلام نے تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ جس کی رو سے لازماً مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات جو کتاب و سنت میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔ جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہوں، ایک وفاق بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ اور معین اختیارات کے ساتھ داخلی طور پر خود مختار ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق عامہ کے تحت مساوات حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عقائد، اقتصادی اور سیاسی اظہار خیال، اظہار عقائد، عبادات اور اجتماع کی آزادی شامل ہو۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقی علاقوں کی سالمیت آزادی اور ان جملہ حقوق کا جن میں اس بحر و بر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہل پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں، اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبودی میں کما حقہٗ حصہ لے سکیں۔

قائد کی تقریر: قرارداد مقاصد پیش کرتے ہوئے لیاقت علی خاں نے ایک [illegible]

"میں اس موقع کو ملک کی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔ باوجود اہمیت صرف چند گھنٹوں کی ہی رہ گئی ہیں جب کہ ہم ایک [illegible] سیاست کی تشکیل اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔ میں ایوان کو یاد دلاتا ہوں کہ بابائے ملت قائد اعظم نے اس مسئلے کے متعلق اپنے جذبات کا متعدد مرتبہ اظہار کیا تھا۔ اور قدم نے ان کی تائید کی۔ ہم انہی کی تھی، پاکستان اس لیے [illegible] کے مطابق [illegible] دنیا پر عملاً واضح کر دینا چاہتے تھے کہ آج حیات انسانی کو جو بیماریاں لگ گئی ہیں ان سب کے لیے اسلام اکسیر اعظم کا حکم رکھتا ہے۔"

اس معرکۃ الآراء تقریر میں لیاقت علی خان نے آگے چل کر ایک مومن کی شان اور ایک سپاہی کی آن کے ساتھ فرمایا:

"انسانی دماغ نے سائنسی ترقی اور ایجادات کی شکل میں جو جن اپنے اوپر مستولی کر لیا ہے اس سے نہ صرف انسانی معاشرے کے سارے نظام اور اس کے روحی و اخلاقی کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے بلکہ اس مسکون خاکی یعنی دنیا کے بھی تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

"صرف وجود باری کی احساس انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جو قوتیں حاصل ہیں ان سب کو ایسے اخلاقی معیاروں کے ماتحت کر دینا لازم ہے جو وحی سے فیض یاب ہوئے ہیں اور جنہیں ہم مختلف مذاہب کے جلیل القدر پیغمبر سمجھتے ہیں!"

اور پھر اس کے بعد لیاقت علی خاں کے منہ سے وہ بول نکلے جو ان جیسے مرد مومن ہی کی زبان سے نکل سکتے تھے۔ فرمایا:

"ہم پاکستانی ہوتے ہوئے اس بات پر شرمندہ نہیں ہیں کہ ہمارا ملک اکثریت مسلمان ہے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ہم اپنے ایمان اور مذہب کو تقویت ہی دنیا کی فوز و فلاح میں حقیقی اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں میں اتنی جرأت ایمان ہے کہ ہم اعلان کر دیں کہ تمام اقتدار اسلام کے تابع کر دو اور اسے استعمال کیا جائے تاکہ اس کا غلط استعمال نہ ہو سکے۔!"

بادشاہت اور ملائیت کی نفی: اسی تقریر میں لیاقت علی خاں نے مزید ارشاد فرمایا:

"میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے ہماری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ ہم حکمران اور بادشاہ ہوں کے فرمان الٰہی ہونے کے زعم میں مذہب کو پھر سے زندہ کریں۔ خدا نے اختیارات صرف جمہور کے کسی فرد کو تفویض نہیں کیے ہیں اور اس کا نتیجہ جمہور ہی کو کرنا ہوگا کہ یہ اقتدار کن لوگوں کے ذریعہ استعمال کیا جائے گا!"

اصطلاح میں تھیوکریسی کلیسائی حکومت کو کہتے ہیں یعنی برگزیدہ پادریوں کی حکومت میں اس امر پر جتنا بھی زور دوں کم ہوگا کہ یہ تصور اسلام سے قطعاً بعید ہے۔ اسلام ملائیت یا کسی حکومت مشائخ کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے اسلام میں تھیوکریسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اب بھی پاکستان کے نظام حکومت کے ضمن میں تھیوکریسی کا ذکر کرتا ہے تو یا وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہے، یا شرارت سے ہمیں بدنام کرنا چاہتا ہے۔

ہم جمہوریت کا لفظ جس وقت اس کے اسلامی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کا اطلاق ہمارے نظام حکومت سے لے کر ہماری معاشرت پر بھی ہے، کیونکہ اسلام نے دنیا کو جن عظیم الشان انعامات سے مالا مال کیا ہے ان میں ایک اہم انعام انسانی مساوات بھی ہے!"

اسلام کا احسان: اس کے بعد لیاقت علی خان نے اسلام کے ایک ایک احسان عظیم کا ذکر کیا ہے:

"اسلام نسل، رنگ اور نسب کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح جمہوری رواداری کی روایت بھی عظیم الشان ہیں کیونکہ قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کو کسی اقلیت کے تحت یہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں جو مسلمان ملکوں میں انہیں حاصل تھیں۔

جس زمانے میں کلیسا سے اختلاف رکھنے والے مسیحیوں اور محکوم مسلمانوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں اور انہیں گھروں سے نکالا جاتا تھا اور جب انہیں جانوروں کی طرح شکار کیا جاتا تھا اور مذہب کے جرم قرار دے کر زندہ جلا دیا جاتا تھا، اسلامی حکومتیں ان سب کا مسکن و ملجا ثابت ہوئیں جو تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں کو نفرت کے سبب بہت سے یہودیوں کو یورپ کے ممالک سے نکال دیا گیا تو سلطنت عثمانیہ (ترکیہ) نے انہیں

اپنے ہاں پناہ دی۔

مسلمانوں کی رواداری: مزید فرمایا: "ہندوستان کے اس برصغیر میں جہاں کبھی مسلمانوں کو اعلیٰ اختیارات حاصل تھے غیر مسلموں کے حقوق کا لحاظ خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا اور ان کی عزت کی گئی۔

مسلمانوں ہی کی سرپرستی میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ میرے بنگال سے آنے والے دوستوں کو یاد ہوگا کہ یہ صرف مسلمان حکمرانوں کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ تھا کہ سب سے پہلے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا سنسکرت سے بنگالی میں ترجمہ کیا گیا۔

عدلِ عمرانی: اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:

"جہاں تک عدلِ عمرانی کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اسلام اس میں بہت کچھ اضافہ کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرے کے قیام کا حامی ہے جس میں عدل عمرانی کا تصور نہ خیرات پر مبنی ہے نہ تشدد پر۔ اسلام عدلِ عمرانی کو ہر قسم کے فساد سے پاک رکھنے کے ضامن ہیں۔

اسلامی جمہوریت حکومت پاکستان کی یہ تقریر ایک ایسی دستاویز ہے جو ہمیشہ رہنما کام دے گی۔ اسی تقریر میں انہوں نے فرمایا:

"اس قرارداد کی ایک دفعہ یہ ہے کہ اقلیتوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اصول تعلیمات کے مطابق جو کہ سب سے سنت پر مشتمل ہیں ترتیب دے سکیں۔

اگر مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اپنے مذہب کے مطابق گزار سکیں تو کسی غیر مسلم کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظم نے ہمیشہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ ہم

پاکستان کا مطلب اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اپنا خاص طریق زندگی اور ضابطۂ اخلاق موجود ہے۔ اسلام ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کریں جس کی اساس روحانی اقدار پر قائم ہو۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جس کا یہ ایمان نہ ہو کہ کلام اللہ اور اسوۂ رسول ہی اس کے روحانی فیضان کے بنیادی سرچشمے ہیں۔

غیر مسلموں کے حقوق: ضروری تھا کہ اسلامی جمہوریت میں غیر مسلموں کے حقوق کی بھی ذمہ دارانہ طور پر وضاحت کر دی جاتی، چنانچہ لیاقت علی خان نے یہ فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا:

"ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کے مقصد میں ہم نے غیر مسلموں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر ہم اقلیتوں کی آزادی میں مداخلت کی کوشش کرتے تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہوتا۔ اقلیتوں کو اپنے مذہب پر چلنے، اس کی حفاظت کرنے یا اپنی ثقافت کو فروغ دینے سے کسی طرح روکا نہیں جائے گا۔"

بنیادی حقوق: بنیادی حقوق کے مسئلے پر بھی لیاقت علی خان نے اظہار خیال کیا:

"بنیادی حقوق کے تحفظ کا یقین دلانا بھی ایک رسم ہی ہو گئی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم ایک ہاتھ سے حقوق دیں اور دوسرے سے واپس لے لیں۔

ہم بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ پاکستان میں کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو مذہبی اقلیتوں کے لیے نہیں بنا ہے۔ ہمارا مقصد اقتصادی نظام کو اسلام کے بنیادی اصول پر تعمیر کرنا ہے، کیونکہ یہ دولت کی بہتر تقسیم اور ناداری کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

لذتِ تقریر: لیاقت علی خان کی اس تقریر کو پڑھیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ آواز ایک آزاد سپاہی اور منسٹر سے زیادہ ایک مبلغ اسلام کی ہے۔ یہ آواز بازگشت ہے اس نعرۂ مستانہ کی جو محمد علی جیسے مردِ قلندر نے بلند کیا تھا جس نے اقبال کے تخیل میں ایک نقش لازوال بن کر قلب مسلمان میں مرتسم کر دیا تھا۔

نکتہ چینیاں اور ان کا جواب: اس تقریر پر جہاں شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی نے جذبات تبریک و ستائش پیش کیے وہاں چند مسلم اور کانگریسی مسلم ممبروں نے حقیقت حال کو سمجھے بغیر نہایت تند الفاظ میں اس پر نکتہ چینیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ خاص طور پر ہندو ممبروں بہت زیادہ احتجاج کیا۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے متعلق پیش آمدہ اعتراضات کا جوابی تقریر میں فرمایا:

"میں اپنے معزز دوست لیڈر کانگریس پارٹی[1] کی تقریر کا کامل توجہ سے سنا۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں گا وہ کامل احساس ذمے داری اور نیک خلوص کے ساتھ کہوں گا۔"

علماء کا ذکر: "میرے معزز دوست لیڈر کانگریس پارٹی نے چند علماء سے ملاقات فرمائی لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ علمائے مذکور موصوف سے استفادۂ علمی کرنے آئے تھے یا موصوف خود اس غرض سے ان کے پاس تشریف لے گئے تھے؟

چلیے میں مان لیتا ہوں کہ حسب بیان موصوف لاہور سے چند علماء خود ان سے ملنے آئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مطلوبہ تقریر سے گھبرا گئے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ ملاقات کیوں کی گئی اور یہ لیڈر انھیں کیوں دیا گیا۔ یہ نام نہاد علماء آپ سے ان سے

---

[1] مسٹر سریش چندر چٹوپادھیائے۔ لیڈر کانگریس پارٹی۔

ملنے آئے تھے کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کی نیک نیتی کے متعلق شبہات پیدا کر دیں خدارا ایسے شر انگیز پراپیگنڈے کی طرف قطعی توجہ نہ دیجیے، میں اس تخریبی عنصر کو جو پاکستان کی بربادی پر تلا ہوا ہے متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اب ان کی حرکات کو برداشت نہ کریں گے۔ انھوں نے آپ کے سامنے اسلام کے صحیح نظریے کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے اگرچہ وہ اسلام کے دوست اور حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقتہً اسلام کے دشمن ہیں۔!

مساوات : میرے معزز دوست نے فرمایا کہ ہم مساوات کا ذکر کرتے ہیں۔ اور مساوات کے بارے میں بھی ان نام نہاد علما نے ان کو بہکایا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ موصوف ایک پرانے تجربہ کار انسان ہونے کے باوجود مذکورہ شخصیتوں کی باتوں پر نہایت آسانی سے یقین کر لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے تو ان باتوں کو جو ہم اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے فاضل عالم اسلام کے متعلق ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

موصوف نے قرارداد کی ترجمانی نہایت نامناسب طور پر کی۔ انھوں نے اس مملکت کے غیر مسلم باشندوں کو یہ بتانا چاہا کہ گویا موجودہ قرارداد منظور ہو گئی تو ان کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ میں اپنے معزز دوست کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ یہ بیان کسی طرح حقیقت کے مطابق نہیں۔ اسلام کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ایسی حیرت انگیز بات نہیں کہی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ سارے دنیا کے غیر مسلموں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ صرف اسلامی معاشرہ ہی ایسا ہے جہاں صحیح معنوں میں جمہوریت موجود ہے۔!

لیاقت علی خاں کی یہ تقریر بہت طویل تھی اور ہونی بھی چاہیئے تھے۔ لہٰذا اس کے اقتباسات کو بھی حد درجہ سعی اختصار کے باوجود کسی حد تک طویل ہونے سے نہیں بچا سکا، لیکن لیاقت علی خاں کی اس تقریر نے صورت مسئلہ کی ایسی تنقیح کر دی کہ صورت احوال آئینہ کی طرح واضح ہو گئی۔

اب مختصر طور پر لیاقت علی خان کے دورۂ امریکہ پر بھی نظر ڈالیں گے کیونکہ وہاں بھی انہوں نے اسلام کو اس کے صحیح آب و رنگ کے ساتھ پیش کرنے کا فریضہ بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

۲۹ اپریل ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خان امریکہ روانہ ہوئے۔

امریکہ میں لیاقت علی خان کا پُرتپاک استقبال ہوا۔ امریکہ نے انہیں اعزاز بھی دیا۔ کانگریس کے سامنے تقریر کا موقع دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں:

"اسلامی اصولوں کے مطابق جمہوریت، آزادی اور مساوات پر زور دیا۔ اسلام آزادی ضمیر کا درس دیتا ہے۔ اور مساوات کا ضابطہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت پر دیانتدارانہ کام کے مطابق حق کا مطالبہ ہے۔ اسلام ذاتی ملکیت کا قائل ہے، لیکن وہ اتنا زر کو پسند نہیں کرتا کہ اسے تقسیم دولت کا کچھ حق نہیں ہے۔ وہ دولت کا مخالف ہے۔ ہمارے سامنے ہمارا مقصد ہائیت کے بنے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

پاکستان ایسوسی ایشن کے اجتماع میں ایک ہزار سے زیادہ سامعین نے ایسوسی ایشن کو لیاقت علی خان نے خطاب کیا۔ انھوں نے فرمایا:

"پاکستان میں ۸ کروڑ افراد کی اکثریت مسلمان ہے اور یہ اکثریت اسلام کو ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے اپنائے ہوئے ہے۔ ہم اسلام میں شخصی آزادی کو اہمیت دیتے ہیں۔"

ملک کی کونسل برائے تعلقات خارجہ اور شکاگو کی مجلس صنعت و تجارت کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا:

"پاکستان کے عوام نے تہیہ کر لیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اپنی زندگی گزاریں گے۔ اسلام کوئی نیا نظریہ اور اصول نہیں ہے۔ اس کی بنیاد چودہ سو برس پہلے رکھی گئی ہے۔ ہم جس عقیدے پر عامل ہیں اگر دنیا اس پر گامزن ہو جائے تو یقیناً آج گری ہوئی انسانیت پھر زندہ ہو جائے گی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ نیز یہ کہ دنیا کا ہر انسان برابر ہے۔ ہمارا مذہب کسی دوسرے عقیدے کے لوگوں پر دباؤ نہیں ڈالتا۔ بلکہ صاف کہتا ہے۔ "لکم دینکم ولی دین"

لاس اینجلز کے ایوان تجارت میں بھی لیاقت علی خان نے ایک اثر انگیز اور جرأت آفریں تقریر میں اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اس موقعہ پر اس اینجلز کے مشہور فیکٹر ہراؤن نے دو سو سرکردہ تاجروں، صناعوں، بینکرز، ماہرین زراعت اور ارباب ثروت سے لیاقت علی خان کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"دنیا کی بہت سی ممتاز ہستیوں، شہزادوں، بادشاہوں، فرماں رواؤں اور صدروں کا آپ حضرات سے تعارف کرانے کا شرف مجھے حاصل رہا ہے، لیکن میں نے آج تک اتنا فخر کبھی محسوس نہیں کیا، جتنا مسٹر لیاقت علی خان کو آپ سے متعارف کرتے ہوئے کر رہا ہوں۔ ایشیا دنیا کی نئی قوموں کا نمائندہ ہے۔ زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ نئی قوم جس کی طرز نئے کی خود اپنا ہے۔ دنیا میں آزادی اور جمہوریت کو قائم کرتے رہے گی۔!"

۵ مئی ۱۹۵۰ء کو امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچیسن نے لیاقت علی خان کو ایک شاندار عشائیہ دیا۔ اس موقعہ پر دوسرے ممالک کے سفراء اور امریکہ کی سربرآوردہ ہستیاں موجود تھیں۔ لیاقت علی خان کے جام صحت نوش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

وزیر اعظم نے امریکہ میں جو فضا ان کا ہماری لوگوں کا دل لبھا کر حاصل کی ہے میں اس کا عشر عشیر بھی حاصل کر لیتا تو یہ سال میرے لیے فتح مبین کا سال ہوتا۔ امریکی اپنے آپ

کو قائد خیال کرتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں قیادت کا حق مسٹر لیاقت علی خاں کو ہے جو روزِ اول سے اپنی نئی قوم کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے شبانہ روز جدوجہد میں مصروف ہیں۔ لیاقت علی خان ان مشکل ترین مسائل کو حل کر رہے ہیں جن کا احساس تو درکنار سمجھنا بھی مشکل ہے!"

اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غیر اور بہت بڑے ملک کے وزیر خارجہ نے لیاقت علی خان کی فراست، سیاست، مسئلہ فہمی اور اسلام و جمہوریت کی ترجمانی کے بارے میں کتنی جچی تلی رائے قائم کی اور کتنے مختصر الفاظ میں انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

(۳) صدر ایوب کی "خود نوشت" میں جمہوری اور اسلامی تصورات

کچھ لوگ ہیں جو کسی ملک میں جب فوجی انقلاب آتا ہے تو سب سے پہلے جس چیز پر زد پڑتی ہے وہ جمہوریت ہوتی ہے۔ جمہوریت اور آمریت میں کوئی جوڑ یا رابطہ اتفاق نہیں ہے۔ جمہوریت عبارت ہے عوام کی حاکمیت سے اور آمریت عبارت ہے غیر مسئول بالادستی سے، جس طرح آگ اور پانی میں میل نہیں ہو سکتا، اسی طرح آمریت اور جمہوریت کے مابین اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت تلاش نہیں کی جا سکتی۔

پاکستان کو بھی فوجی انقلاب سے دوچار ہونا پڑا جس کا لازمی نتیجہ آمریت مطلقہ اور جمہوری اقدار کی تخریبی صورت میں رونما ہونا چاہیے تھا لیکن یہ بات حیرت انگیز اور میرے نزدیک تو قابلِ فخر بھی ہے کہ اس انقلاب کا قائد ایک ایسے کے لیے بھی جمہوری قدار سے منحرف نہیں ہوا اور اس کے دل و دماغ میں آمریت کا تصور ہمیشہ کارفرما رہا۔ اپنا چنانچہ اس انقلاب سے تین سال پہلے جس حیثیت ہوسٹل میں پاکستان میں خاطر لوگوں کے ہاتھوں جمہوریت کو تباہ ہوتے دیکھ کر اس نے مستقبل کے پاکستان کا ایک دستوری خاکہ ۲۷ اکتوبر ۵۴ء کو سرسری طور پر پیش کیا اور اسے قلمبند بھی کر لیا۔ اس خاکے میں اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد عملی اقدامات

میں جمہوریت سے متعلق اختیار کردہ اصول و آئین کے اشکالی پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اور بعض مزید غور طلب گوشوں کو نظر انداز کر کے اگر دیکھا جائے تو اس خوشگوار حقیقت کا احساس کیا گیا حتیٰ کہ مذکورہ خاکے میں جو کسی کے مشورے کے بغیر محض ذاتی خیالات و تصوّرات کا آئینہ دار تھا، ہم یہ الفاظ دیکھتے ہیں:

"اس بات کو جتا دینا مناسب ہوگا کہ ہمارا مقصد بہر صورت پاکستان میں جمہوریت کا قیام ہونا چاہیے۔!"

پھر آگے چل کر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مجلس قانون ساز کابینہ کو چنے گی۔ کابینہ کی کارروائیوں پر گورنر قابو رکھے گا اور گورنر پر ملک کا سربراہ یعنی صدر قابو رکھے گا۔" (ص - ۳۱۱)

کسی خالص جمہوری ملک میں بھی جمہوریت کا آب و رنگ کچھ اسی قسم کا ہوا کرتا ہے۔

اس کے بعد حق رائے دہی کا سوال سامنے آتا ہے جو جمہوریت کا کلیدی اور اساسی نکتہ ہے، اس سلسلے میں لکھا ہے:

"ہمہ گیر حق رائے دہی (یعنی بالغ حق رائے دہی) کا جو قاعدہ بن چکا ہے اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔!" (ص ۳۱۲)

ایک ملک کا کمانڈر انچیف، اگر اپنے ذہن میں جمہوریت کا خاکہ اس طرح تیار کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اسے جمہوریت کی خوش بختی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر قائدِ اعظم سے لے کر قائدِ ملّت تک وفاقی نظام کو فروغِ جمہوریت کے لیے لازمی قرار دیتے رہے ہیں۔ اس خاکے میں یہ چیز اور زیادہ نمایاں کے ساتھ نظر آتی ہے:

"صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن محکموں کے اختیارات انھیں پہلے سے حاصل ہیں ان میں تو اضافہ

صنعت و حرفت، تجارت، صحت وغیرہ کا اور اضافہ کیا جائے۔ دفاع، امور خارجہ اور کرنسی مرکزی حکومت کے پاس رہے۔!" (ص ۳۱۴)

اور اس خاکے کا خالق جب برسر اقتدار آیا تو اس نے اس پر عمل کر دکھایا۔ حالانکہ عام طور پر اقتدار اور اختیارات حاصل کرنے کے بعد لوگ نظریات فرسودہ ہو جایا کرتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے وقت سے قیام پاکستان تک جو نعرہ زبان زد خاص و عام رہا، اور جو وعدے اس تحریک کے رہنماؤں نے وقت سے پہلے بڑے تسلسل کے ساتھ جس وعدے کا اعادہ کیا وہ یہ تھا کہ پاکستان کی جمہوریت اسلامی ہوگی، اس لیے کہ پاکستان کی بنیاد و اساس یہی چیز تھی۔ فوجی لوگ ہم اپنے راستے میں کسی کو آڑے نہیں دیتے نہ کہ اسلام کو، جو قدم قدم پر اقتدار سے مواخذہ کرتا رہتا ہے لیکن اس خاکے میں جو بالکل نئی حیثیت میں ڈالی گئی تیار کیا گیا تھا اور جس میں سیاست کی ایک بیخ نہ تھی بلکہ قلب و ضمیر کو آزاد فرما دیتے ہیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ہر شخص یہ کہتا رہا کہ ملک میں اسلامی جمہوریت رائج کی جائے مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ اسلامی جمہوریت جس پر قرآن کی رو سے عمل کیا جائے اسلامی ہو سکتی ہے، ہم جمہوریت کا یہ تصور قبول کر لیں تو شاید ہم دوسری اور انتہا سے بچے رہیں۔ (ص ۳۱۵)

ایک سرسری خاکے میں "اسلامی جمہوریت" کو اصولی طور پر قبول کرنا اسلامی ذہن و دماغ کا عکس ہے۔

مذکورہ خاکہ کی آخری سطریں یہ ہیں:

"دعا کی جائے کہ اس آئین پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جا سکے، اگر ایسا ہوا تو ہماری یک جہتی اور طاقت ناقابل تسخیر ہوگی۔" (ص ۳۱۵)

یہ آخری سطریں اپنے اندر معنویت کے ساتھ ساتھ خلوص کا جوہر بھی رکھتی ہیں۔ اس خاکے کا مصنف تین سال کے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۵۷ء میں فوجی انقلاب کے قائد کی حیثیت سے سربراہِ مملکت بن گیا، بالعموم ہوتا یہ ہے کہ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد پچھلے تصورات، خیالات وقف طاقِ نسیاں ہو جایا کرتے ہیں۔ اور قوت کا نشہ ہر نطق و کلام کو آئین اور قانون بنا دیتا ہے۔ مگر فوجی انقلاب کے اس قائد نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پچھلے خیالات و تصورات سے نہ صرف یک سرِ مو منحرف نہیں ہوا، بلکہ ان میں اور زیادہ جلا پیدا کر دی۔ نہ جمہوریت کسی مرحلے پر اس کی نظر سے اوجھل ہوئی نہ اپنی بنیاد اصلاحیت، ان دونوں کو سمجھ کر اس نے اپنے لیے راہِ عمل متعین کی، چنانچہ اس کی خود نوشت میں دیکھتے ہیں:

"جس قدر نرغ و اخلاقی نظریۂ حیات ہوگا، افراد اور معاشرے کا کردار بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ ہمیں ایک ایسا ہی نظریۂ حیات حاصل ہے، اور وہ مسلم ہے۔ اسی بنیاد پر ہم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور اسے حاصل کیا۔ لیکن پاکستان کے حصول کے بعد ہم اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھال نہیں سکے۔" (ص ۱۰۳)

لیکن ہم اس کی حقیقت آفریں تشریح کو سن لیجیے:

"اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس نظریۂ حیات کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے غلطی کے باعث اسلامی نظریۂ حیات کو مذہب اور ریاست کا ہم معنی تصور کر لیا اور یہیں دھوکا کھا گئے۔"

پھر آگے چل کر تشریح مزید یوں الفاظ:

"اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے کوائف، بالخصوص پاکستان کے کوائف پر اس کا اطلاق کرنے کے لیے غور و خوض کیا جائے۔ ہمیں کوئی نئے تصورات کو وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔"

(الف) توحیدِ الٰہی: انسان کے کردار کے ذریعہ خدا کی محبت کے اظہار

کا جذبہ۔

(ب) سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں۔

(ج) اگر مذہب کے لازمی جزا یہی ہیں تو مذہب کو دنیوی اور دینی دونوں معاملوں میں دخل ہوگا۔

(د) یہ دنیا اس لیے نہیں ہے کہ اس سے حذر کیا جائے، لہٰذا اپنی تہذیبی اور تمدنی کی نشوونما کے لیے علوم جدیدہ کی تعلیم ہمارے لازمی ضرورت ہے۔

(ہ) ریاست اور فرد کے فرائض کی وضاحت کی جائے، موسن کی تعریف بیان کی جائے۔

(و) فرد کے بنیادی حقوق بیان کیے جائیں۔

(ز) موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس نقطہ سے روشناس کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ان نکات کا ذکر کرنے کے بعد:

"اس کام کا ذمہ کون لیتا؟ مجھے تو اس کی ہمت نہ پڑ سکتی تھی کیونکہ مجھے لوگوں کا احساس تھا، ہمارے سیاسی کارکن اور آقا خدمت کے لیے وقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں۔

ہر شخص متفق تھا کہ ملک کا آئین جمہوری ہونا چاہیے۔ ایک ایسا آئین جس کی مدد سے قوم اسلام کے لازمی اصول و ضوابط کے مطابق پیش نظر کر سکے۔ ہاں یہ تھا کہ آئین کے جمہوری لوازم کا فیصلہ اور اسلام کے لازمی اصول و ضوابط کا تعین کس کو کرنی چاہیے؟"

یہ بڑا اہم اور نازک سوال تھا، اس کا جواب نہایت تدبر، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور خالص اسلامی ذہنیت کے ساتھ یہ دیا گیا ہے:

"ملک کے آئین کو اسلامی حیثیت دینے کے بارے میں میں نے جو لازمی فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ ان اصول و ضوابط کے تعین کی ذمے داری قوم ہی کو منتخب

دینی چاہیے۔ آئین ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرے جس کی بنیاد، اسلامی تاریخ اور تجربے پر ہو۔ لیکن اس ڈھانچے میں رہ کر قوم کو پوری آزادی ہو کہ وہ اپنے لیے کتاب و سنت سے اصول اور ضابطے اخذ کر سکے، اور ان اصول و ضوابط کو برتنے کے طریقے خود۔ اصول جمہوریت اور اصول اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔!" (ص ۳۲۵-۳۲۸)

بلاشبہ یہ اصول خالص جمہوری بھی ہے اور خالص اسلامی بھی۔ کسی نقطۂ نظر سے اس پر اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا۔

آگے چل کر ایک اور نہایت اہم اور فکر آفرین بات اس خود نوشت میں ملتی ہے:

"زمانۂ حال میں متعدد اسلامی ملکوں نے اپنے اپنے ضرورت کے مطابق آئین تیار کیے، لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آئین اسلامی ہیں۔ جنھیں تمام اسلامی ملک اپنا سکتے ہیں، مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ پاکستان کو اسلام کے اصول و ضوابط کا اپنے حالات کے مطابق اطلاق کرنا ہی ہوگا۔ نیز یہ بات بھی کہ یہ کام مسلمہ جمہوری اصول کی حدود میں ہونا چاہیے، جن میں سے ایک نہایت اہم اصول ملکی معاملات کے حق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ تخصص یا گروہ کو خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پوری قوم کی مرضی کے خلاف فتویٰ دے دے جس کا اظہار قوم نے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کیا ہو۔ اس سے مقننہ کی برتری مسلم ہو جاتی ہے اور یہ امر بھی مسلم ہو جاتا ہے کہ قوم کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندوں، اور ارکان حکومت کو چننے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس بات کے اطمینان کے لیے کہ عاملہ اور مقننہ اپنے اپنے فرائض آئین کے اصول کے مطابق انجام دے رہی ہیں۔ ایک آزاد عدلیہ کا وجود لازم آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتظامات کے اس تمام منصوبے میں علمائے دین کی کسی

جماعت اعلیٰ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی جو مقننہ اور عدلیہ پر ویٹو کی طاقت استعمال کر سکے۔

"ان امور میں میں نے اجماع کے مسئلے سے استفادہ کیا ہے جو اسلام کا ایک خاص اصول ہے، چنانچہ میں نے جو آئینی انتظامات کیے ان میں یہ بات قوم کے نمائندوں پر چھوڑ دی کہ وہ کتاب و سنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اپنی رائے کس طرح قائم کریں گے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ مقننہ کے مشورے کے لیے ایک اسلامی مشاورتی کونسل بنائی جائے جس کی پشت پر تحقیقات اسلامی کا ادارہ ہوگا جو مقننہ کو اسلامی نظریوں کی بنیاد پر قوانین وضع کرنے میں مدد دے سکے۔ اس کونسل میں صرف عالمانِ دین ہی کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ ایسے اشخاص کو بھی جو کتاب کے اقتضا کی اسپیشلسٹی، قانون اور عمرانیات کی خوبیاں رکھتے ہیں تاکہ اسلام کے مطالبوں اور وقت کے حالات کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے۔!" (ص ۳۲۸ — ۳۳۰)

آگے چل کر اس خود نوشت میں بعض دوسرے متعلقہ امور و مسائل پر تبصرہ اور تاثرات کا گفتگو کرنے کے بعد ہمیں وہ بات ملتی ہے جو وقت اسلامی ذہن میں اٹھ سکتی ہے:

"تمام حاکمیت اللہ ہی کو حاصل ہے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایک مسلمان ریاست کے عوام کو یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کر سکیں۔ ان کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے منظم طریق پر رفاہ عامہ کے لیے قوانین وضع کر سکیں، اور ان کے پاس مناسب منتظمہ ہونی چاہیے جو ان قوانین کو نافذ کرا سکے۔ نہ ایک آزاد ریاست جو حکم لگا سکے کہ مقننہ منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے مندرجات کے مطابق دے رہے ہیں یا نہیں!

(ص ۳۳۶)

حقیقت یہ ہے کہ اس خود نوشت کے بغیر مندرجات ممکن ہے بعض مقام

فکر کے لیے کسی حد تک بحث طلب ہوں لیکن جہاں تک جمہوری اور اسلامی تصورات کا تعلق ہے۔ وہ قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خالی الذہن ہو کر اور جماعتی تعصب سے بے نیاز ہو کر اگر ان پر غور کیا جائے تو یہ ہر اس ملک کے لیے جو اسلامی آئین بنانا چاہتا ہو دلیل راہ اور سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چند مزید مباحث کے بعد، خود نوشت میں کہا گیا ہے:

"تاریخ اسلام اور مختلف اسلامی ممالک کے آئین کے مطالعہ سے دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ وراثتی میراث کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ عوام کو من حیث القوم اپنا سربراہ چننے کا اور خود اسے برطرف کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ تاریخ اسلام کی رُو سے ایک اور تسلیم شدہ امر یہ ہے کہ جب قوم اپنا سردار چن لے تو اسے معقول اختیار حاصل ہو کہ وہ حکومت کے کاروبار میں ہم آہنگی پیدا کر سکے!"

(ص ۳۳۷)

مذکورہ بالا سطور میں جو تین باتیں پیش کی گئی ہیں، وہ تاریخ اسلام کی ایک مسلمہ حقیقت ہیں۔ ان کی اہمیت اور حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی جمہوریت میں بس یہی تین باتیں ہیں۔ اگر کسی دستور اور آئین میں یہ امور سہ گانہ موجود ہیں تو اسے اسلامی دستور کے سوا کسی اور نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔

مَیں نے اپنی کتاب جب لکھی تھی، اس وقت تک اس خود نوشت کا کوئی چرچا نہیں تھا۔ کتاب کی تکمیل کے چھ ماہ بعد، یہ خود نوشت منظرِ عام پر آئی۔ اس سے مجھے یہ دیکھ کر انتہا مسرت ہوئی کہ آئین پاکستان کی اسلامیت اور جمہوریت کے بارے میں صدر مملکت نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کے پیش نظر اگر میں یہ کہوں کہ میری کتاب خود نوشت کے اجمال کی تاریخی استناد کے ساتھ تفصیل ہے تو شاید یہ نہ مبالغہ ہوگا، نہ خود ستائی!

---

(۱۸)

پاکستان کا دستوری ارتقا

جمہوریت اور اسلامیت کے ساتھ ساتھ!

۱۹۴۷ء میں قانون آزادی Act Independence کے مطابق دو حکومتیں عالم وجود میں آگئیں:

۱- بھارت ۲- پاکستان

اسی قانون کے مطابق غیر منقسم ہندوستان کی مجلس دستور ساز کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ جو ممبر پاکستان علاقے سے تعلق رکھتے تھے، اُن پر مشتمل پاکستان کی مجلس دستور ساز قائم ہو گئی۔

پاکستان کی مجلس دستور ساز نے تشکیل دستور کے سلسلے میں دو سال تک کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل کی۔ البتہ مارچ ۱۹۴۹ء میں اس نے قرارداد مقاصد منظور کی۔ اس قرارداد میں واضح کیا گیا تھا کہ:

۱- حاکمیت صرف خدا کی ہے۔

۲- جس پر عمل درآمد کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جائے گا۔

۳- پاکستانی حکومت کا نظم و نسق اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا جنہیں عوام نے منتخب کیا ہوگا۔

۴- اقلیتوں کو مکمل شہری حقوق حاصل ہوں گے۔

۵- پس ماندہ اور پست Backward and Depressed Classes طبقات کے جائز مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔

۶۔ مسلم لیگ پورے طور آزاد ہوگی۔

۷۔ وزیر کو بنیادی اصولوں کی سب کمیٹی نے جو رپورٹ [illegible] متعلق [illegible] پیش کی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ:

۱۔ صوبہ وفاقیت کا انتخاب پاکستان کے مندوبین کریں گے۔

۲۔ کابینہ مرکزی ایوان کے سامنے جواب دہ ہوگی۔

۳۔ صوبہ وفاقیت جن کی بنا پر مقننہ کی حالت میں دستور کو معطل کر سکتا ہے۔

۴۔ یہ فیصلہ نہیں ہے کہ صوبہ وفاقیت مسلمان ہی ہو، غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خواجہ ناظم الدین سے جو صاحبزادہ لیاقت علی خاں کی جگہ پاکستان کے وزیر اعظم تھے [illegible] کی رپورٹ کی اس رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ:

۱۔ پاکستان کی حکومت دو ایوانوں ـــ ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا ـــ پر مشتمل ہوگی لیکن وہ صرف ایوانِ زیریں کے سامنے جواب دہ ہوگی۔

۲۔ ملک کا ایک دستور وضع کیا جائے جس کی خرابی یہ ہوگی کہ اس امر پر نظر رکھے کہ مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز کی طرف سے جو قوانین منظور ہوں وہ اسلام کے اصولوں یعنی کتاب و سنت کے منافی نہ ہوں۔

اسی اثنا میں گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت برطرف کر دی۔ اور مسٹر محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم بنا دیا۔

۳۔ مسٹر محمد علی بوگرا نے مغربی و مشرقی پاکستان کے مابین مساوات کا اصول تسلیم کر لیا۔

۴۔ نیا انتخاب کرایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجہ بخود مسٹر محمد علی بوگرا کی وزارتِ عظمیٰ بھی بہت جلد ختم ہو گئی۔

۵ مشرقی پاکستان کے جدید ممبروں نے دستوریہ کے قدیم ممبران دستوریہ کی نمائندہ حیثیت پر اعتراض کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ یا تو دستوریہ منسوخ کر دی جائے یا کم از کم مشرقی پاکستان سے دستوریہ کے نئے ممبر لیے جائیں۔

۶۔ ۳ اگست ۱۹۵۴ء کو مسٹر امریکے پیش نظر کہ گورنر جنرل کو دستوری معاملات میں مداخلت کا موقعہ نہ ملے مسٹر راست کے بیٹے نے ایک مسودہ قانون The Constituent Assembly Act پیش کیا۔ جس میں تجویز کی گئی تھی کہ جہاں تک دستور سازی کا تعلق ہے۔ دستوریہ مکمل طور پر آزاد و خود مختار ہے۔ پاکستان کی تمام مقننہ اور وفاقی وزارت Federal Cabinet کو یہ قرار دیا گیا کہ دستوریہ کا بنایا ہوا دستور اگر کسی اقدام سے متاثر ہوتا نظر آئے تو اس کو جواب طلبی کر سکیں یا اسے غیر قانونی قرار دے سکیں۔

۷۔ دستوریہ نے اور بھی کئی قوانین گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کو زیادہ سے زیادہ سے زیادہ محدود کرنے کے لیے وضع کیے۔

۸۔ ان مراحل سے فراغت کے بعد دستوریہ نے بنیادی اصولوں کی رپورٹ جس کا ذکر آچکا ہے ——— ۲۹ فروری سے منظور کرلی۔

۹۔ وزیر اعظم نے دستوریہ میں اعلان کیا کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے مجوزہ دستور کے مسودے پر بحث و مباحثہ ختم ہو جائے گا، اور نیا دستور قائد اعظم کی سالگرہ کے دن منظور کرا لیا جائے گا۔ یہ اعلان بھی کیا کہ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان ری پبلک بن جائے گا۔

۱۰۔ بعد ازاں ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء تک کے لیے دستوریہ ملتوی ہو گئی، بنیادی اصولوں کی رپورٹ، ماہرین دستور آئین پر مشتمل Constitution Experts کو بھیج دی گئی۔

۱۱۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور کا مسودہ طباعت کے لیے بھیج دیا گیا تاکہ

۲۷ دسمبر کے اجلاس دستوریہ کے موقع پر وہ ممبران کے ہاتھوں میں ہو۔

یہ تھا پاکستان کے دستوری ارتقاء کا پہلا روز!

اس روز کی تفصیلات سے جہاں ممبران دستوریہ و گورنر جنرل کے باہمی نزاع و تصادم کی زہریلی حقیقت نظر کے سامنے آتی ہے وہاں یہ طنزیہ گویا یہ حقیقتیں ہیں جو کسی طرح بھی نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتیں ایسی حقیقتیں اگر نمایاں ہوں تو اکثر بدیہی مقتضائے جمہوریت کہنا مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ حقیقتیں یہ ہیں:

۱۔ حالات کے مدنظر بیان نمائندگان کے کل پاکستان کو ملک کی حقیقت میں تبدیلی اور اس تبدیلی کے پیش نظر نئے نظریات کا مطالبہ۔

۲۔ اقلیتوں کے لیے ان تمام حقوق کا تحفظ جو پاکستان کے تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔

۳۔ سالمیت کی آزادی و احترام۔

۴۔ کتاب و سنت کی روشنی میں صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے لئے قوانین کی ایک مجلس (بورڈ) علماء کی طرف سے جاری کرنا۔

۵۔ دستور ساز مجلس آزاد ہے اور مختار کل کی حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان کے دستوری ارتقاء کے ان تمام مراحل کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم نے جناب محمد علی جناح کے خطبہ افتتاح کا تجزیہ کیا تھا جس سے یہ نتائج برآمد ہوئے کہ:

۱۔ "مجلس دستور ساز عوام کی اعتماد سے محروم ہو چکی ہے۔ لہٰذا نئے نظریات ناگزیر ہیں۔

۲۔ اقلیتوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو چکا ہے۔

۳۔ خواجہ ناظم الدین خان نے جو منصوبہ دستور کے ابھی تک پیش کرتے

میں گورنر جنرل کے اختیار کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا۔ سندھ چیف کورٹ کے فل بنچ نے متفقہ طور پر مولوی تمیز الدین کے حق میں، اور حکومت کے خلاف فیصلہ دیا۔ حکومت نے فیڈرل کورٹ میں اپیل کی جسے اس نے منظور کر لیا۔

۳۔ گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس آئین ساز اسمبلی کا فیصلہ کیا۔ جس فیصلہ کو فیڈرل کورٹ نے آئین کی دفعات پر فیصلہ دیتے ہوئے ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کو غیر مستند قرار دے دیا۔ دستور ساز اسمبلی کے تحلیل کے احکام دیتے ہوئے

۵۔ [illegible] کا تجربہ کرتے ہوئے مغربی پاکستان کو صوبہ کا درجہ دے دیا گیا۔ نشستیں [illegible] نشستیں [illegible] ۱۲ نشستیں [illegible] نے ۱۱ نشستیں [illegible]

۶۔ دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس جولائی ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ [illegible] وجوہ سے ملتوی ہو گیا۔ دوسرا اجلاس [illegible] نے [illegible] منظور نہ کیا۔ دستور ساز اسمبلی [illegible] ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو منظور کیا گیا۔ [illegible] پاکستان کو موقع [illegible] ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ ہو گیا۔

اس دستور کے [illegible] کیا گیا۔ [illegible] اللہ کی [illegible]

پاکستان [illegible] باشندگان پاکستان کو [illegible] انسانی حقوق حاصل ہوں گے۔

۷۔ عدلیہ کو قوانین اور سپریم کورٹ کو دستور کا محافظ اور ترجمان

[illegible] قرار دیا گیا۔ [illegible] دیا گیا کہ مرکزی یا صوبائی مجلس کے کسی قانون یا قواعد کو [illegible] ناجائز ہونے کا اعلان کر دیں۔

[illegible] کی حفاظت کی گئی۔

پاکستان کے دستوری ارتقاء کا یہ دوسرا دور بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ امرِ الٰہی کی بالادستی، عوام کے منتخب نمائندوں کا ہر معاملے میں حق توثیق و تنسیخ مجلس قانون ساز کے سامنے وزارت کی جواب دہی حکومت کے ہر اقدام کے خلاف عدالت عالیہ میں رٹ کا حق نہایت واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا تھا یعنی اسلامیت اور جمہوریت اس دستور کی بھی خصوصیت تھی۔

اب پاکستان کے دستوری ارتقاء کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر مملکت میجر جنرل سکندر مرزا نے مجلس قانون ساز کو برخاست کر دیا، مرکزی اور صوبائی وزارتوں کو برطرف کر دیا، اور سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا، اور فیلڈ مارشل ایوب خان کو مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۲۷ اکتوبر کو وہ اپنے منصب سے دست بردار ہو گئے اور فیلڈ مارشل ایوب خان نے صدر مملکت کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

۱۵ فروری ۱۹۶۰ء کو صدر مملکت نے سر شہاب الدین سابق چیف جسٹس کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا جسے پاکستان کے نئے دستور سے متعلق سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔

کمیشن نے ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی جس کے بعد پاکستان کے نئے دستور کا مسودہ تیار کیا گیا اور ۸ جون ۱۹۶۲ء کو اسے نافذ کر دیا گیا۔

چونکہ پاکستان کا سب سے آخری دستور ہے اس لیے اس کے اہم حصے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسلامیت اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو اس دستور میں کس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیباچہ قابل ملاحظہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"چونکہ حق تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور جمہور کا اختیار ایک مقدس امانت ہے۔

اور چونکہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے جمہوری منشاء کا اظہار کرتے

ہوئے، خاص فرمایا تھا کہ پاکستان عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی۔

اور چونکہ پاکستان کے جمہور کا منشا ہے کہ:

(ا) مملکت اپنے اختیارات اقتدار جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے۔

(ب) جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پاکستان میں پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

(ج) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے کے قابل بنایا جائے۔

(د) پاکستان کی اقلیتوں کے جائز حقوق کا — بہ قول ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کے — قرار واقعی تحفظ کیا جائے۔

(ہ) بنیادی انسانی حقوق کا — بہ قول قرآن کی نظر میں مساوات خیال، اظہار رائے، عقیدے اور مذہب اور اجتماع کی آزادی اور سماجی اقتصادی اور سیاسی مساوات کے حقوق کے مملکت کی سلامتی کا عوام کے مفاد اور اخلاق و قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے تحفظ کیا جائے۔ اور

(و) عدلیہ کی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔

اس کے بعد عملی دستور شروع ہوتا ہے۔ اس دستور کی پہلی ہی دفعہ پاکستان کی جمہوریت کا آئینہ دار ہے چنانچہ پہلی دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"مملکت پاکستان ایک جمہوریہ ہوگی جس کا نام جمہوریہ پاکستان ہوگا۔"

جمہوریت کی ایک فرد لازم یہ ہے کہ سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور قانون میں کسی کے لیے امتیاز روا نہ ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں دوسری دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہر شہری کا خواہ وہ کہیں بھی ہو اور ہر اس شخص کا جو فی الوقت پاکستان میں

میں موجود ہو، یہ ذاتی حق ہے۔ اس کو قانون کی حفاظت حاصل ہو۔ اور قانون درجہ قانون کے مطابق حاصل ہو، اس کے ساتھ سلوک کیا جائے۔

اس دستور میں قانون سازی کے اصول بھی بتائے گئے ہیں اور وہ اس درجہ واضح اور واضح ہیں جو ہر قسم کے شک اور شبہ سے ماورا ہیں۔

صدیوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد قانون سازی کے جو اصول دنیا نے بنائے ہیں وہ اسلام نے ۱۴ سو برس پہلے وضع کر دیئے تھے۔ پاکستان کے دستور میں انہی اصولوں کو سختی اور شدت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور جمہوریت و سلامتی کو اس خوبی کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے کہ دونوں میں سے کسی کا بھی دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ مثلاً:

"کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ ہوگا۔" (دفعہ ۱۔ قانون سازی کے اصول)

اس کے علاوہ:

"ہر شہری قانون کی نظر میں برابر ہوگا، ہر ایک کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا، اور ہر ایک کے ساتھ ہر لحاظ سے مساوی سلوک کیا جائے گا۔" (دفعہ ۲)

ساتھ ہی ساتھ:

"کوئی قانون کسی شہری کی اظہار خیال کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں عائد کرے گا۔" (دفعہ ۳)

نیز "کوئی قانون شہریوں کے پرامن اور غیر مسلح ہونے پر یا انجمنیں اور یونینیں بنانے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرے گا۔" (دفعہ ۱۴)

علاوہ ازیں:

"کوئی قانون کسی شہری کے کسی جگہ آنے جانے کی یا پاکستان کے کسی حصہ میں سکونت اختیار کرنے یا آباد ہونے کی، یا پاکستان کے کسی حصے میں املاک حاصل کرنے، اپنے قبضہ میں رکھنے یا فروخت کرنے کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرے گا۔" (دفعہ ۱۵)

مندرجہ بالا امور کے علاوہ :

"کوئی قانون کسی شہری کی کوئی پیشہ، حرفہ، تجارت، کاروبار یا ملازمت اختیار کرنے یا اپنی مرضی کا کوئی اور کام کرنے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرے گا۔ (دفعہ ۶)

ماسوا امور بالا کے :

: "کسی مذہبی فرقے یا گروہ کے افراد کو اپنے مذہب پر عقیدہ رکھنے، عمل پیرا کرنے یا اس کی تبلیغ کرنے یا اس کی تعلیم دینے سے یا اپنی مذہبی اغراض کے لیے اپنے مذہب سے متعلق ادارے قائم کرنے سے نہیں روکے گا۔"

: "کسی شخص کو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا ایسی مذہبی تقریب یا عبادت میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کرے گا جو اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔"

کسی شخص پر کوئی ایسا ٹیکس نہیں لگائے گا جس کی آمدنی اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب یا فرقے پر صرف کی جائے۔

: "کسی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے یا مراعات دینے کے لیے مذہبی اداروں کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہ کرے گا۔

: "سرکاری رقوم کو کسی خاص مذہبی فرقے یا گروہ کے مفاد کے لیے صرف کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ ماسوا ان رقوم کے جو اسی مقصد کے لیے حاصل کی گئی ہوں۔ (دفعہ ۷)

علاوہ بریں :

"جو قانون افراد کی نظر بندی یا گرفتاری کی اجازت دیتا ہو اس میں اس امر کا التزام رکھا جائے گا کہ اس قانون کے تحت جو شخص گرفتار یا نظر بند کیا جائے۔

: اسے گرفتار یا نظر بند کرتے وقت یا اس کے بعد بلا تاخیر اس کی گرفتاری یا نظر بندی کی وجوہات سے بتا دی جائیں۔

: گرفتار یا نظر بند کرنے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے مجسٹریٹ کے

سامنے پیش کیا جائے۔

مذکورہ میعاد ختم ہونے کے بعد اسے رہائی دیا جائے، تاوقتیکہ کوئی مجسٹریٹ اس کی حراست کی میعاد میں مزید توسیع کا اختیار نہ دے دے۔

: اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ لینے اور اپنا مختار بنانے اور اس سے مقدمے کی پیروی کرانے کی (دفعہ ۱۸)

: یہ بھی کہ:

کسی شخص کو ایسے فعل یا ترک فعل کی سزا کا مستوجب نہ قرار دے گا جو اس جرم کے ارتکاب کے وقت کسی قانون کے تحت قابل سزا نہ تھا۔

: کسی شخص کو کسی جرم کی ایسی سزا کا مستوجب قرار نہ دے گا جو اس جرم کے ارتکاب کے وقت کسی قانون کی رو سے مقرر کردہ سزا سے زیادہ سخت ہو یا اس سے مختلف ہو۔ (دفعہ ۹)

اور: "کوئی قانون سرکاری اغراض کے سوا کسی املاک کے جبری حصول یا قبضے میں لینے کا اختیار نہ دے گا۔

: جو قانون کسی املاک کے جبری حصول یا قبضے کا اختیار دے گا، اس میں املاک کے معاوضے کی ادائیگی کے احکام ہوں گے اور باقی معاوضے کی رقم کا تعین اور توضیح، یا ان اصولوں کے اور قاعدوں کی صراحت کر دی جائے جن کی بنا پر معاوضے کا تعین کیا جائے گا۔ (دفعہ ۱۰)

چند اور باتیں:

: کوئی قانون کسی صورت میں جبری مشقت کو جائز قرار نہیں دے گا۔ (دفعہ ۱۱)

: کوئی قانون کسی شہری کو نسل کے مذہب، ذات پات، یا جائے پیدائش کی بنا پر ایسے تعلیمی ادارے میں حصول تعلیم کے حق سے محروم نہ کر دے گا، جسے سرکاری خزانے سے امداد ملتی ہو۔ (دفعہ ۱۲)

: کوئی قانون قوم کے کسی طبقے کو اس کی اپنی مخصوص زبان اور رسم الخط کے استعمال

سے یا ثقافت سے محروم نہیں کرے گی۔ (دفعہ ۱۴)

: کوئی قانون پاکستان میں غلامی کی اجازت یا اس کے لیے کسی قسم کی سہولت نہ دے گی۔ (دفعہ ۱۵)

: کوئی قانون پاکستان میں بیگار یا جبری مشقت کی اجازت یا اس کے لیے کسی قسم کی سہولت نہیں دے گا۔ (دفعہ ۱۶)

دستور پاکستان میں پالیسی کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں، ان سب پر بحث و گفتگو تو ممکن نہیں، لیکن چند اگر پیش نظر رہیں تو اچھا ہے:

۱۔ "پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھال سکیں، اور انہیں ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن کی مدد سے وہ ان اصولوں اور تصورات کے مطابق گذارنے کا مفہوم سمجھ لیں۔

۲۔ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

۳۔ پاکستان کے مسلمانوں میں اتحاد اور اسلام کے اخلاقی معیار کو روبہ عمل لانے کی مساعی کو فروغ دیا جائے۔

۴۔ زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔"

کسی قوم کی ترقی اور عروج سے ہمکنار کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ اس میں تعلیم کو عام کیا جائے، اور قوم کے ہر فرد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور نے اس مشکل کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً دستور میں واضح کے ساتھ کہا گیا ہے:

"ناخواندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو تمام لوگوں کے لیے مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔"

بنیادی ضروریات کے بارے میں بھی دستور پاکستان خاموش نہیں ہے۔

چنانچہ اس نے تسلیم کیا ہے:

"زندگی کی بنیادی ضروریات۔ مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی سہولتیں ان شہریوں کے لیے بلا تفریق ذات و مذہب و نسل فراہم کی جائیں جو کہ بوڑھے، بیمار، معذور یا بے روزگاری کے باعث بے بس یا مستقل طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں۔!"

موجودہ زمانے میں سود ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گیا ہے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں۔ ہم لاکھ سود سے نفرت کریں، سود لینے یا دینے سے احتراز کریں لیکن ہمارے علم و اطلاع کے بغیر ہماری ہر استعمالی چیز میں کسی نہ کسی حد میں کسی نہ کسی طرح سود کا لین دین ہو رہا ہے۔

پاکستان ایک اسلامی جمہوریت ہے۔ ممکن نہ تھا وہ اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیتی۔ یا اسلامی ہونے کے باوجود سود کی حرام و ناجائز قرار دیتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں پاکستان کے نئے دستور ساز نے اس کٹھن مسئلہ پر بھی سب کشائی کی ہے:

"ربا (سود) کا استعمال کیا جائے۔"

کیا یہ ہدایت اطمینان بخش نہیں ہے؟ قابل طور پر اطمینان بخش نہیں ہے۔

اسی طرح شراب کو بھی زمانہ قدیم اور سنگدست کے متوالوں کا مشغلہ کہتے ہیں۔

چنانچہ دستور میں مرقوم ہے:

"شراب اور نشہ آور اشیاء اور مضر رساں ادویات کے استعمال سے نفرت دلانا۔"

شراب پینے سے بھی نفرت دلائی جائے۔!

صدارت جمہوریہ کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ لیاقت علی خان کے زمانے میں دستور ساز نے اس کی گنجائش رکھی تھی کہ غیر مسلم صدر مملکت ہو سکتا ہے اور اس پر اعتراض کیا گیا تو مرحوم نے ایک دلچسپ و فاضلانہ تقریر بھی فرمائی تھی۔ اور

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کے خیالات کچھ نہ کچھ وزن رکھتے تھے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اصولوں کو بے لچک ہونا چاہیے۔ اس باب میں خوف و رجا سے بے نیاز ہو کر اس کا اعلان بھی کرنا چاہیے اور ان پر عمل بھی کرنا چاہیے۔

چنانچہ اسلامی جمہوریہ پاکستان نے یہ بات صاف کر دی ہے اور اپنے دستور میں وضاحت کر دی ہے کہ:

"پاکستان کا صدر صرف ایسا شخص منتخب کیا جائے گا جو مسلمان ہو!"

از روئے دستور، اس وقت ملک میں دو اسلامی ادارے باقاعدہ طور پر قائم ہیں۔ ایک "اسلامی مشاورتی کونسل" اور دوسرا "مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی"۔ اول الذکر کا فرض یہ ہے کہ جو امر مرکزی حکومت یا کسی صوبائی حکومت کی طرف سے اسلامی یا غیر اسلامی امور سے متعلق استصواب کیا جائے، یا اسلام کے مقررہ نظام کی رو سے طلب کیا جائے۔ ایک مدت معینہ کے اندر جسے وہ خود معین کرے گی حکومت کو اپنے افکار و آراء سے مطلع کر دے گی۔ آخر الذکر کا فرض یہ ہے کہ "اسلام اور اسلامی علوم کی تحقیق کرے جس سے صحیح اسلامی بنیاد پر سوسائٹی کا تشکیل ہو سکے"۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔

اسلامی مشاورتی کونسل بالکل بے جان ہو جائے گی اگر اس کے ممبران کو آزادی سے کام نہ حاصل ہو، اور بغیر کسی خوف اور لالچ کے وہ اپنا نقطۂ نظر نہ پیش کر سکیں۔ دستور نے یہ بات محسوس کی ہے اور اس کے تحفظ کا پورا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ [illegible] ممبر کو برطرف کیا جائے گا اس وقت تک نہ برطرف ہو سکے گا جب تک کہ وہ خود مستعفی نہ ہو۔ صرف ممبران کونسل ہی کے ہاتھ میں ہے کسی اور کو اس میں ذرا بھی دخل نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں دستور کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر کونسل کے ممبران کی کل تعداد کی اکثریت کسی ممبر کو کونسل کی رکنیت سے برطرف کرنے کی قرارداد منظور کر لے تو صدر مذکورہ ممبر کو برطرف کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے

صورت میں کسی ممبر کو ہرگز برطرف نہ کیا جائے گا۔

یہ باب ختم کرنے سے پہلے میں حلف وفاداری کے الفاظ درج کرنا چاہتا ہوں جو صدر، گورنر، سپیکر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج ممبر سروس کمیشن، چیف الیکشن کمشنر، ڈپٹی کمشنر یا صوبائی اسمبلی کے ممبر، نیز آڈیٹر جنرل وغیرہ کو اپنا منصب سنبھالنے سے پہلے اٹھانا پڑتا ہے۔

صدر کے حلف وفاداری کے الفاظ درج ذیل ہیں:

۱۔ "میں قسم ـــــ خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں صدق دل سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا۔

۲۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے میں ایمان داری کے ساتھ دستور اور قانون کے مطابق حتی المقدور اپنے فرائض ادا کروں گا اور اپنے کارہائے منصبی انجام دوں گا اور ہمیشہ پاکستان کے استحکام، سالمیت، خوشحالی اور بہبود کو مدنظر رکھوں گا۔

۳۔ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے سرکاری کام یا اپنے سرکاری فیصلوں پر ہرگز اثر انداز نہ ہونے دوں گا۔

۴۔ میں دستور ہذا کو برقرار رکھوں گا اور اس کی حفاظت و حمایت کروں گا۔

۵۔ ہر حالت میں ہر شخص کے ساتھ بلا خوف و رعایت اور بلا الفت و عداوت قانون کے مطابق انصاف کروں گا۔

اس حلف میں تین چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور اگر موجودہ دستور سے پہلے کے دستوروں میں ان پر عمل درآمد ہوتا رہا ہوتا تو شاید کسی انقلاب کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ تین چیزیں جن کا صدر نے حلف اٹھایا ہے یہ ہیں:

۱۔ "خدا کو حاضر ناظر جان کر"

اس طرح یہ معاملہ خدا اور بندے کا معاملہ ہو گیا۔

۲۔ ہر کام کی انجام دہی۔ "دستور اور قانون کے مطابق"
اس طرح دوست نوازی، خویش پروری اور غلط بخشی کا دروازہ بند ہو گیا۔
۳۔ دستور ہذا کی برقراری، اور اس کی حمایت و حفاظت کا عہد!
اس طرح ایوان صدر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سازش اور سرگوشی سے نجات پا گیا۔
ان تین چیزوں کے بعد مملکت کا نظم و نسق اطمینان کے ساتھ چلانا اور برقرار رکھنا، اور اسے ہر طرح کی دراندازیوں اور سازشوں سے محفوظ کر لینا حد درجہ آسان ہو گیا۔
اس دستور نے ملک کو ایک اچھا نظام ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کے تحفظ اور قائم و برقرار رکھنے کا سر و سامان بھی بہم پہنچا دیا ہے۔ پاکستان کو اس چیز کی ضرورت تھی۔ الحمد للہ کہ وہ حاصل ہو گئی۔
صدر کے علاوہ گورنر صوبہ، جج ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ، وزیر، اسپیکر، ڈپٹی اسپیکر، ممبر اسمبلی، ممبر انتخابی ادارہ، چیف الیکشن کمشنر، آڈیٹر جنرل، ممبر پبلک سروس کمیشن وغیرہ کے حلف ناموں کی بھی تقریباً یہی عبارت ہے۔ اور ان سب میں قدر مشترک یہ الفاظ ہیں:
"میں دستور ہذا کو برقرار رکھوں گا، اور اس کی حفاظت و حمایت کروں گا"

استدراک:

گذشتہ دو ابواب میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قائد اعظم سے لے کر صدر ایوب تک جملہ سربراہانِ مملکت نے خواہ ان کی حیثیت وزیر اعظم کی ہو یا صدر مملکت کی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس تصور سے روگردانی نہیں کی:
۱۔ پاکستان ایک "اسلامی جمہوریہ" ہے۔

۲۔ جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کا نظامِ حکومت لازماً اسلامی ہونا چاہیے۔
۳۔ یہاں کتاب و سنت کی حکومت ہوگی۔
۴۔ اور نص کے خلاف کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا۔
۵۔ اگر پہلے سے کوئی قانون وضع ہو چکا ہے۔ بدل دیا جائے گا۔

اسی طرح اب تک پاکستان میں دستور سازی کے تین مراحل ہمارے سامنے ہیں:

۱۔ عہدِ قائداعظم کی مجلس دستور ساز، جو اپنا کام ختم نہ کر سکی، اور برخاست کر دی گئی۔
۲۔ دوسری مجلس دستور ساز جو فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئی اور جس نے ایک دستور مرتب کیا اور اسے نافذ بھی کر دیا۔
۳۔ مارشل لاء کے دور میں صدر کا اپنے رفقاء کار کے مشورے اور تعاون سے منظور کیا ہوا دستور جو اس وقت تک میں نافذ ہے۔

ان تینوں مرحلوں پر ایک نظر غائر ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہر مرحلے پر بغیر کسی اختلاف کے جو چیز بالکل طے شدہ سمجھی جاتی رہی، اور جس پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں کیا گیا، وہ "اسلامیت" ہے

ہر دستور نے اس امر کی ضمانت دی ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہوگا۔ اور یہاں قرآن و سنت کے مطابق حکومت کی جائے گی، منکرات سے احتراز کیا جائے گا۔ اور اوامر کی پیروی کی جائے گی۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف پاکستان کے عوام ہی نہیں خواص بھی اسلام اور اسلامیت سے بیزار اور بیگانہ نہیں ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے، اتنی بڑی جو دوسرے اسلامی ملکوں کے باعث رشک ہو سکتی ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، اور اس کا نظامِ مملکت کسی حالت میں بھی اسلامیت سے منقطع نہیں ہو سکتا تو کیا وجہ ہے کہ یہاں اسلامیت کی وہ جھلک نظر نہیں آتی جو ایک اسلامی مملکت کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔

اس کی سیدھا اور صاف جواب تو یہ ہے کہ ہر قوم منزلِ مقصود تک وہ راہ ہی
میں پہنچا کرتی ہے۔

پہلا مرحلہ ہوتا ہے فکر و نظر کا۔

دوسرا مرحلہ ہوتا ہے اقدام و عمل کا۔

بہت عرصے تک ہم پہلے مرحلے میں داخل رہے اب ہمارا قافلہ دوسرے
مرحلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی سوال تشنۂ جواب
نہیں رہ جائے گا۔ وہ مبارک ساعت کچھ ایسی زیادہ دور نہیں، جس وقت پاکستان
کو شاہراہِ "خیر امت" میں ہو گا، اور جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام
دے رہی ہو گی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

قیمت مطبوعات

[illegible]

عقائد و اعمال از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام کی بنیادی حقیقتیں از رفقائے ادارہ

[illegible]

[illegible]

اساسیات اسلام از مولانا محمد حنیف ندوی

[illegible]

[illegible]

گورو گرنتھ صاحب اور اسلام از ابوالامان امرتسری

اسلام اور مذاہب عالم از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

پیغمبر انسانیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

حیات [illegible] از محمد حسین ہیکل - اردو ترجمہ [illegible]

تاریخ دولت فاطمیہ از [illegible]

زیر دستوں کی آواز اردو ترجمہ [illegible] از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی

اسلام کا نظریۂ تاریخ از مولانا [illegible]

مسلمانوں کے عقاید و [illegible] اردو ترجمہ [illegible]

حصہ اوّل ، حصہ دوم

تصورات عرب قبل از اسلام از مولانا عبید اللہ قدسی

[illegible] اردو ترجمہ [illegible]

[illegible] اردو ترجمہ از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور رواداری از مولانا رئیس احمد جعفری - جلد دوم

اسلام اور عدل و احسان از مولانا رئیس احمد جعفری

مسلم ثقافت ہندوستان میں از مولانا عبد المجید سالک

[illegible]

فقہائے ہند جلد اول از مولانا محمد اسحاق بھٹی

اسلام میں حیثیتِ نسواں از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

عقلیات ابنِ تیمیہ از مولانا محمد حنیف ندوی

سرسیّد اور اصلاحِ معاشرہ از شاہد حسین رزاقی

افکار ابنِ خلدون از مولانا محمد حنیف ندوی

مشاہیر اسلام از خواجہ عباد اللہ اختر

بیدل از خواجہ عباد اللہ اختر

مقالاتِ حکیم مجموعہ مضامین ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم۔ مرتبہ شاہد حسین رزاقی۔ حصّہ اوّل اسلامیات

حصّہ دوم اقبالیات حصّہ سوم متفرقات

موسیقی کی شرعی حیثیت از سیّد نصیر شاہ و رفیع اللہ

تعلیمات غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

افکارِ غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

سرگزشت غزالی اردو ترجمہ "المنقذ من الضلال" (امام غزالی) از مولانا محمد حنیف ندوی

حکمتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

تشبیہاتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

ملفوظاتِ رومی اردو ترجمہ "فیہ ما فیہ" از عبد الرشید تبسّم

اقبال کا نظریۂ اخلاق از پروفیسر سعید احمد رفیق

تہافۃ الفلاسفہ از مولانا محمد حنیف ندوی

انڈونیشیا از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور تعمیر شخصیت از میاں عبد الرشید

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق از بشیر احمد ڈار

اسلام کا نظریۂ اخلاق از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام میں حریت، مساوات، اخوت از خواجہ عباد اللہ اختر

اسلام اور حقوقِ انسانی از خواجہ عباد اللہ اختر

سیاستِ شرعیہ از مولانا رئیس احمد جعفری

تاریخ جمہوریت از شاہد حسین رزاقی

مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر رشید احمد

اسلامی جمہوریت از مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام کا معاشی نظریہ از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

مسئلۂ زمین اور اسلام از پروفیسر محمود احمد

چند معاشی مسائل اور اسلام از سیّد یعقوب شاہ

تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ (ڈاکٹر احمد شلبی) اردو ترجمہ از محمد حسین خاں زبیری

اسلام کا نظریۂ تعلیم از ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اسلامی اصولِ صحت از فضل کریم فارانی

طب العرب (ایڈورڈ جی۔ براؤن) ترجمہ از حکیم سیّد علی احمد نیر واسطی۔

تاریخ تصوّف (قبل از اسلام) از بشیر احمد ڈار

مکتوب مدنی (شاہ ولی اللہ) اردو ترجمہ از مولانا محمد حنیف ندوی

لمحات (شاہ ولی اللہ) اردو ترجمہ از پیر محمد حسن

ارمغان شاہ ولی اللہ از پروفیسر محمد سرور

ارمغان حالی از پروفیسر حمید احمد خاں

یادگار شبلی از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصّہ از ڈاکٹر زبید احمد۔ ترجمہ از شاہد حسین رزاقی

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم از مس ممتاز مرزا

سید امیر علی از شاہد حسین رزاقی

مفصل فہرست مطبوعات مفت طلب فرمائیں۔

ماہنامہ

المعارف

ایک علمی اسلامی رسالہ ہے جس کا مقصد اسلام اور علوم اسلامی مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ مسلمانوں کے فلسفہ، ادب اور ثقافت کے متعلق معیاری مضامین شائع کرنا ہے۔

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے۔ سالانہ چندہ ۸/- روپے بذریعہ وی پی ۹/- روپے

نمونہ کے پرچے کے لیے ایک روپے کا ڈاک کا ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

معتمد، ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

چند فکر انگیز مطبوعات

چند معاشی مسائل اور اسلام از سید یعقوب شاہ

فاضل مصنف (سابق آڈیٹر جنرل اور وزیر مالیات حکومت مغربی پاکستان) اقتصادیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں - اس کتاب میں اُنھوں نے ربٰو، زکوۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب و سنت، تاریخ و عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائج فکر سلیس انداز میں پیش کیے ہیں -

صفحات ۲۵۹ - قیمت اعلیٰ اڈیشن 6/50 روپے

قسم دوم -/5 روپے

مسلمانوں کے عقاید و افکار

یعنی

مقالات الاسلامیین

علامہ ابوالحسن اشعری کی شہرہ آفاق کتاب کے پہلے حصے کا اُردو ترجمہ از مولانا محمد حنیف ندوی مع مقدمہ و مفصل حواشی واشاریہ -

علامہ موصوف چوتھی صدی ہجری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہیں - اُنھوں نے مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہنے کے باوجود اپنے لیے فکر و تعمق اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا -

''مقالات الاسلامیین'' علامہ کا وہ علمی شاہکار ہے جس کو افکار و نظریات کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیے - اس میں اُنھوں نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے اُن تمام افکار و عقاید کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں سے ہمارے ہاں کے فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے - اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی اور یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آئے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور بر قرار رکھا ہے -

صفحات ۴۸ + ۳۷۲ — قیمت -/10 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور